

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
ماہنامہ
سچی کہانیاں
طویل کہانی نمبر 2
May
2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING SECTION
Online Library For Pakistan
ایک نیا تہلکہ خیز سلسلہ
انتقام کی ایک نئی داستان
زرد لومڑی
☆......"مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆......محمود شام کا سفرنامہ "بھارت میں بلیک لسٹ" اور کاشی چوہان کا تہلکہ خیز ناول "زہر عشق"
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail: pearl-publications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام
مدیر : کاشی چوہان، دانیال شمسی

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 33 ۔ شمارہ: 05 مئی: 2016ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس OB-7 ... کراچی



رسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے، افریقہ 365 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر، ایشیا، یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم جھگا ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچّائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچّی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز: C II-88، فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

بارش کا پہلا قطرہ

پاکستان طویل عرصے سے دہشت گردی کا شکار ہے۔ بے شمار معصوم شہری ظالم اور سفاک دہشت گردوں کا شکار ہوگئے۔ ان میں نماز کی صف میں کھڑے نمازی بھی تھے' اسکول میں پڑھنے والے فرشتوں جیسی مسکراہٹ والے ہمارے بچے، امام بارگاہوں میں ماتم کرتے عاشقانِ حسین، جھولوں پر جھولتے ننھے منے جگر کے ٹکڑے، ہمارے فوجی جوان اور دیگر سیکورٹی ایجنسیز کے لوگ، سب بلا تخصیص زبان، مذہب، رنگ اس عفریت کا شکار ہوئے۔ خودکش بمبار سرحد پار سے ہماری پاک سرزمین میں داخل ہوتے اور پاکستان کے ہر شہر کو خاک و خون میں نہلاتے رہے۔ یہ دہشت گرد برقعہ پہن کر خواتین کے حلیے میں قبائلی فورس کو دھوکا دیا کرتے تھے۔ ہمارے قبائلی بہت غیور لوگ ہیں۔ نہ وہ کسی کی عورت کو دیکھتے ہیں نہ اپنی پر کسی کی نظر پڑنے دیتے ہیں۔ بس اسی بات کا دشمن نے فائدہ اٹھایا۔ پاکستان دہشت گردی کے طوفان میں گھرا رہا۔ دِ مخالف نے گھر کے گھر اجاڑ دیے مگر حوصلے بلند کیے' لٹے پٹے پاکستانی پھر ڈٹ کر کھڑے ہوجاتے...... ضرب غضب جاری ہے۔ دشمن منہ چھپا کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ زندگی نے ایک بار پھر دستک دی۔ خون کی بارش تھم گئی۔ تب پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار قبائلی پولیس میں **3** خواتین کو بھرتی کیا گیا۔ وہ مرد اہلکاروں کے ساتھ گھروں میں چھاپے کے دوران خواتین کی تلاشی لیں گی اس کے علاوہ سرحد پار کرتی خواتین کی جامہ تلاشی لیں گی۔ یعنی اب دشمن کو برقعہ میں بھی چھپ کر پاک سرزمین میں داخل ہونا مشکل ہوگا۔ اسی کو کہتے ہیں دیر آید درست آید...... یقیناً خواتین کا قبائلی پولیس میں بھرتی ہونا خوش آئند ہے اور یہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا یہی ہر پاکستانی کی دعا ہے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

خدا آپ سب کو سلامت رکھے! احوال کی ابتداء ہے! آپ کے خطوط کی محفل سجی ہوئی ہے مگر...... میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ چونک کیوں گئے آپ یہ جملہ سن کر؟ ہوتا ہے...... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے پیارو! جانتے ہو جب بارش ہوتی ہے تو پھر گارے کی دیواریں کیسے کیسے نقش بناتی ہیں۔ بارش سے پہلے نہیں پتا ہوتا کہ یہ پانی کس کس طرح سے، کیا کیا روپ اختیار کر جائے گا۔ بالکل اسی طرح جب ہم پر خدا مہربان ہوتا ہے اور ہمارے ہاتھ میں اختیار دے دیتا ہے تو ہم خدا کو ہی بھول جاتے ہیں۔ اور خدا تو وہ ہے جو اس انسان کو ہر ہر پل اپنی قدرت سے اپنی عظمت کی یاد دلاتا ہے۔ آکاش پہ چڑھتے کو کیسے دھرتی پہ لا پھینکتا ہے۔ سوکھی لکڑی کو کیسے ہری بھری کر دیتا ہے۔ آخری ہچکی لیتا مریض کیسے دم بہ دم صحت مند ہو کر سالوں ہشاش بشاش زندگی گزارتا ہے۔ بادل کیسے اونچے پہاڑوں کی برفوں اور صحرائی میدانوں میں ایک سا میگھا برساتے ہیں۔ پانی کا جل تھل ایک سا ہوتا ہے۔ بہتا پانی پتھر، پہاڑ اور سبزہ نہیں دیکھتا۔ کیونکہ وہ خالص ہے، رب کے حکم سے برستا ہے۔ اور جب حکم ربی ہوتا ہے تو پل کی پل میں پاناما لیکس جیسے طوفان، طوفانوں کو گھیر کر اُن کا ناطقہ تنگ کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ساتھیو! بس ہر کام کرتے وقت اس معبود کو ذہن میں ضرور رکھا کریں جو لامحدود ہے۔ اس دعا کے ساتھ ہم اپنے احوال کی ابتدا کرتے ہیں کہ مولا! ہم سب پر رحم کر!!

سید ملازم حسین شیرازی، ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ سے ہمارے اس ماہ کے پہلے احوالی بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اسلام علیکم! امید ہے معہ اہل وعیال و دوستان بخیریت ہوں گے۔ ماہ مارچ کا اعزازی پرچہ آپ نے ارسال کیا بہت شکریہ۔ میری ارسال کردہ دو عدد کہانیاں ''مکافاتِ عمل'' اور ''انسان یا درندے'' کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ عنقریب شائع ہوں گی۔ شکریہ 2/3 کہانیاں زیرِ تحریر ہیں بعد میں ارسال کروں گا۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور تعاون کے لیے دعا گو ہوں۔ مارچ 2016ء کا شمارہ بہت دیدہ زیب، خوب صورت رنگوں سے مُزین، انتہایت موثر ہے۔ خوب صورت ہوش رُبا دوشیزہ جسے دیکھتے ہی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نیچے بونے شیطان کو دیکھ کر چیخیں نکل گئیں۔ کیا ''Contrast'' ہے واقعی پرچہ پُر اسرار ہے۔ اس ماہ شمارہ خوب صورت اور جان دار کہانیوں سے آراستہ ہے۔ آپ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کہانیوں کے بارے میں مختصراً عرض ہے۔ ''سترہواں مسافر، محمد سلیم اختر'' مقتولہ کے محبوب نے آخر قاتل سے بدلہ لے لیا۔ سنسنی خیز کہانی۔ ''مجھے معاف کرو'' حنا بشریٰ، دشمن دولت کے

ناجائز حصوں کا قصہ عبرت۔ بھوک، رضوانہ پرنس، منڈلاتے خوف میں جکڑتی عبرت ناک کہانی۔ ''عرشی کون تھی۔'' نادیہ ملک، بھٹکتی روح کے ساتھ گزرے ایام کی عجیب وغریب داستان۔ ''باندی'' شائستہ انور، عاشق جن جو محبوبہ کی قبر میں غائب ہوگیا کہانی خوب ہے۔ ''سب کچھ تیرا ہے'' ارم خان، تحریر کردہ اچھی کہانی ہے۔ ''بادبان'' نعمان اسحاق، سلسلہ بہت دلچسپ ہے۔ ماشاء اللہ۔ ''منی باجی'' جاوید راہی، ظالم عورت کے شیطانی عمل میں لپٹی عبرت ناک کہانی۔ عمدہ تحریر وبیان۔ ''حسد کی آگ'' ممتاز احمد، اسرار، سنسنی اور عبرت سے بھرپور نہ بھولنے والی موثر کہانی، ''ہم شکل'' ایم اے راحت، خوب صورت اور موثر سلسلہ، ''زہر عشق'' کاشی چوہان، نت نئی دلچسپیوں اور اسرار میں جکڑتا خوب صورت سلسلہ، ''بیسٹ رائٹر فار ایور'' کے مسحور کن قلم کی جادوئی کاوش ''گڈلک سے بھارت میں بلیک لسٹ'' محمود شام، معلومات کا خزانہ باقی کہانیاں جان دار اور خوب صورت ہیں۔ بحکم ایڈیٹر مختصر اور جامع تبصروں کے پیش نظر کہانیوں پر تبصرے نہ کرنے پر دل شکنی کا مرتکب ہوں گے۔ قارئین اور لکھاریوں سے معذرت۔ لائف بوائے، ہائیڈ پارک، مسئلہ یہ ہے، تیر نیم کش بہت اچھے رہے۔ احوال میں احوال نامے بہت خوب صورت تحریر کیے گئے۔ ہر لکھاری، قاری، آپس میں خلوص ومحبت اور اپنائیت کے جذبات میں سرشار ہے۔ یہ سب ''سچی کہانیاں'' کی نوازشیں ہیں۔ دکھ بھری اس دنیا میں باہمی رشتے ہی انسان کا اثاثہ اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ آخر میں محمد ندیم عباس میوانی، فیصل ندیم بھٹی، روبینہ ناز روبی، ملک محمد آصیر، سنبل، ممتاز احمد، مسز نوید ہاشمی، سونیا خان کا بہت شکریہ کہ انھوں نے میرے خط کو پسند فرمایا اور ''فراڈ کمپنی'' کو شرف قبولیت بخشی۔ اجازت چاہوں گا پھر ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔

☆: بہت اچھے بھائی! خدا تعالیٰ آپ کو صعوبتوں سے نجات دلائے۔ تبصرہ شاندار کیا آپ نے۔ لیجیے اب ذرا اپنی کہانی کا بھی مزہ لیجیے اس ماہ۔

✉: تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد، کرن ناز، احوال میں شریک ہورہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ اپریل کا تازہ شمارہ تین تاریخ کو ملا۔ طویل کہانی نمبر ٹائٹل اچھا تھا۔ تبصروں میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کاشی بھیا کی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے شاملِ احوال کیا۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو باقاعدہ ہر ماہ حاضر ہوتی رہوں گی۔ تبصروں میں ارم خان، کرن شبیر، ممتاز احمد اور عمارہ ناز کے تبصرے خوبصورت تھے۔ سب سے زیادہ دلچسپ تبصرہ انکل ممتاز کا تھا اس کے بعد بہن حنا بشریٰ اور محمد قاسم خان بلوچ کا تبصرہ بہت پسند آیا آپ سب لوگ بہت اچھی باتیں لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا کے قلم سے لکھا ہوا شہر جنگل اور چاند بہت پیارا تھا کاشی بھیا تو بہت زبردست کرتے ہیں کہانیوں کی طرف گئی تو۔ تم مل گئے ہو۔ محمد یوسف لغاری کی کہانی پیاری تھی۔ پتھر میرا نصیب نائلہ طارق۔ چندر سے عبدالرحمٰن تک۔ اندھیرے دریچے، اور محمد سلیم اختر کی پھر صبح ہوگی، کیا لاجواب تحریریں تھیں۔ بابل، منزل خان اور حسرتِ ناتمام، ممتاز احمد کی کہانیاں تو دل میں سما گئیں۔ بہت مزہ آیا پڑھ کر تحریروں کو گردش جاوید راہی زبردست کہانی تھی۔ طویل کہانی نمبر تو اس بار کامیاب رہا امید ہے آئندہ بھی پسند آئے گا۔ ہائیڈ پارک میں ممتاز اعوان کی غزل، کنکری سونا ہوگئی، عماد حسین انصاری کی تم یاد آتے ہو، پرہیزی مہمان، شاہانہ احمد کا لکھا ہوا ایک وعدہ۔ یہ سب کچھ اچھا تھا۔ شاعری میں کاشف کی خان کا شعر زبردست تھا۔ اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔

☆: کرن! تبصرہ زبردست رہا۔ تمہاری آمد نے مسرور کیا۔ احوال میں باقاعدہ حاضری، ہم سے محبت اور ہمارا مان ہے۔

✉: قندیلہ صنم خان، تحصیل ماموں کانجن سے عرض کرتی ہیں۔ سچی کہانیاں اس بار شام کے وقت ملا تمام کاموں سے فارغ ہوکر پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تمام ساتھیوں کے اچھے اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے کچھ تبصرے تو زیادہ ہی دلفریب تھے۔ ارم خان، سمیس غزالہ، انکل ممتاز احمد، عمارہ ناز، حنا بشریٰ، نوید ہاشمی، آنٹی نفیسہ، سدرہ انور، علی جھنگ صدر، فیصل ندیم بھٹی، محمد قاسم خان بلوچ، کرن ناز، ایم وارث بیگ، سیدہ حجاب فاطمہ اور مجید احمد جائی ان سب لوگوں کے تبصرے بہت ہی پیارے اور دلچسپ تھے۔ اللہ ان تمام لوگوں کو تاحیات خوش رکھے۔ لائف بوائے تو ہر لحاظ سے ٹھیک چل رہا ہے۔ کہانیوں میں تقریباً سب کہانیاں ٹھیک تھیں۔ خاص طور پر، پتھر میرا نصیب، چندر سے عبدالرحمٰن تک، کرم کے فیصلے، پھر صبح ہوگی، حسرت ناتمام، گردش، یہ تمام تحریریں بہت خاص تھیں اس شمارے میں۔ ان تمام کے لکھاریوں کو میں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ہائیڈ پارک میں مراسلے، غزلیں اور معلومات ٹھیک لگیں۔ کاشی بھیا میں آپ کا خصوصی شکریہ ادا کررہی ہوں کہ آپ نے مجھے لکھنے کا حوصلہ دیا ہے میری دعا ہے کہ تاحیات سکھ چین سے جیو۔ اگلے شمارے کا ابھی سے انتظار کررہی ہوں امید ہے جلد پڑھنے کو ملے گا سب کو سلام۔

☆: اچھی قندیلہ! گڑیا تبصرہ اتنا مختصر!! اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ آنا۔

✉: دیپال پور سے یاسر وکی لکھتے ہیں۔ کافی ماہ احوال سے غائب رہا اب بالکل فری ہوں۔ کاشی بھائی آپ کیسے ہیں مجھے پتا ہے آپ بھی مجھ پہ غصہ ہو۔ اتنی دیر احوال سے غائب جو رہا ہوں۔ خضر حیات کا کلام اچھا لگا۔ منشی عزیز سے آپ کی اسٹوریوں کا بے تابی سے انتظار رہتا ہے۔ یعقوب بھائی آپ کی اسٹوریاں بھی قابلِ تعریف ہوتی ہیں لکھتے رہیے۔ باقی سب کو میرا سلام۔

☆: یاسر! جب تمہارا دل چاہے احوال میں آجاؤ یہ تو تم سب کے تبصروں سے ہی سجتا ہے نا۔ اگر تحریر معیاری ہوئی تو امید رکھو ناامید نہیں ہوگے ورنہ......

✉: ملک صفدر عباس اعوان، جہانیاں سے لکھتے ہیں۔ اس فاسٹ دور میں جہاں ہم سیکنڈوں میں ای میل، فیکس اور موبائل میسج وصول کرتے ہیں۔ وہاں یوں خط لکھنے اور پوسٹ کرنے کا ایک الگ ہی حسن ہے۔ سب سے پہلے تو پیارے کاشی بھیا آپ کو اور آنٹی منزہ سہام کو بہت سلام، اپریل کے رسالے کی حسینہ پلکوں کی جھالر اور زلفوں کی آبشار گرائے ساتھ سفید موتیوں کی نمائش کرتی سرورق کو جاذب نظر بنا رہی تھی۔ رسالہ ہاتھ میں پکڑتے ہی فوراً دوستوں کی محفل میں آ بیٹھے۔ الفاظ محبت جہاں تک پہنچے سب دوستوں کو ہمارا دل کی گہرائیوں سے سلام۔ جن دوستوں نے ہماری اسٹوری کو پسند فرمایا۔ ہم ان سب کے بہت مشکور ہیں۔ اب چند ایک نام لے کر باقیوں کی دل آزاری مقصود نہیں۔ احوال میں تبصرے سب کے سب اچھے تھے۔ کاشی بھیا آپ سارا ماہ خون پسینہ ایک کرکے ہمارے لیے اتنا پیارا رسالہ لے کر آتے ہیں۔ مصروفیت کے باعث کہانیوں پر تبصرہ ادھار...... اب کے لیے بس اتنا ہی...... مئی کے شمارے میں ایم اے راحت کے نئے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔

☆: پیارے صفدر، کہانی شائع ہوگی تو تم کو مطلع کردیا جائے گا۔ تبصرہ مزید ادھار نہ لگا۔ کیوں...... تم کو ہو کیا؟

بس دعا چاہیے

ہماری دیرینہ قاری، لکھاری، شاعرہ ساتھی سدرہ انور علی پچھلے دنوں ایک حادثے کا شکار ہوگئیں، گو کہ انھوں نے اس حادثے کو سنجیدہ نہ لیا مگر مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی...... والا معاملہ ہوگیا۔ ساتھیو! آپ سب سے سدرہ کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

گیا ہے۔ پیارے پیارے تبصرے کیا ہوئے؟

✉: نثار کالونی، فیصل آباد سے علی رضا احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اپریل کے شمارے کا ٹائٹل بھی حسب معمول اچھا تھا۔ خطوط کی محفل ہمیشہ کی طرح مہک رہی تھی۔ تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اب رہ گئی میری فیورٹ کہانی ''لائف بوائے'' تو جناب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہی ٹاپ پر تھی۔ سچی کہانیاں کے لکھاری بہت بہترین انداز سے میرا دل جیت رہے ہیں۔ (شکریہ......) اب آتا ہوں غزلوں کی جانب تمام ساتھیوں کا انتخاب خوب تھا۔ شمارے کو مجموعی طور پر اچھا کہہ سکتے ہیں۔ رانا حبیب الرحمٰن صاحب نے جتنے دکھ دیکھے ہیں۔ کہانی بھی ایسی ہی ہوگی۔ آخر میں فرح خانیوال، سباس گل، مجید احمد جائی، قاسم خان بلوچ، امین مراد انصاری، عبدالجبار رومی، افضل آزاد، یاسر دکی، راشد لطیف، کو خصوصی سلام۔

☆: علی رضا صاحب! سلامت رہیے۔ باقی تبصرہ کہاں ہے بھائی!! اگر آپ بھی مکمل جامع تبصرہ بھیجتے تو ہم آپ کے تبصرے کو بھی مجموعی طور پر کچھ کہہ دیتے۔

✉: لاہور سے ہماری پیاری سی بہن حنا بشریٰ کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ طویل کہانی نمبر بہت زبردست تھا۔ ٹائٹل بھی خوب صورت تھا۔ تبصرے سے پہلے بھیا صرف ایک بات کہنا چاہوں گی کہ آپ کا یہ کہنا کہ سورج راجہ کو کراچی والوں سے بہت محبت ہے۔ اس جملے نے بہت دکھی کیا۔ واقعی کراچی والوں نے بہت تکلیف برداشت کی ہے۔ سردی کا لطف لیتے ہوئے بھی میں کراچی کے موسم کے لیے دعا گو تھی۔ اللہ تعالیٰ کراچی سمیت تمام عالم کو موسموں کی شدتوں سے بچائے ہر آفت سے حفاظت فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ عبدالعزیز جی آصاحب کی والدہ کی وفات پر دل بے حد دکھی ہوا اللہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ محمد سلیم اختر صاحب کو بیٹی کی شادی کی بہت مبارک باد اللہ تعالیٰ ہر خوشی عطا فرمائے۔ آمین۔ احوال میں سب کی شرکت رونق کا باعث تھی۔ مسز نوید ہاشمی اور عظمیٰ شکور صاحبہ کا خط زبردست تھا۔ عظمیٰ صاحبہ آپ تو خط بھی بہت انجوائے کر کے لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا کے ساتھ ہماری ہنسی بھی نکل جاتی ہے۔ ممتاز احمد صاحب حوصلہ افزائی پر مشکور ہوں۔ سیدہ حجاب فاطمہ کے نام کی طرح اُن کا خط بھی زبردست تھا۔ باقی بھی بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ نام لکھنے تو طوالت...... کہانیوں میں اندھیرے دریچے اور پتھر میرا نصیب بہت زیادہ دکھی کر گئیں۔ آپ دونوں نے تو کمال کر دیا۔ کرم کے فیصلے بہت منفرد اور خوبصورت تحریر تھی۔ پھر صبح ہوگی تم مل گئے ہو۔ دو کوڑی کی عورت، چندر سے عبدالرحمٰن تک نے بھی خوب رنگ جمایا۔ پکا پھل اور بابل بھی بہت نصیحت آموز تھیں۔ خوب صورت اندازِ تحریر نے [illegible] سارے اسٹارز، ایوارڈز، گڈ اور شاباش بھی کم لگ رہے ہیں۔ کاشی بھیا آپ نے تو ہمیں پریشان کر دیا

ہے۔ آپ کی تعریف کیسے کروں۔ مسئلہ غور طلب ہے۔ ذرا سوچیے۔ ایک تصویر ایک کہانی، دانیال شمسی کی بے حد دکھی کر گئی۔ حسرتِ ناتمام اور گردش کی تعریف میں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح نمبر ون تھیں۔ آپ دونوں تو ہمیشہ منفرد تحریر لا کر حیران کر دیتے ہیں۔ باقی سب سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔

☆: پیاری بہن! پرچہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تبصرہ شاندار رہا۔ ہم نے بھی ایسے زبردست تبصرے کا ابھی سے انتظار کرنا شروع کر دیا ہے۔

✉: نزابت افشال، مہورہ فتح جنگ سے لکھتے ہیں۔ یکم اپریل شمارہ ملا۔ اس ماہ غیر حاضر رہا ہوں سو معذرت۔ پیپرز کی وجہ سے صرف احوال ہی پڑھا باقی شمارہ پیپرز کے بعد اور جامع تبصرہ بھی پیپرز کے بعد ہی کروں گا۔ جن لوگوں نے مجھے یاد رکھا بہت بہت شکریہ ان کا۔ ڈاکٹر خادم حسین، عثمان بلوچ، صائمہ مجید شکریہ، کراچی سے میری بہت ہی قابلِ عزت اینڈ رسسٹر فرح انیس یاد کرنے کا شکریہ۔ آپ کا نام اُن چند لوگوں میں ہے جن کا نام لے کر میں ہر نماز کے بعد ان کے لیے ضرور دعا کرتا ہوں۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے کیونکہ یہ ایک نایاب تحفہ ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ منزہ آپی آپ کیسی ہیں؟ مذاق کرتا ہوں بُرا نہ منایا کریں۔ سونیا خان یاد کرنے کا شکریہ۔ آخر میں کاشی بھائی سے ایک دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ کاشی بھائی کرکٹ ٹیم کی کارکردگی سب کے سامنے ہے۔ اگر ان کھلاڑیوں کی آمدنی کا پانچواں حصہ بھی غریب طلباء پر خرچ کیا جائے تو وطن عزیز میں خواندگی 100 فیصد ہو جائے مگر ایسا کون کرے؟؟ ہائے افسوس۔ رخصت سے پہلے اس المیے پر ایک شعر۔

اہل ضمیر آج بھی ظلمت نصیب ہیں☆☆ بانٹے ہیں تم نے پوچھ کر نام و نسب چراغ!

☆: پیارے نزابت! اللہ تم کو امتحانات میں کامیاب کرے۔ تم غریب طلبا کی بات کرتے ہو۔ بھائی یہاں تو منہ سے نوالہ نکالنے والے بھی بستے ہیں۔

✉: احوال میں پہلی بار حاضر ہو رہے ہیں۔ فیضان خورشید، خدا کی بستی، کراچی سے۔ لکھتے ہیں۔ آج میری پہلی آمد ہے۔ امید ہے میرا خط احوال کی زینت بنے گا۔ میری طرف سے سب کو پیار بھرا سلام۔ اچانک مجھے پتا چلا میرے دو دوست منعم اصغر، کشاف اقبال کی تحریریں، مارچ کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ تو ڈائجسٹ لینے پہنچ گیا۔ جب لایا اور پڑھا تو بہت ہی دل کو بھایا۔ سچی کہانیاں واقعی سچی کہانیاں ہے۔ کشاف اقبال تمہاری کہانی تو آنکھیں نم کر گئی۔ منعم اصغر، اُف...... بہت اچھے...... اور ماہ مارچ کی سب کہانیاں بہت اچھی تھی۔ اپریل کے شمارے میں سب سے پہلے زیر عشق پڑھا۔ واہ...... کاشی بھائی۔ پھر بادبان، نعمان تمہاری کہانی مجھے اپنی گرفت میں لے کر رہی ہے۔ اور پھر ہم شکل کی آخری قسط بڑے مزے کی تھی۔ کرم کے فیصلے، اُف۔ جنت جیسی عورت واقعی زندگی کو بھی جنت بنا دیتی ہے۔ تم مل گئے۔ بہت شاندار رہی۔ پتھر میرا نصیب، رلا ڈالا۔ نائلہ طارق آپی نے، چندر سے عبدالرحمٰن تک، بڑی زبردست۔ باقی ابھی پڑھا نہیں سو۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆: اچھے فیضان! خوش آمدید! تبصرے کا شکریہ۔ اُف!! کہانی کے بارے میں فی الحال پڑھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے مگر امید ہے جس طرح تم نے تبصرہ کیا۔ کہانی بھی ٹھیک ہی ہوگی۔ اگلے ماہ احوال تمہارا منتظر ہے۔

✉: محمد قاسم خان، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں۔ طویل کہانی نمبر پہلی بار سب پڑھنے والوں کی نظروں میں آیا۔ یہ تو کاشی بھائی کی طرف سے ہم سب کے لیے تحفہ خاص ہے۔ احوال میں تبصرے تو بڑھتے جا رہے ہیں۔ اچھی بات ہے نئے لوگوں کو آنا چاہیے۔ ایم وارث بیگ، قندیلہ منعم خان، کرن ناز اور عمارہ ناز کو خصوصی طور پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ ارم ناز، مسز نوید ہاشمی، سدرہ انور علی، سیدہ فاطمہ حجاب، مجید احمد جائی، پیارے انکل ممتاز احمد، فیصل ندیم، حنا بشریٰ، عظمیٰ اور عاصم بوٹا کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ پیارے دوست حبیب الرحمٰن جی بھلا میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ آپ نے مجھے محبت بھرا خط لکھ کر محبت ہی اتنی دی ہے۔ آپ کے لیے میری طرف سے بہت ساری نیک دعائیں ہیں۔ حبیب بھائی آپ نے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔ انشاءاللہ جلد ملاقات ہوگی۔ طویل کہانیوں میں چندر سے عبدالرحمٰن تک بہت اچھی لگی۔ ایک گمراہ انسان کو قدرت نے ایمان کی طاقت سے نوازا۔ سلیم اختر صاحب کی پھر صبح ہوگی لاجواب تحریر تھی۔ ممتاز احمد صاحب کی حسرت ناتمام زبردست! ایک مجبور دوشیزہ کی حسرتیں ارمان ناکام ہی رہ گئے۔ یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، عبدالغفار عابد کی تحریر ایمان افروز تھی کیا بات ہے۔ ایسی تحریریں بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بہت خوب۔ اندھیرے دریچے، روشانے عبدالقیوم کی کہانی بھی اچھی لگی۔ اپنا خون، شعبان کھوسہ۔ گردش جاوید راہی کی بے مثال کہانیاں تھیں۔ مبارک باد دیتا ہوں۔ پکا پھل، بابل اور پتھر میرا نصیب بھی بے مثال تحریریں رہیں۔ سبھی لکھاریوں نے طویل کہانی نمبر کو چار چاند لگا دیے سب کا شکریہ۔ ہائیڈ پارک میں، ملک علی رضا کا کنکری سونا ہوگئی۔ اعتبار و خلوص، حکمت کی باتیں، ایک وعدہ، وفاع اور سب لوگوں کی غزلیں پسند آئیں۔

☆: پیارے بھائی قاسم! تمہارا تبصرہ شاندار رہا۔ بس اسی طرح شامل احوال رہو۔

✉: قبولہ شریف سے یہ پہلی پہلی آمد ہے ہمارے شاعر اور لکھاری ساتھی ایم حسن نظامی کی۔ لکھتے ہیں۔ امید ہے آپ اور سچی کہانیاں سے وابستہ سبھی احباب بخیریت ہوں گے۔ پرچے کا معیار آکاش کی بلندیوں کو چھو رہا ہے اور یہ سبھی کچھ آپ جیسے کامیاب ایڈیٹر کے مرہون منت ہے۔ اس سے وابستہ سبھی احباب چاہتوں بھرے بے لوث رشتے سے منسلک ہیں اور ایک دوسرے میں خلوص و محبت کی شیرینی بانٹتے کتنے اچھے اور بھلے محسوس ہو رہے ہیں۔ جیسے گلوں کی ڈالیاں جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے اپنی بیکراں محبتوں کا اظہار کر رہی ہوتی ہیں۔ پرچے کے سبھی سلسلے عمدہ معیاری اور منفرد ہیں آپ کی بے لوث خدمات اور کوششیں اپنی خوشنمائی کی جھلک دکھا رہی ہیں۔ بلاشبہ آپ کی بیکراں خدمات سراہنے کے قابل ہیں۔ تحریروں کا انتخاب، شاعری کا چناؤ، خطوط کے جوابات، اپنی بات، لطائف کا حسین امتزاج، شگفتہ اور دلچسپ مراسلے، روحانی انداز، سبھی اس پرچے کی جان ہیں جو گھر کا ہر فرد پڑھتے ہوئے مسرور سا ہو جاتا ہے۔ اور یہی اس پرچے کی خوبی ہے کہ مہینہ بھر اس کا انتظار لمحوں کی سولی پر لٹکائے رکھتا ہے۔ امید ہے آپ ہماری انٹری پہ ویلکم کہیں گے۔

☆: محترم حسن نظامی صاحب! خوش آمدید! آپ کے نامے میں سب کچھ تھا سوائے تبصرے کے۔ آپ یقین کریں آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ وہ تشنہ تب ہوگا جب اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ بھی ہو۔

✉: بہاول پور سے سعدیہ بخش لکھتی ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب اسلام علیکم! میں آپ کے ڈائجسٹ

کے بے قاعدہ قاری ہوں۔ کبھی کبھار پڑھ لیتی ہوں۔ اس بار خط لکھنے پر مجبور کر دینے والی کہانی 'بادبان' ہے۔ غم ایسا تھا کہ لگتا تھا کہ کلیجہ دل درد سے پھٹ جائے گا۔ لکھاری نے کیسے یہ فقرے لکھے اور میں اس ناول کی اگلی قسط کا ابھی سے انتظار کر رہی ہوں۔ ناول کی پہلی قسط نہیں پڑھ سکی۔ کچھ عرصے پہلے رضیہ فصیح احمد کی کہانی می ی می پڑھی تھی۔ پوچھنا تھا کیا یہ وہی رضیہ فصیح ہیں جو عالمی شہرت یافتہ ہیں۔ طویل کہانیاں نمبر اچھا تھا اور زیادہ اچھا تب لگے گا کہ ہر شمارے میں ایک طویل کہانی ہو۔

☆: پیاری بہن سعدیہ! ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگی کہ آپ بے قاعدہ قاری ہیں۔ ہمیں تو اچھا تب لگے گا جب آپ ہر ماہ ہمارے احوال میں اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود ہوں گی۔ ہاں می ی ی...... کی مصنفہ عالمی شہرت یافتہ رضیہ فصیح احمد ہی تھیں۔

✉: ہمارے احوال کی رونق سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے، احوال میں شامل ہیں لکھتی ہیں۔ عزیز از جان بھیا کاشی، ڈیئر سسٹرز، برادرز، اینڈ آل اسٹاف اسلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے انشاء اللہ۔ ربط اور ضبط کے سارے بندھن یک لخت ہی ٹوٹ گئے، عارضی مسکراہٹ اور نام کے حوصلے سب ہی جواب دے گئے، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دل غم سے بھر گیا اور مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ہی ڈوب گیا۔ جب ڈاکٹر نے کہا کہ اب اس کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔ آپریشن کرواؤ تو بھی موت۔ نہ کرواؤ تو بھی موت۔ آج سے کچھ ماہ پہلے ایک حادثہ ہوگیا تھا۔ حادثہ بڑا ہوا اور بظاہر مجھے کوئی اتنی بڑی چوٹ نہیں آئی تھی سو نظر انداز کر آئی تھی اور مرض بڑھتا گیا۔ تب سے اب تک اس کی ہر جگہ سے تشخیص کروا چکی ہوں۔ ڈاکٹر، سرجن، اسپیشلسٹ، حکیم، پنجاب بھر سے، دبئی شارجہ تک رپورٹس بھجوائی گئیں مگر پھر وہی بات کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اللہ ہی کوئی معجزہ دکھا دے اگر تو ورنہ...... اس مرض کا کوئی سدباب ہی نہیں۔ تمام بہنوں، بھائیوں، ساتھیوں سے دعاؤں کی التجا ہے۔ خوبصورت، دلکش، حسین ٹائٹل کے ساتھ اپریل کا شمارہ ملا، طویل کہانی نمبر، خوب صورت فہرست، منزہ آنٹی کا اداریہ، تبدیلی دل کی آنکھ سے پڑھا۔ احوال میں تمام لوگوں نے بہت خوب صورت لکھا۔ طالیہ داؤد، ایم عاصم، خالد یوسفی، عرفان حسین، کرن ناز، وارث بیگ، صنم خان، تانیہ راجپوت، غلام مرتضیٰ کو احوال میں خوش آمدید۔ مائی ڈیئر سویٹ اپیا جان زرینہ جونیجو آپ کدھر غائب ہیں۔ جلدی سے احوال میں واپس آجائیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟ (لو! تم انہیں بھی لے ہی آئیں) ڈیئر ملکہ احوال تحسین جونیجو آپ کیسی ہو جاناں۔ خط بہت پسند آیا آپ کا۔ ڈیئر سسٹر تانیہ راجپوت میں خیر سے ہوں۔ آپ کیسی ہو؟ ڈیئر حنا بشریٰ کہانی نہ لکھ سکنے کی وجہ سے جان گئی ہوں گی آپ۔ پیاری آپی مسز نوید ہاشمی آپ کا دیا ہوا خطاب بہت پسند آیا۔ آپ تو مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ ہمیشہ سلامت رہیں آمین۔ انکل عبدالعزیز دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے آمین۔ اسماء اعوان کی لائف بوائے پسند آئی۔ یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے بڑی پیاری تحریر ہے۔ ویلڈن عبدالغفار عابد بھیا۔ یوسف لغاری کی، قتل کے ہو۔ بہت اچھا تھا۔ اندھیرے دریچے روشانے عبدالقیوم۔ پتھر میرا نصیب، نائلہ طارق، انکل محمد سلیم اختر پھر صبح ہوگی، چندر سے عبدالرحمٰن تک نفیسہ سعید، دو کوڑی کی عورت، عقیلہ حق، نزہت جبیں ضیاء، پکا پھل، منزل خان، بابل، شعبان کھوسہ اپنا خون، حسرتِ ناتمام ممتاز احمد، بادبان نعمان اسحاق، گردش جاوید راہی، تمام کہانیاں بہت دل

چسپ اور سبق آموز لگیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ کاشی بھیا زہر عشق بہت اچھی جا رہی ہے۔ ہائیڈ پارک میں تمام لوگوں کے انتخابات پسند آئے۔ تیر نیم کش میں تمام اشعار پسند آئے۔ اسی بات کے ساتھ اجازت اپنا اور اپنے ساتھ والوں بہت سارے والا خیال رکھیے گا۔ سانسوں نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆: اچھی گڑیا! تم نے یہ کیا لکھ دیا..... تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔ خدا ہے! یہ یقین ہے تو اس یقین کو پختہ کرلو چندا کہ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ جہاں حکمت اپنے انجام کو پہنچے وہیں سے قدرت اپنا آغاز کر دیتی ہے۔ ناامید مت ہونا۔ ہم سب کے ہاتھ اپنی اس پیاری بہن کے لیے دعا میں اٹھے ہوئے ہیں۔

✉: زرینہ جونیجو، بورڑی شریف سے اپنی محبتوں کے ساتھ احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا اللہ پاک سے امید واثق ہے آپ خیریت سے ہوں گے آمین۔ ساتھیو! ایک بات میں آپ سب لوگوں سے شیئر کرنا چاہتی ہوں کہ 4 ماہ قبل ہماری دیرینہ دوست لکھاری سدرہ انور (سدرہ شاہین) کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد میری ہر دل عزیز دوست سدرہ شاہین زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ آپ سب سے التماس ہے کہ سدرہ کے لیے دعاؤں کی بارش کر دیجیے۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔ جزاک اللہ خیر۔ کاشی بھیا! اپریل کے شمارے طویل کہانیاں نمبر میں جو کہانیاں پسند آئیں ان میں لائف بوائے، اسماء اعوان، اپنا خون، شعبان کھوسہ، کرم کے فیصلے، عبدالغفار عابد، تم مل گئے ہو، محمد یوسف لغاری، پتھر میرا نصیب، نائلہ طارق، دو کوڑی کی عورت، عقیلہ حق، ایک تصویر ایک کہانی، دانیال شمسی، بابل، منزل خان، حسرت ناتمام ممتاز احمد، گردش، جاوید راہی، بیسٹ کہانیاں تھیں۔ کاشی بھیا کا ناول زہر عشق لاجواب جا رہا ہے۔ سلسلہ مسئلہ یہ ہے مجھے بہت پسند ہے۔ اللہ جل شانہ سب کا بھلا کرے آمین۔ شاہ زری کیسی ہیں آپ ویلکم اِن احوال۔ خط لکھتی رہا کریں۔ تمام ساتھیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ ہمیشہ آباد رہیے۔

☆: پیاری آپی! آپ کی آمد ہمارے لیے خاص عنایت ہوتی ہے۔ اڈی آپ بھی اپنا خاص خیال رکھیں۔ تبصرہ بھیج کر آپ نے دلی خوشی دی ہے۔

✉: احوال کی ملکہ کے لقب سے پکاری جانے والی بہت پیاری ساتھی تحسین جونیجو بورڑی شریف سے لکھتی ہیں۔ حسب معمول اپنے ''سچی کہانیاں'' کا انتظار کر کے جب ہم تھک جاتے ہیں تب اچانک خوشبو کی طرح آ جاتا ہے۔ جسے دیکھ اور پڑھ کر ساری کوفت دور ہو جاتی ہے۔ اول ورق سے آخر تک آپ سب کی محنت اور مصنفین کی ریاضتوں کی گواہی اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ بالخصوص کاشی بھیا کی۔ اللہ سائیں آپ کو سلامت رکھے۔ آمین۔ ٹائٹل بہت پیارا ہے۔ اداریہ تبدیلی بہت ضروری ہے۔ طویل کہانیاں نمبر ہاتھ میں ہے۔ جس میں مختصر کہانیاں بھی شامل ہیں۔ خیر یہ بھی بہت اچھا کیا کسی کا دل نہیں ٹوٹے گا۔ محفل احوال سنہری جال میں مقید کرنے والے تمام خطوط بہت اعلیٰ رہے ماشاء اللہ۔ ہمیں بھی امید ہے کہ ہم کاشی بھیا کی امیدوں کی سنگ میل میں انسانوں کو انسان بنانے میں ہر ممکن کوشش کریں گے۔ عزیز بی اے ... کی دعا ہے کہ اللہ پاک درجات بلند فرمائے آمین۔ پیاری سدرہ انور یقین مانو ہر دم تمہارے لیے دعا گو رہتی ہوں۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ یارا بہت پریشانی رہتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمھیں لمبی...... زندگی سے نوازے آمین ثمہ آمین۔ تانیہ راجپوت خوش آمدید۔ بچے اب آتی رہنا۔ شہر جنگل، اور، اور سچے لوگ آج

بھی ماننے جاتے ہیں۔ پلیز بھیا آپ کی قینچی تھک جائے گی گری بہت ہے۔ تھوڑا آرام کرنے دیں اس بے چاری کو (قینچی اپنا کام کر چکی! کیسا لگا گڑیا؟) ان تمام احباب کی سپاس گزار ہوں جنھوں نے میری تحریر کو سراہا سلامت رہیے۔ کہانیوں میں تم مل گئے ہو، دو کوڑی کی عورت، اپنا خون، حسرتِ ناتمام، پکا پھل، بابل، پھر صبح ہوگی، چندر سے عبدالرحمٰن تک، بہت اچھی تحریریں رہیں۔ زہرِ عشق باکمال ہے۔ ہائیڈ پارک میں تمام معلوماتی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جی جی جا رہی ہوں اب تو قینچی بھی سکون سے بیٹھ جاؤ ناں شاباش۔ (قینچی کہتی ہے ملکہ عالیہ! میں اپنا کام کر کے سکون سے بیٹھ چکی) اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔

☆: پیاری سی گڑیا تحسین! خوش رہو۔ تم نے بہت پیارا تبصرہ کیا ہے۔ انشاء اللہ سدرہ بہت جلد اچھی ہوگی۔

✉: اندرون گول چوک، سرگودھا سے ہمارے پیارے شاعر ساتھی خالد یوسفی عرض کرتے ہیں۔ ماہ اپریل کا شمارہ طویل کہانی نمبر بہت جاندار تھا۔ اپنا خط اور غزل دیکھ کر دل خوشی سے نہال ہو گیا۔ آپ کی اور سچی کہانیاں کی ترقی کے لیے خلوص دل سے دعا گو ہوں۔ کہانیاں بہت معیاری اور عمدہ تھیں۔ بالخصوص اندھیرے دریچے، پھر میرا نصیب، چندر سے عبدالرحمٰن تک، دو کوڑی کی عورت، حسرتِ ناتمام اور گردش شمارے کی بہترین اور شاندار کہانیاں تھیں۔ مصنفین نے زبردست کہانیاں تخلیق کیں۔ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کی نظم بہت اچھی تھی۔ سب دوستوں ساتھیوں کی خدمت میں پر خلوص سلام کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

☆: عزیزم خالد بھائی! پرچہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ یاد رہے اب ہم سے محبت اسی طرح ہر ماہ قائم رہے۔

✉: کمالیہ سے ہماری شاعرہ ساتھی عمارہ ناز اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ احوال میں رونق افروز ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ماہ اپریل کا طویل کہانی نمبر تین اپریل کو خریدا اتنا شاندار شمارہ شائع کرنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ شمارہ بہت اچھا لگا واہ جی واہ آپ نے تو کمال کر دیا۔ احوال میں اپنا خط دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی اور آپ نے مجھے ناچیز بندی کو اتنے پیار سے جواب دیا تو بے اختیار منہ سے نکلا کہ کاشی بھیا تو دل جیت لیتے ہیں۔ سب بہن بھائیوں کے خط پڑھے جو کہ بہت اچھے لگے۔ احوال کے آخر میں کاشی بھیا کی خوب صورت نظم دل میں اتر گئی۔ واہ اتنا عمدہ کلام۔ حسبِ سابق سب سے پہلے دل سے دعا نکلی کہ سب کو سب کی بچھڑی محبت مل جائے میری آنکھیں بھر آئیں۔ شروع سے آخر تک کہانی تم مل گئے نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ روشانے عبدالقیوم کی کہانی اندھیرے دریچے بہت شاندار کہانی تھی۔ عقیلہ حق کی سچ بیانی دو کوڑی کی عورت بہت اچھا درس دیتی کہانی تھی حقیقت میں حیدر جمال جیسے مرد دو کوڑی کے ہوتے ہیں۔ سویرا تو اگرچہ غریب ملازمہ تھی مگر عظمت اور وقار کا پتلا تھی۔ جاوید راہی صاحب کی کہانی گردش واقعی ناقابل فراموش تھی۔ صفیہ سلطانہ مغل، کا کلام میری پکار سنو بہت ہی لاجواب اور عمدہ کلام تھا۔ ہائیڈ پارک میں عماد حسین انصاری اور خالد یوسفی کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔ بہت اچھا کلام تھا۔

☆: پیاری بہن! جب محبت رشتے بناتی ہے تو ہر انسان کی اپنی ایک خاص جگہ بن جاتی ہے۔ آپ سب میرے ہیں۔ میرے لیے یہ مان ہی بہت ہے۔ خوش رہیے۔ سلامت رہیے۔ تبصرہ شان دار کیا تم نے پیاری لڑکی۔

✉: عبدالغفار عابد کی چیچہ وطنی سے احوال میں آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ فاطمہ ثریا بجیا کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لیے رہے گی۔ محترم سلیم اختر کی تحریر ''سترہواں مسافر'' اور کاشی کے سلسلے وار زہر عشق تک ہر کہانی میں ایک پیغام ایک سبق تھا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو عقل کل سمجھ کر اس پیغام پر توجہ نہیں دیتے۔ سترہواں مسافر پر یہی لکھنا کافی ہے کہ وقت احساس کا دوسرا نام ہے۔ محسوس کرنے لگو تو ہر پل صدیوں پر محیط نظر آتا ہے اور بے نیاز ہو جاؤ تو صدیاں پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہیں۔ حنا بشریٰ کی 'مجھے معاف کر دو' پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ہماری ادھوری کہانی، کشاف اقبال کی۔ رضوانہ پرنس کی 'بھوک' بھی لاجواب تحریر تھی۔ ایم اے راحت کی سلسلے وار ہم شکل اور کاشی چوہان کی زہرِ عشق سپنس برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ زہر عشق کے لیے یہ لفظ ہی کافی ہیں۔ محبت کرتے کرتے جب انسان یہ سوچ لے کہ وہ محبت کر رہا ہے تو انسان انسان کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ محبت صرف بے غرض ہوتی ہے ورنہ نہیں ہوتی۔ اس پیغام کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

☆: پیارے غفار! جس دن محبت عام کرنا ہمارا نصب العین بن جائے گا اس دن ہمیں کوئی برا نہیں لگے گا۔ تبصرہ اچھا لگا۔ خوش رہو۔ خدا سے ہر پل دل کو نرم کرنے کی دعا مانگنی چاہیے ہم

✉: اسلام آباد سے نٹ کھٹ عظمیٰ شکور احوال کی زینت بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب آداب! جی مل گیا رسالہ اپریل کے حسین موسم میں۔ نہ سردی نہ گرمی..... دلفریب موسم اور سچی کہانیاں کا ساتھ۔ خوب..... سرورق پہ مسکراتی لڑکی۔ لگا جیسے مجھے ہی دیکھ رہی ہے اور کہہ رہی ہے دوستی کرو گی عظمیٰ! اس کی مسکراہٹ بھی سچی سی لگی۔ منزہ سہام کے لکھے کچھ ''سچ'' پڑھے۔ ٹھیک کہتی ہیں آپ منزہ سہام جی۔ پھر احوال میں پہنچی۔ اچھا لگتا ہے یہاں آ کر۔ خط تو مزے کے ہوتے ہی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے جوابات بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ ویسے ایک بات کہوں ایڈیٹر صاحب! پتا ہے کیا..... مجھے کہانی پڑھ کر انتظار ہی رہتا ہے کہ اس کے آخر میں کیا ہوگا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ پر نہیں نا..... قسم سے میں اس جملے کو ترس گئی ہوں کہ دُکھ نہیں خوشی کی بات بھی ہو۔ دم گھٹتا ہے دکھوں کے حبس میں۔ روشانے عبدالقیوم ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی آپ کی لکھی تحریر ''اندھیرے دریچے'' زبردست تھی۔ ''پتھر میرا نصیب'' نائلہ طارق اُف زندگی اتنی بھیانک نہیں میری بہن۔ محمد سلیم اختر واہ زبردست۔ آپ کی تحریر دلوں کو روشن کر گئی۔ عقیلہ حق 'دو کوڑی کی عورت' لکھ کر آپ نے کہانی کا حق ادا کر دیا۔ میں مزید 6 صفحات پر تبصرہ لکھنا چاہتی ہوں مگر دیکھیں تو ایڈیٹر صاحب کیسے غصے سے گھور رہے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب بس ہائیڈ پارک یہ چند باتیں..... ''پرہیزی مہمان'' اچھا لگا۔ اور ہاں 'وہ ایک وعدہ' بھی اچھا تھا۔ ایم افضل آزاد آپ کا شعر اچھا لگا۔ کرن شہزادی اچھا بول گئیں آپ۔ او کے جی بہت خوش رہیے، آباد رہیے، شاد رہیے سلامت رہیے۔ رسالے کو ڈھیر سارا پیار، کراچی کو بہت ساری دعائیں۔ ایڈیٹر صاحب چلتی ہوں۔ مئی کی چلچلاتی دھوپ میں ملوں گی۔ بائے بائے۔

☆: لیجیے عظمیٰ بی بی! آپ کا شاندار تبصرہ پہنچا اپنے اختتام تک۔ احوال میں باقاعدگی کے لیے ممنون ہوں۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری سی بہن مومینہ بتول عرض گزار ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ مبارک بہت اچھے پراسرار نمبر پر۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک۔ ''روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ، سرخ

لیموں، بھوک، اک پل میں سب کچھ' خاص طور پر پسند آئیں۔ تم نے بہت اچھے انتخاب کیے۔ اس ایڈیشن میں۔ بس نعمان اسحاق صاحب کی بادبان متاثر نہ کر سکی۔ آپ کا ناول، ایک ہی نشست میں ختم کر لیتی ہوں کافی دل چسپ لکھتے ہیں۔ ہائیڈ پارک بھی اچھا جا رہا ہے۔

☆: موینہ جی! سلامت رہیے۔ فون نہ اٹھانا ہماری ناراضگی نہیں مصروفیت ہو سکتی ہے۔ آپ کا فون تو ہم کراچی کی شاہراہوں کو عبور کرتے ہوئے بھی سن لیتے ہیں۔ یاد آیا...... رہی بات شادی کے احوال کے تو دیکھ لیجیے بھائی کی شادی کی تصویری جھلکیاں تک منہ چڑاتی ہیں۔ انتظار...... جلد لگ جائے گا۔

✉: لاہور سے مریم مہربان ملک پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ منزہ سہام، کاشی چوہان اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو سلام قبول ہو۔ سچی کہانیاں کو کافی سالوں سے پڑھتی آ رہی ہوں۔ شعبان کھوسہ کے حوصلہ دینے پر پہلی بار سچی کہانیاں میں لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ ایک اسٹوری بھیج رہی ہوں۔ قریبی شمارے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقعہ دیں گے۔

☆: اچھی مریم! خوش آمدید! تبصرہ اتنا مختصر...... سچ پوچھیں تو مزہ نہیں آیا۔ امید ہے اگلی بار آمد بھرپور ہوگی۔

✉: چک نمبر58 شمالی، سرگودھا سے ہمارے پیارے فیصل ندیم بھٹی احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ماہ اپریل کا شمارہ طویل کہانی نمبر، چار اپریل کو ملا۔ ٹائٹل دیکھ کے آگے چلتے ہوئے منزہ سہام مرزا کے اداریے'' تبدیلی'' کو پڑھا۔ تبدیلی بالکل ہونی چاہیے لیکن مثبت تبدیلی۔ تمام نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید۔ جن میں طالبہ داؤد، ایم عاصم بوٹا، خالد یوسفی، عرفان، کرن ناز، وارث بیگ، قندیلہ صنم، ثانیہ راجپوت وغیرہ شامل ہیں۔ ممتاز احمد صاحب، مسز نوید ہاشمی، ارم خان، تحسین جونیجو کے تبصرے پسند آئے۔ مجید احمد جائی، پروفیسر صفیہ سلطانہ خط بہت پسند آیا۔ فرح انیس صاحبہ! بی اے کا امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے پر مبارک باد قبول ہو۔ اور ماسٹرز کس مضمون میں کر رہی ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ مزید آپ کو کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ پلیٹ فارم سلسلہ ممتاز احمد کی حسرت ناتمام، بہترین کہانی ہے۔ تم مل گئے، یوسف لغاری۔ اندھیرے دریچے، روشانے عبدالقیوم، پتھر میرا نصیب، نائلہ طارق، پھر صبح ہوگی، سلیم اختر، نفیسہ سعید کی کہانی، چندر سے عبدالرحمٰن تک۔ دو کوڑی کی عورت، عقیلہ حق کی شاندار کہانیاں ثابت ہوئیں۔ ہم شکل کی آخری قسط واہ کمال کی رہی۔ پکا پھل، نزہت جبیں ضیاء، بابل، منزل خان، اپنا خون، شعبان کھوسہ کی زبردست مرد کہانیاں ثابت ہوئیں۔ بھارت میں بلیک لسٹ، پڑھ کر جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب ہو رہا ہے۔ بادبان، نعمان اسحاق حیران کر دینے والی کہانی ہے۔ گردش، جاوید راہی ویل ڈن راہی صاحب، زہر عشق، کاشی چوہان صاحب، بھیا ہر قسط ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپی کا سامان پیدا کر رہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے، میں بابا جی ہزاروں دکھی افراد کی خدمت کر رہے ہیں۔ مخلوق خدا کی بھلائی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ ہائیڈ پارک میں حکمت کی باتیں ممتاز احمد کی بہترین تھیں۔ کنکری سونا ہوگئی۔ ملک علی رضا۔ ندیم عباس میوانی کے رہنما اصول اولاد کی تربیت و پرورش کرنے کے سنہری حروف سے آویزاں ہیں۔ سلسلہ تیر نیم کش میں ام حبیبہ اور کرن شہزادی کے شعر پسند آئے۔ کاشی بھیا امتحان میں کامیابی کی آپ نے دعا دی بہت شکریہ۔ اللہ آپ کی دعا قبول فرمائے آمین۔ ہاں اور بھیا

ہماری کہانی کہاں گئی کب شائع ہوگی؟ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔ وسلام۔
☆: پیارے فیصل! خوش رہو! انشاء اللہ بہت جلد تمہاری کہانی بھی سچی کہانیاں کے صفحات پر ہوگی۔ تمہارا تبصرہ اچھا لگا۔
✉: کراچی سے نازیہ بتول رضا کا نامہ موصول ہوا۔ لکھتی ہیں۔ مارچ کا پراسرار نمبر میرے سامنے ہے۔ منزہ سہام کا اداریہ آنکھیں نم کر گیا۔ اپنی کہانی دیکھ کر دل خوش ہوا اب تبصرے کا انتظار ہے۔ میری جنوری کی کہانی ''قسمت کے کھیل نرالے ہیں'' جن بہن بھائیوں نے پسند کی ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ پروفیسر صفیہ سلطانہ میری کہانی پر ہمیشہ تبصرہ کرتی ہیں۔ شکریہ کہ آپ مجھے یاد رکھتی ہیں اس کے علاوہ سدرہ انور علی، سونیا خان، مجید احمد جائی، ایم افضل، قاری زاہد حسین، ممتاز احمد اور محمد قاسم خان نے میری کہانی کو پسند کیا۔ جس سے مجھے مزید لکھنے کا حوصلہ ملا اور اب میں نے طویل کہانی نمبر کے لیے اپنی اسکول فیلو کی کہانی لکھی ہے (اسی کی خواہش پر) آپ سب پڑھ کر بتایئے گا کیسی لگی پراسرار کہانیوں میں ''معاف کرو'' روم نمبر 607 ''بھوک'' ہانڈی'' سرخ لیموں'' منیبو لیے'' آدم خور'' اور منی باجی'' بہت پراسرار لگیں ''حسد کی آگ'' بہترین لگی۔ زیرِ عشق ہر بار کچھ سسپنس چھوڑ جاتا ہے اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے مجھے سب اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ دو بار اللہ کے گھر جا چکی ہوں اب پھر سے دل مچل رہا ہے۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں اللہ انہیں سلامت رکھے۔ میری ہر خواہش کا احترام کرتے ہیں جلد ہی تیسری بار پھر سے حاضری ہوگی انشاء اللہ۔ اللہ آپ سب کا حافظ وناصر ہو۔
☆: نازیہ جی! خداتعالیٰ جلد آپ کی یہ آرزو پھر سے پوری کرے گا۔ تبصرہ بہت لاجواب لگا۔ اختصار میں رہ کر بات پوری...... اگلے ماہ آپ کے بھائی کو احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔
✉: لک موڑ، سرگودھا سے نبیل جاوید لکھتے ہیں۔ ماہ اپریل کا شمارہ 31 مارچ کی شام کو موصول ہوا۔ ہنستی مسکراتی ہوئی ماڈل والا شمارہ ہم نے بھی مسکراتے چہرے سے وصول کیا۔ ٹھنڈے مشروب اور مختلف برانڈ کے اشتہارات سے دعا سلام کے بعد آنٹی منزہ جی کی 'تبدیلی' پر پہنچ کر بریک لگائی۔ تبدیلی کے عنوان پر لکھی عبارت پڑھی پسند آئی ماشاء اللہ۔ اس کے بعد اپنے دوستوں کے خوب صورت خطوط اور کاشی بھائی کی خوب صورت باتوں سے سچی محفل 'احوال' میں انٹری ہوئی۔ احوال میں تمام دوستوں کے لیٹرز اچھے ہوتے ہیں۔ خاص کر ممتاز بھائی، عظمیٰ شکور، پیاری بہن تحسین جونیجو، فیصل ندیم بھٹی، سدرہ انور بلوچ، محمد ندیم میواتی، مجید احمد جائی، ان تمام دوستوں کے لیٹرز اور تبصرے پسند آئے۔ اس کے علاوہ تمام نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ اور پرانے دوستوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ کہانیوں میں تمام کہانی کاروں نے اپنی اپنی محنت سے صلاحیتوں کو منوایا۔ سب سے پہلے کہانی جاوید راہی کی گردش پڑھی۔ خوب پسند آئی۔ ممتاز بھائی کی حسرتِ ناتمام پڑھی دل کو بھاگئی۔ خوبصورت کہانی لگی۔ محمد یوسف لغاری کی 'تم مل گئے ہو' عبدالغفار عابد کی یہ بڑے کرم کے فیصلے، شعبان کھوسہ کی اپنا خون کیا خوب کاوش تھی۔ میرے پسندیدہ لکھاری سلیم اختر کی۔ پھر صبح ہوگی۔ بہت اچھی لگیں۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھی۔ وہ بھی انشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوں۔ اس کے علاوہ بھائی عبدالعزیز جی آ کی والدہ کے لیے دعائے مغفرت۔ آخر میں تمام دوستوں کے لیے دعائے خیر۔

پر اسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو



آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا

کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر 2 کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جون 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جون 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: .... تعداد صفحات: ....

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

فون/ریسل نمبر: ....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جون 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: .... مصنف: ....

دوم، عنوان: .... مصنف: ....

سوم، عنوان: .... مصنف: ....

نام: .... شہر: ....

☆: بھائی نبیل! خدا آپ کو بھی آپ کی تمام نجی پریشانیوں سے نجات دلائے۔ اب احوال سے غیر حاضر نہ ہونا۔

✉: کراچی سے منزل خان عرض کرتی ہیں۔ سچی کہانیاں ہمیشہ کی طرح بہترین، خوب صورت سرورق، زرق برق اشتہارات، ستارے کی مانند جھلملاتا ہوا احوال اور دل پر اثر کر دینے والی کہانیاں اس جریدے کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ منزہ آپی کے اداریے ہمیشہ سچے اور کھرے ہوتے ہیں خدا کرے کہ پاکستان میں آنے والی تبدیلی مثبت ثابت ہو۔ احوال میں ارم خان، ثمیں غزالہ، کرن شبیر، ممتاز احمد، عمارہ ناز، حنا بشریٰ، نعیم اللہ، نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، تحسین جونیجو، آنٹی نفیسہ فضل، قاسم بلوچ اور آپی صفیہ سلطانہ مغل، بھرپور تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ نئے آنے والوں کو جی آیاں نوں اور جنھوں نے میرے تبصرے کو سراہا جن میں ندیم عباس، ابوہریرہ، پیاری سدرہ انور بلوچ بہت بہت شکریہ آپ لوگوں کا۔ پیاری سسٹر ارم خان آپ کے لیے ایک اور مشورہ ہے کہ کسی طرح کاشی بھیا کی قینچی کو اغوا کروا دیں۔ اس قینچی ہی کے ڈر سے بعض ساتھی یادداشت سے نکل کر خطوط کا حصہ بننے سے رہ جاتے ہیں۔ فرح انیس! مبارک ہو مگر ہماری مٹھائی کہاں ہے۔ ہماری نٹ کھٹ سی تحسین جونیجو کہاں کھو گئی ہیں۔ لوٹ آئیں خدا آپ کی تمام پریشانیاں دور کرے۔ ہمیں آپ اداس بالکل اچھی نہیں لگتی۔ مستقل سلسلے اور تمام کہانیاں بہترین اور ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اب اجازت۔

☆: لیجیے منزل صاحبہ! قینچی نے کچھ خیال کر لیا۔ اب خوش۔ تبصرہ کہاں رہ گیا پرچے پر؟

✉: ہمارے بھائی مجید احمد جائی، ملتان شریف سے عرض کرتے ہیں۔ ماہ اپریل 2016 کا سچی کہانیاں چمکتا دمکتا تھوڑا لیٹ ملا۔ تاخیر سے آنا اس کی فطرت بنتی جا رہی ہے۔ مہربانی فرما کر ملتان شریف میں پرچہ جلد از جلد پہنچوایا کریں۔ سرورق خوشیوں کی نوید سنا رہا تھا۔ احوال کی محفل نئے اور پرانے ساتھیوں سے جگمگا رہی تھی۔ کاشی بھیا، ہم آپ کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے لبیک کہتے ہیں۔ نئے احوالیوں کو خوش آمدید! اس بار تمام احوال زبردست رہے۔ پیارے عبدالعزیز جی آ، کی والدہ ماجدہ کے انتقال پر دلی افسوس ہے۔ کہانیوں میں اپنا خون، پکا پھل، گردش، حسرت ناتمام، تم ملے گئے ہو، اندھیرے دریچے، دو کوڑی کی عورت، بہترین تحریریں تھیں۔ سفرنامہ خوبصورتی کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہے۔ زہر عشق نے پُراسراریت میں جکڑا ہوا ہے۔ بادبان ناول خوب جا رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیریم کش اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر سارے پرچے کی بات کی جائے تو طویل کہانی نمبر پیش کر کے عمدہ مثال قائم کی گئی ہے۔

☆: پیارے مجید! تمہارے تبصرے نے سخت مایوس کیا۔ کس طرح تم نے ہماری محنتوں کو ایک سائڈ پر لگا دیا۔ بس اور کچھ نہیں کہنا۔ تمہاری مرضی میں ہمارا کیا عمل دخل بھائی۔

✉: احوال میں یہ حاضری ہے ہماری بھابی صاحبہ، صائمہ مجید کی۔ لکھتی ہیں۔ ماہ اپریل 2016 کا سچی کہانیاں اپنی خوبصورتی کی روایت برقرار رکھتے ہوئے تین اپریل کو ملا۔ سرورق کی حسینہ مسکراہٹیں بکھیرے خوش رہنے کا پیغام دے رہی تھی۔ کمرشل سے جان چھڑاتے ہوئے منزہ سہام کے اداریہ 'تبدیلی' نے متاثر کیا۔ احوال میں قدم رکھے تو کاشی بھیا کی پیاری پیاری باتیں دل کو بھا گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔ اس بار نئے احوالیوں کا ہجوم لگا تھا اور پرانے احوالی نجانے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ نئے آنے والوں کو

ویلکم اور پرانے لکھاریوں کو واپس آنے کی پُر زور اپیل کروں گی۔ احوال سبھی اعلیٰ تھے اور کاشی بھیا کی نظم کے کیا کہنے۔۔۔ بہت اعلیٰ۔۔۔ جن دوستوں نے احوال میں اور اپنی دُعاؤں میں یاد رکھا اُن کی شکر گزار ہوں۔ سلامت رہیں۔ پچھلے ماہ مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے احوال میں شریک نہ ہو سکی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جس کا انتظار ہوتا ہے وہ زہر عشق، کیا جادو ہے قلم میں اور لکھنے والے ہاتھ پیارے ہی ہیں۔ لگتا ہے رات کے پچھلے پہر میں لکھی جاتی ہے تبھی تو اتنی ڈراؤنی اور اسراریت بھری تحریر ہے۔ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا! سفر نامہ بھی خوب سیاحت کروا رہا ہے۔۔ لطف آ رہا ہے۔ اپنا خون، حسرتِ ناتمام، بائل، پکا پھل، چندر سے عبدالرحمن تک، تم ملے گئے ہو، پھر صبح ہو گی، ایک تصویر ایک کہانی، زبردست رہیں۔ ہم شکل کا اختتام خوبصورت ہوا۔ بادبان ٹھیک جا رہا ہے۔ گردش نے چونکا دیا۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، بیوٹی گائیڈ اچھے چل رہے ہیں۔

☆: صائمہ جی! خدا سلامت رکھے۔ تبصرہ شاندار رہا۔ امید ہے آپ ہمارے احوال کا حصہ ہمیشہ بنی رہیں گی۔

✉: علی حسنین تابش، چشتیاں سے لکھتے ہیں۔ پرچہ ملا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ ٹائٹل لاجواب تھا۔ اداریہ بھی ٹھیک تھا۔ منزہ جی عورتوں کی حمایت کرتیں نظر آئیں۔ کاشی بھائی کی باتیں بھی زبردست تھیں۔ احوال کی محفل خوب جمی۔ جن دوستوں نے میری کہانی پسند کی ان کا بے حد مشکور ہوں۔ سب دوستوں کا تبصرہ زبردست تھا۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید اور ساتھ میں یہ گذارش بھی کہ غیر حاضری قابلِ قبول نہ ہوگی۔ محترم سلیم اختر صاحب بیٹی کی شادی پر مبارکباد قبول کریں۔ اللہ پاک نصیب اچھے فرمائے آمین۔ اور ڈھیروں خوشیوں سے نوازے۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو انکل سلیم اختر، جاوید راہی، ممتاز احمد، یوسف لغاری، نائلہ طارق، نفیسہ سعید کے ساتھ بھائی شعبان کھوسہ کی تحریر زبردست تھی۔ کاشی بھائی آپ کا ناول تو بے حد لاجواب رہا۔ حماد کی محبت کے کیا کہنے۔ اگلی کڑی کا انتظار رہے گا۔ اللہ پاک عبدالعزیز جی آ انکل کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ کاشی بھائی کہانی تو بھیجی ہے ذرا نظر ثانی فرمایئے گا۔ حرفِ آخر سب کو سلام۔ اللہ نگہبان۔

☆: پیارے تابش! تبصرہ مختصر اور جامع کیا۔ بہت اچھا لگا۔ کہانی ہمیں پسند نہیں آئی۔ امید ہے تنقید کو مثبت لو گے۔

✉: یہ احوال میں آمد ہی تانیہ راجپوت کی لاہور سے۔ لکھتی ہیں۔ سلام کاشو بھیا! بس بس شکریہ مت کہنا۔ ارے سوری دوستوں کو بھی سلام کہنا ہے نا؟ کیسے ہو سب؟ میں ایک دم فٹ فاٹ۔ بھیا جس روز ڈائجسٹ ملا میں تو خوش ہوئی۔ سرورق پہ بیٹھی ماڈل بھی خوشی کی نوید دے رہی تھی۔ شاید مسکراہٹ زندگی کو طویل اور غم زندگی کو کم کر دیتے ہیں۔ اوہ میں یہ کن باتوں میں پڑ گئی۔ سرورق پسند آیا۔ نوازش نوازش شکریہ مہربانی کاشو بھیا آپ نے خوش آمدید کہا۔ مزا تو تب ہے کہ باقی سب بھی میرے ظہور پر خوش آمدید کہیں۔ لیٹرز سارے اچھے لگے۔ علی حسنین تابش کا ذکر بہت تھا۔ ہاں اچھے رائٹر ہیں۔ مگر کاشو جیسا کوئی نہیں۔ ناول کی کیا ہی بات ہے۔ میرے لیٹر کا جواب اچھا لگا۔ اُمید ہے بھیا کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تو ضرور آئی ہوگی۔ کسی کو ہنسانا بھی بہت بڑا فن ہوتا ہے۔ ارے کمانڈو بھیا کمال لکھتے ہو۔ کہانی بہت بہت پسند آئی۔ سب کہانیاں تو نہیں پڑھ پائی پر زہر عشق تو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ کاشو بھیا اب جلدی سے ناول بک کی۔

صورت میں لے آؤناں۔ ہر ماہ کا انتظار مجھ سے نہیں ہوتا۔ ارے اب جانے دو کاشو بھیا۔ خدا حافظ۔

☆: پیاری ثانیہ! تمہارے تبصرے نے واقعی مسکراہٹ بکھیر دی گڑیا۔ خوش رہو اور احوال میں باقاعدہ رہو۔

✉: احسن ابرار رضوی، ساہیوال سے پہلی بار شاملِ احوال ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ میں آپ کی اِس رنگا رنگ محفل میں آنے کی اجازت چاہوں گا۔ دل تھام لیجئے کیونکہ میری کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں نقاد مشہور ہوں اور کتابوں، ادبی مجلوں پہ مضمون نویسی بھی کرتا رہتا ہوں۔ ڈائی جسٹ کی دُنیا میں نیا ضرور ہوں لیکن اُمید ہے برداشت کریں گے۔ ماہ اپریل 2016 کا سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل خوبصورتی کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ اداریہ ''تبدیلی'' جو اچھے کام کرے اُسے سراہنا چاہیے۔ باقی دودھ کا دُھلا کوئی بھی نہیں ہے۔ احوال پیارے ہیں۔ بس چند لوگوں نے آنکھیں بند کر کے تبصرے کر دیئے ہیں۔ جیسے لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لیا جاتا ہے۔۔۔ عبدالعزیز جی آ کی والدہ کے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور سوگوار خاندان کو صبر کرنے کی توفیق عطا کرے آمین۔ نئی زندگی کا آغاز کرنے والوں کو مبارک باد قبول ہو۔ کہانیوں میں کمرشل کہانی لائف بوائے نے اچھا تاثر چھوڑا۔ تم ملے گئے ہوا اچھی لکھی گئی ہے۔ اندھیرے دریچے، پتھر میرا نصیب، دو کوڑی کی عورت، کہانی کار ہونے کا حق ادا کر دیا۔ پکا پھل، بائبل، اپنا خون بہترین کہانیاں تھیں۔ پھر صبح ہو گی، کمال کی تحریر تھی۔ حسرت ناتمام پلیٹ فارم کہانی سپر ہٹ رہی، جرم کہانی گردش نے بھی اچھے رنگ بکھیرے۔ زہر عشق نے میٹھا میٹھا زہر رگوں میں انڈیل دیا۔ سفرنامہ سیاسی لگ رہا ہے۔ باقی کالم بھی اچھے ہیں۔ پہلے تبصرے میں اتنا ہی، خوش آمدید کہا گیا تو اگلے ماہ تنقیدی اور تعریفی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ اُس وقت تک کے لئے اللہ نگہبان!۔

☆: پیارے احسن! خوش آمدید! تمہاری تنقید نے مزہ نہیں دیا۔ ''نقاد'' ہو..... مگر کیسے نقاد ہو۔ امید ہے سمجھ گئے ہو گے۔ تبصرہ بہتر کیا تم نے۔ اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

✉: ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، چاہ رجب والا، ملتان سے لکھتے ہیں۔ مصروفیات اتنی ہیں کہ جان نکلتی ہے۔ دن بھر کی تھکن سے چُور چُور جب بیٹھک میں ستانے کے لئے جاتا ہوں تو سچی کہانیاں کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔ تھوڑا تھوڑا قسطوں میں آخر تک پڑھ ہی لیتا ہوں۔ مارچ کا احوال نہ لکھ سکا۔ اس کے لئے معذرت۔ ماہ اپریل کا سچی کہانیاں 5 اپریل کو گھنٹہ گھر سے ملا۔ ٹائٹل خوبصورت ہے۔ منزہ سہام کا اداریہ ''تبدیلی'' دل کو لگا۔ احوال میں کاشی بھیا کمال ہی کر دیا۔ ہر دفعہ سچی کھری باتیں کر کے دل جیت لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے آمین۔ سبھی احوالیوں کا فرداً فرداً ذکر کرنے کی بجائے اتنے کہوں گا کہ سبھی نے بہترین لکھا۔ نئے آنے والوں کی اکثریت سے اندازہ ہوتا ہے کہ سچی کہانیاں ہر طرف دُھوم مچا رہا ہے۔ نئے آنے والوں کو مبارک باد۔ پرانے بھی دل جمعی سے لکھتے رہیں۔ کاشی بھیا کی نظم خوب رہی۔ کہانیوں میں پکا پھل، اپنا خون، حسرتِ ناتمام، بانئل، دو کوڑی کی عورت، تم مل گئے ہو اچھی رہیں، زہر عشق، اور بادبان نے اپنے سحر میں لیا ہوا ہے۔ ہم شکل کا اختتام اچھا رہا۔ اس کے علاوہ سفرنامہ، اور مستقل سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ کاشی بھائی اور دانیال شمسی ہر بار خوب محنت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں کے ساتھ خوش رکھے آمین۔

☆: پیارے بھائی! اللہ ان سب کو بھی سلامت رکھے جو دوسروں کے لیے مسیحا ہیں۔ آپ کی آمد ہی ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ ہوتی ہے۔

✉: کنزہ ملک۔ قاسم پور کالونی ملتان، سے لکھتی ہیں۔ ماہ اپریل کا طویل کہانی نمبر لیٹ ملا۔ ٹائٹل بہت اعلیٰ تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام نے ''تبدیلی'' اعلیٰ لکھا۔ تبدیلی کچھ کر گزرنے سے ہوتی ہے صرف ناچ گانے، بھنگڑے ڈالنے سے نہیں۔ احوال کی محفل چمک رہی تھی۔ یہ احوالی کتنے چالاک ہو گئے ہیں۔ ہم ایک ماہ جو حاضر نہیں ہوئے کسی نے پوچھا تک نہیں، کہ زندہ ہو یا مر کھپ گئی ہو۔ کاشی بھیا آپ نے بھی یاد نہیں کیا نا۔ دُنیاوی امتحان آ گئے تھے، اس وجہ سے احوال میں شرکت نہ ہو سکی اور اب تو رزلٹ بھی آ گیا ہے۔ اور ہم اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن بھی لے اُڑے ہیں۔ کتنے کنجوس ہو مبارک بھی نہیں دیتے۔ میرے ماموں نے تو مری کی سیر کروانے کا وعدہ کیا ہے۔ پہلے انعام کے ساتھ، پہلا وزٹ بھی ہونے کو ہے۔ احوال سب کے سب زبردست تھے۔ لکھاری ساتھی عبدالعزیز جی آ کی والدہ خالق حقیقی سے جا ملیں، دل افسردہ سا ہے اور کہتے ہیں ماں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی بخشش فرمائے اور لواحقین کو صبر کرنے کی توفیق عطا کرے آمین۔ کاشی بھیا کی نظم بہت پیاری تھی۔ کہانیوں میں ''اپنا خون'' بہت بہترین کہانی تھی۔ اندھیرے دریچے، پتھر میرا نصیب، حسرتِ ناتمام، گردش، بانئل، پکا پھل، پھر صبح ہو گئی، دو کوڑی کی عورت، اعلیٰ تحریریں تھیں۔ کرم کے فیصلے بور کہانی تھی۔ زہر عشق لمحہ بہ لمحہ تڑپاتی ہے اور پُراسراریت میں قید کیے ہوئے ہے۔ مستقل سلسلے بہترین جا رہے ہیں۔ اب اجازت! اگلے شمارے تک۔ اللہ حافظ۔

☆: پیاری کنزہ! خوش رہو! تبصرہ بہتر کیا تم نے۔ 'پہلی' کامیابی پر مبارک باد قبول کرو۔

✉: ایم۔ اے راحیل، ملتان سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں۔ اس اُمید کے ساتھ آپ کی محفل

میں بنا دستک دیئے چلا آیا ہوں کہ خوش آمدید کہیں گے۔اللہ تعالیٰ اہل ایمان والوں کو اُمن سکون کی زندگی جینے کی توفیق عطا فرمائے۔صحت و تندرستی کے ساتھ ہنستا مسکراتا رکھے آمین۔ ماہ اپریل کا سچی کہانیاں اپنے چاہنے والے، جان سے پیارے دوست کی طرف سے گفٹ ملا۔۔ونڈرفل، خوبصورت تحریروں سے آراستہ پرچہ ہے۔طویل کہانی نمبر کا سرورق اچھا لگا۔ کرشل سے آنکھیں چُراتے اداریے میں نظریں جا ٹکیں۔ ''تبدیلی'' اہل ایمان والوں کو چاہیے کردار، گفتار، سوچوں میں مثبت تبدیلی لائیں اور نفرتوں ، کدورتوں کو جڑوں سے اُکھاڑ دیں۔محبت کے بول بولیں تاکہ زندگی خوشگوار گزرے۔احوال کی محفل مسکراتے چہروں سے سجی تھی۔اُمید ہے اس گستاخ کو بھی کہیں نہ کہیں ٹانک دیا جائے گا۔کاشی صاحب کی نظم نے دل جیت لیا۔کہانیوں میں، تم مل گئے ہو، دو کوڑی کی عورت، ایک تصویر ایک کہانی، پکا پھل، بانٹں، اپنا خون، حسرتِ ناتمام، گردش، پتھر میرا نصیب، اندھیرے دریچے، اچھوتی تحریریں تھیں۔ ''کرم کے فیصلے'' پسند نہیں آئی۔سفرنامہ بھارت میں بلیک لسٹ اور ناول بادبان پسند آئے۔زہر عشق، اچھا ہے۔اس کے علاوہ ہائیڈ پارک، مسئلہ یہ ہے، تیر نیم کش، بیوٹی گائیڈ بہترین۔اجازت چاہوں گا اگلی ملاقات کے لیے۔

☆: پیارے راحیل! خوش آمدید! امید ہے اب تم احوال میں ہمارے ساتھ رہو گے۔اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔

✉: سونیا خان، بستی شاہ گردیز، کوٹلہ رحم علی سے اپنا مخصوص پیارے انداز میں ہمارے ساتھ ہیں۔ماہ اپریل کا سچی کہانیاں ہمارے نرم و ملائم ہاتھوں میں قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔سرورق بہت پیارا اور خوبصورت ہے۔منزہ سہام کا اداریہ ''تبدیلی'' اچھا لگا۔احوال میں کاشی بھیا کی باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری ہوتی ہیں۔ہمیں یک جان ہونا چاہیے اور مل بیٹھنے کی سبیل نکالنی چاہیے۔طالبہ داؤد، نسیم سحر، ایم عاصم بوٹا، خالد یوسفی، شاہد سلیم شاہد، عرفان حسین آصف، محمد شعیب، کرن ناز، ایم وارث بیگ، قندیلہ ضنم، ثانیہ راجپوت، غلام مرتضیٰ اور تمام نئے احوالیوں کو خوش آمدید۔منہ کھولتے رس گلے کھا دیئے اور پرانے احوالیوں کی شرکت سے محفل پُررونق لگ رہی ہے۔جویریہ سلیم کو زندگی کا نیا سفر بہت بہت مبارک ہو۔پیارے ہر دل عزیز لکھاری اور شاعر عبدالعزیز جی آر کی والدہ محترمہ کی وفات کا سُن کر افسوس ہوا۔اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر کرنے کی توفیق دے آمین۔صبر سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے۔اس بار احوال کے آخر میں کاشی بھائی کی نظم پڑھنے کو ملی، کیا خوبصورت نظم ہے۔بہت خوب کہانیوں میں لائف بوائے اچھی جا رہی ہے۔پکا پھل، بانٹں، حسرتِ ناتمام، گردش، اپنا خون، تم مل گئے ہو، چندر سے عبدالرحمٰن تک، دو کوڑی کی عورت، پھر صبح ہو گی، اندھیرے دریچے زبردست کہانیاں تھیں۔پتھر میرا نصیب عام اور کرم کے فیصلے سو سو لگیں۔زہر عشق خوب جا رہی ہے اور ہم شکل کا بہترین اختتام ہوا۔بادبان ناول اچھا چل رہا ہے۔ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش اعلیٰ سلسلے ہیں۔بہت اعلیٰ۔

☆: پیاری گڑیا! اب احوال میں غیر حاضر نہ ہونا ورنہ سزا ملے گی۔

ساتھیو! لیجیے اس ماہ تک کا احوال اپنے اختتام کو پہنچا۔اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہو گی۔اپنا بہت خیال رکھیے گا۔اللہ نگہبان۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

''ایک شام ہمارے ساتھ''

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے دی گئی ''Hi-Tea'' کی تصویری جھلکیاں **(ادارہ)**



منزہ سہام، عقیلہ حق اور رضوانہ پرنس کے نرغے میں جبکہ سیمار ضا ردا، تمیرا راحت اور سکینہ فرخ تصویر کا حصہ ہیں



شیرٹن کی لابی میں مہمان خصوصی نیلوفر عباسی اپنی ہمشیرہ اور رفعت سراج کے ساتھ جبکہ منزہ سہام عابدہ رؤف، شگفتہ شفیق اور رضوانہ پرنس کے ہمراہ



ہائی ٹی سے پہلے کا ایک منظر، سب مصنفات نیلوفر عباسی کو بغور سنتے ہوئے



غزالہ رشید، صبیحہ شاہ، رضوانہ پرنس اور نسیم آمنہ...... آخر یہ انتظار کس کا تھا، بھلا......؟



عقیلہ حق، رفعت سراج اور شگفتہ شفیق



نسیم آمنہ اور منزہ سہام یقیناً کسی ایسی بات پر ہنس رہی ہیں جو اُن کو سمجھ آ گئی ہے

لائف بوائے... قرا قرم سر کرائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

سفر میں صبح سے شام کیسے ہوتی ہے کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ ہاں مگر منزل کا یقین ہو تو ہر ہر لمحہ اپنا آپ وصولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میری زندگی کا بھی ایک Aim تھا۔ میں اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ بڑے ناز ونعم سے تو میری پرورش نہیں ہوئی مگر پھر بھی...... میری ماں نے میری ہر ہر خواہش کو پورا کیا ہے۔

شروع سے ہی مجھے کچھ الگ کر دکھانے کی دھن سوار تھی۔ ہمیشہ میں نے لڑکوں والے کھیل کھیلے۔ گڑیا گڈے مجھے زہر لگتے تھے۔ مجھے لڑکیوں کا رسی کودنا برا لگتا تھا۔ میں تو رسی پر لٹک کر درخت پر چڑھنے کی مشق کرتی تھی اور لڑکوں کو ہرا دیا کرتی تھی۔ کوڑا جمال شاہی' برف پانی' کھوکھو کے بجائے مجھے گھوڑی پتی یا پکی پسند تھا۔ ادھر لڑکیاں اکٹھی ہو کر بالشن ناپتی تھیں اُدھر میں دیواریں پھلانگا کرتی تھی۔

سائیکلنگ' بائیک رائیڈنگ اور گھڑ سواری مجھے بہت پسند تھی۔ میں اچھی تیراک بھی تھی۔

غرض میں نے بچپن ہی سے سوچ لیا تھا کہ لڑکیوں والا کوئی کام نہیں کرنا...... آپ سچ سمجھے۔ میں خود کو لڑکی ماننے پر تیار ہی نہ تھی۔ میری ماں نے بھی میرے مشاغل پر نکتہ نہ اٹھایا۔ بلکہ وہ مجھے بس یہی کہتی تھیں کہ "ملیحہ بیٹی! پہلے اسٹڈی اور پھر گیم۔"

میری زندگی بس اسٹڈی اور گیم کے درمیان گھومتی رہی۔ میں نے ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔

امی نے بابا کے بعد اپنی تعلیم سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بچوں کی کوچنگ نے ان کی اور میری زندگی کو کسی حد تک نارمل کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

بچپن کب، کیسے گزرا کھیل اور پڑھائی میں پتا ہی نہ چلا۔ اب میں کالج میں آ گئی تھی۔ کالج میں، میں نے لڑکیوں کا الگ ہی رنگ اور انداز دیکھا تھا۔

مجھے تو بالوں سے چڑ تھی مگر امی ہمیشہ لائف بوائے شیمپو سے سر دھلا کر رکھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا

کہ لائف بوائے شیمپو سے دھلے بال ہیئر Smell سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جو کام مہنگے سے مہنگا شیمپو کرتا ہے وہی کام لائف بوائے شیمپو بھی قدرے بہتر انجام دیتا ہے۔ مجھے جیسے بالوں سے چڑ تھی اُسی طرح مجھے لائف بوائے شیمپو سے بھی چڑ سی ہوگئی تھی۔ یہ میرے اور لائف بوائے شیمپو کے درمیان اٹھنے والی پہلی دیوار تھی جو غائبانہ اٹھ گئی تھی۔

ہمارے کالج میں اکثر غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر ہوتی تھیں۔ پاکستان وومن ہاکی ٹیم میں بھی ہمارے کالج کی ایک لڑکی کالج کا نام روشن کر رہی تھی۔ اکثر میں بھی کالج کے بہترین طلباء میں اپنا نام دیکھا کرتی تھی۔

کوہ پیمائی میں ہمارے اسکول کا نام بھی شامل تھا اور ہمیشہ کی طرح اس سرگرمی کے لیے بھی سب سے پہلے میرا نام پکارا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں پرنسپل صاحب کے کمرے میں تھی۔

''ملیحہ! اِس بار ایک نہایت منفرد سا مقابلہ حکومت کی جانب سے کالج اسٹوڈنٹس کے درمیان منعقد کیا جارہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس بار تم نا صرف اپنے اسکول بلکہ دنیا بھر میں اپنی دھوم مچا دو۔''

''مگر میم آپ امی کو کیا کہیں گی۔''

''وہی جو ہمیشہ کہتی ہوں You Are A Lucky Woman کہ آپ کے پاس ملیحہ جیسی بیٹی ہے۔''

''اوکے میم!'' میں یہ کہہ کر واپس اپنے کلاس روم میں آگئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔

گھر آتے ہی میں خاموشی سے اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ میری عادت تھی جب میں بہت زیادہ خوش ہوتی تھی تو اپنا کمرہ لاک کر لیا کرتی تھی۔

امی نے دو ایک بار آ کر دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب ندارد وہ واپس پلٹ گئیں۔ اب تو میرے سامنے صرف کوہ ہمالیہ ہی تھی۔ میں خوابوں میں اس پہاڑ کو سر کرتی جا رہی تھی۔

راکاپوشی کی فضائیں مجھے چوم رہی تھیں۔ مجھے چھو رہی تھیں کہ اچانک سے میں خود کو چشم زون میں لائف بوائے شیمپو سے سر دھوتا محسوس کرنے لگی۔

''اوہ مائی گاڈ! امی میرے سامان کے ساتھ لائف بوائے شیمپو بھی تو رکھیں گی۔ اوکے......'' میں مسکرائی اور پہلی بار مجھے اس لائف بوائے شیمپو سے ممتا کا سا احساس چھلکتا محسوس ہوا تھا۔

''گڈ گرل!'' کچھ دیر بعد میں امی کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر تھی۔

''تو پھر تم نے ٹھان لیا ہے کہ تم قراقرم سر کرو گی۔'' اُسے ماں کی بات سن کر کچھ نہ سوجھا تو بولی۔

''میں نے کچھ نہیں ٹھانا...... امی اگر آپ اجازت دیں گی تو یہ ممکن ہو جائے گا ورنہ...... میں آپ کی اجازت کے بغیر کچھ نہ کر سکتی ہوں نہ میں نے کیا ہے۔''

''مجھے اپنی گڑیا سے یہی امید تھی۔'' آگے بڑھ کر امی نے میرا ماتھا چوم لیا۔ دھڑ دھڑ دل دھڑکا اور آنسو ٹپ ٹپ میری آنکھوں سے گرنے لگے۔

''آئی لو یو امی...... میں نے قراقرم سر کر لیا ہے۔ آپ کی محبت اور اعتماد کا...... میں تو صرف کالج کی ایکٹیویٹی کے لیے جا رہی ہوں۔ باقی جو خدا کی مرضی۔''

''جاؤ بیٹی! خدا تمہیں ہر میدان میں سرخرو کرے۔''

یہ کہہ کر زرین بیگم نے بیٹی کا ماتھا چوم لیا۔

سفر کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ میرا ایک چھوٹا سا بیگ جس میں انتہائی ضرورت کی چیزیں شامل تھیں امی نے تیار کیا تھا۔

''ملیحہ! گڑیا سفر کے دوران دھول مٹی اور گرد و غبار بال Damage کر دیتا ہے پلیز میں یہ لائف بوائے شیمپو رکھ رہی ہوں۔ اسے روزانہ استعمال کرنا انشاء اللہ اس میں موجود ملک پروٹین، بادام اور اس کا اپنا ایکسٹرا 30 فیصد زائد مضبوط بال کرنے والا فارمولا اس ٹرپ میں تمہیں اپنے بالوں کی طرف سے آزاد کر کے میری یاد دلائے گا۔''

''امی ..... لگتا ہے آپ لائف بوائے شیمپو سے بہت ٹچ ہیں۔''

''ارے بیٹا! میرے بال دیکھو۔'' انہوں نے جھٹ سے موٹی گھٹی چوٹی میرے سامنے کر دی۔

''یہ سب مضبوطی اور خوبصورتی میرے لائف بوائے شیمپو ہی کی وجہ سے ہے نا۔ تو پھر میں اپنی بٹیا کے لیے اس لائف بوائے شیمپو جیسے پیارے دوست کا انتخاب کرنے میں سیریس نہ ہوؤں ..... بولو۔''

''اوکے امی! یہ آپ کا پیارا دوست آج سے میرا بھی پیارا دوست ہوا۔'' میں نے لائف بوائے شیمپو کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''شریر! چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ کالج والے تمہارا ہی Wait کر رہے ہوں گے۔''

کچھ دیر بعد میں کالج میں تھی اور پھر ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

فلک میں دیکھتے تھے اُڑتے اُڑتے
وہ شہر شب کے
وہ سانولی روشنی کے پیچھے سے جگمگاتے
جزیرے شب کے
ہوا نوردی میں آتے جاتے
وہ کہکشاں میں سروں پر اڑتے
پرندے شب کے

میں راکاپوشی پہ ہوں۔ لگتا ہے سب کچھ خواب جیسا ہے۔ سفید دودھ سے اجلی برف کے درمیان سیدھی لکیر کی طرح ایک دراڑ سی ابھر رہی ہے پہاڑ پر اس دراڑ سے نیچے کی ساری برف ایک جگہ پر گر رہی تھی۔

میں اس سلائڈنگ سے معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ بال دھول میں اٹے تھے کیونکہ سلائڈنگ کے وقت میرا بہت مضبوط کیپ کہیں گرا تو طوفان کی نذر ہو گیا۔ سخت سردی میں جیسے جان نکلی جاتی تھی۔ اس سفید تاج محل جیسے عظیم پہاڑ نے میری ساری قوت جیسے سلب کر لی تھی۔ جانے سارے ساتھی کہاں کھو گئے تھے۔ حالانکہ ہم سب ساتھ ہی تھے۔

میرے کانوں میں اذان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اور لگتا تھا سامنے میری ماں دونوں ہاتھ اٹھائے میری لمبی زندگی کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک کمرے میں تھی۔

''پلیز آپ اٹھنے کی کوشش نہ کریں۔'' میرے اٹھنے پر ایک فرشتہ صورت نرس قریب آئی اور مسیحائی کرنے لگی۔

''اوکے!'' میں نے کہا اور پھر سے بند کر

دراز ہوگئی۔

اُف کیسا خوبصورت سفر تھا۔ قراقرم...... ہمالیہ کی شان، آسمان سے باتیں کرتا پہاڑ ہم راکاپوشی سر کرنا چاہتے تھے۔

مگر...... موسم نے ہمیں اس کی اجازت نہ دی۔ اس سفر کے دوران ہمارا ایک ساتھی Missing تھا۔

اس پہاڑ نے اگر گود میں کسی کو لے لیا تو سمجھ لیں کہ وہ اسی پہاڑ کا ہوگیا۔ خیر اس قدر سخت موسم میں ہمارا سفر جذبے کی Peak پر تھا۔ میں سب سے کم عمر کوہ پیما تھی اس گروپ میں۔ سب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر جہاں پانی ہوتا میں جھٹ سے اپنے بال آزاد کرتی اور لائف بوائے شیمپو سے انہیں دھو ڈالتی۔

سفر میں میرے بال بہت مضبوط رہے۔ یہ میرے لائف بوائے شیمپو کا کمال تھا۔ اس لائف بوائے شیمپو نے مجھے میری ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ اب میں اس بیڈ پر لیٹی قراقرم پر گزرے وقت کی یادوں سے دل کو مطمئن کر رہی تھی کہ نہیں کچھ نہیں ہوا اگر میں نے وہ چوٹی سر نہیں کی۔

میں نے اپنے کالج کا نام ضرور بلند کر دیا تھا کہ ملیحہ نامی ایک طالبہ جسے کالج نے کوہ پیمائی کے لیے چنا۔ وہ آدھا پہاڑ تو سر کر آئی۔

اگر راستے اجازت دیتے 'موسموں کی رضا مندی شامل ہوتی اور سب سے بڑھ کر خدا کا حکم ہوتا تو آج میرا نام بھی راکاپوشی سر کرنے والوں میں ہوتا۔ خیر...... جو نصیب میں تھا ہو کر رہا۔

آنکھیں جل تھل ہونے لگیں اور میرا سر خود بخود ایک طرف کو ہوگیا۔

☆......☆......☆

جب بھی اترو گے تم پہاڑوں سے
نیچے بہتے بیاس کے کنڈے
ایک پتھر ملے گا پانی میں
جی کرے تو اٹھا کے رکھ لینا
ٹوٹ کر یہ میں گرا تھا چوٹی سے!

آہ! میں زندہ تھی۔ آج تصویریں کالج میں سب کے ہاتھوں میں تھیں جو حکومت کی طرف سے کالج والوں کو دی گئی تھیں۔ اخبار میں چند تصویریں لگائی گئی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ سب لوگ ملیحہ راجپوت کے بارے میں جان کر شاکڈ رہ گئے تھے کہ یہ اتنے سخت امتحان کے بعد سرخرو کیسے تھی۔

اور پھر ایک پریس کانفرنس ہونا تھی اور اس پریس کانفرنس میں اس ''مہم'' کے بارے میں بہت سارے سوال تھے۔ جو میرے منتظر تھے۔

صحافی پوچھ رہے تھے۔

''کیسا محسوس ہوا جب پہلی بار اس دنیا کے عظیم پہاڑ پر قدم رکھا؟''

''کیا بتاؤں! ان شہروں کی خوبصورتی سے ہٹ کر اگر پہاڑوں پر جائیں تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ ہمارے رات دن اور پہاڑوں پر کٹنے والے رات دن الگ ہوتے ہیں۔ پہاڑوں پر رات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

پہاڑوں پر آسمان روشن رہتا ہے۔ بجھتا ہی نہیں۔ دریا روشن رہتا ہے۔ کبھی تھکتا ہی نہیں۔ لگتا ہے آسمان کی چادر نے تاروں کی شکل میں زری کی چادر اوڑھ لی ہو۔ سب کچھ شفاف دکھتا ہے۔

جس طرح جہاز سے رات میں شہر روشنی کا استعارہ ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح پہاڑوں سے بھی شہر روشنی کے ٹمٹماتے جگنو محسوس ہوتے ہیں۔''

"مس ملیحہ! کیا اب پھر سے کوہ پیمائی کریں گی آپ؟" ایک صحافی کا چبھتا ہوا سوال آیا۔

"جی بالکل! میری بیٹی جب تک راکاپوشی سر نہیں کر لیتی کوہ پیمائی کرتی رہے گی۔"

اس سوال کا جواب میری ماں نے دیا تھا۔ بے اختیار میں نے امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ میرے بال لہرانے لگے تو ایک دم سے ایک صحافی کا سوال آیا۔

"مس ملیحہ! اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوہ پیماؤں کے بال اپنا حسن کھو دیتے ہیں مگر آپ کے بال تو لگتا ہے پہاڑوں کے سفر نے مزید خوبصورت کر دیے ہیں۔"

"اس سوال کا جواب میں نہیں، میری ممتا کا دوسرا نام ...... لائف بوائے شیمپو دے گا۔" میں نے اپنے بیگ سے لائف بوائے شیمپو کی بوتل نکال کر ہاتھ میں ایوارڈ کی طرح لہرائی۔

"لائف بوائے شیمپو نے میرا ساتھ میری ماں کی طرح دیا۔ میری امی نے ہمیشہ لائف بوائے شیمپو کو میرا ساتھی بنا کر رکھا اور پہاڑوں کے سفر میں بھی میں لائف بوائے شیمپو کی طاقت اور حفاظت کو مان گئی۔

سچ ہے اگر لائف بوائے شیمپو میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میرے بال بھی کھردرے اور بے رونق ہو کر مجھ سے ناتا توڑ دیتے۔

آئی لو یو ای اینڈ آئی لو یو لائف بوائے شیمپو، آج میں بہانگ دہل کہتی ہوں۔ دنیا میں ہمالیہ عظیم کے بعد اگر میرے لیے کوئی چیز عظیم ہے تو وہ ہے لائف بوائے شیمپو۔"

میرے اتنا کہنے کے بعد ہی پریس کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی اور پھر میں اور امی بھی گھر آ گئے۔

☆......☆......☆

جیسے ایک دیہات کے دوست اچانک مل کر وادی میں
گاؤں بھر کا پوچھتے ہیں
نظم بھی آدھی آنکھیں کھول کے سوتی ہے
رات پہاڑوں پر کچھ اور ہی ہوتی ہے

ہم ماں بیٹی مل کر رو رہے تھے۔ یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔

اعتماد کے آنسو تھے۔

محبت کے آنسو تھے۔

جیت کے آنسو تھے۔

میں ایک ایک بات، ایک ایک یاد امی سے Share کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

میری ماں نے میرا ہر ہر پل ساتھ دیا اور پورے سات سال بعد میں پھر سے قراقرم سر کرنے نکلی ہوں۔ اپنے لائف بوائے شیمپو پر اعتماد کے ساتھ مگر ...... میرے ساتھ میرے لائف پارٹنر اریب حسن بھی ہیں۔

مجھے امید ہے ہم دونوں اب مل کر اس پہاڑ کو سر کر لیں گے۔

سفر شروع ہے اور میری ماں کی دعاؤں کے دیپ نشانِ منزل بن رہے ہیں۔

اچھے لگتے ہیں یہ پہاڑ مجھے
چوٹیاں بادلوں میں اُڑتی ہیں
پاؤں برخاب بہتے پانی میں
ٹوٹتے رہتے ہیں ندیاں
کتنی سنجیدگی سے بہتے ہیں
کس قدر مستقل مزاج ہیں یہ
اچھے لگتے ہیں یہ پہاڑ مجھے!

☆☆......☆☆

خیر اور شر سے جڑی وہ طویل کہانیاں

جن کے کردار ہمارے معاشرے میں اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ موجود ہیں

ملک اور بیرونِ ملک سے زندگی کی تصویریں

اک دیا جلتا ہے!!

اقبال بانو

اس نافرمان دوشیزہ کی عبرت ناک کہانی

جس نے اپنی ماں پر تہمتوں کا بازار گرم کر دیا تھا

وہ مسہری پر پڑی اسی کا کوئی حصہ معلوم ہورہی ہے۔ اس کی ستاروں کی طرح چمکتی براؤن آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں اور سیب جیسے رخساروں پر صرف ہڈیاں نظر آرہی ہیں۔ وہ مکمل



طور پر ڈھانچے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ سفید چادر پر جو اُس کا ہاتھ پڑا ہے یوں لگ رہا ہے جیسے کہ کسی آسیب کا پنجہ ہو۔ اُبھری ہوئی بے شمار رگیں، کسی خاردار جھاڑی کا گمان ہوتا ہے اور میں جھرجھری لے کر رہ جاتی ہوں۔ اُس کے جسم کی اگر کوئی چیز ٹھیک ہے تو وہ اُس کی آنکھیں ہیں...... اور جب وہ اپنی دھنسی ہوئی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ تو اُس کی آنکھوں میں اتنی ویرانی، اتنی اداسی، اتنے دکھ اور بے شمار...... سوالات ہوتے ہیں کہ میں کپکپا کر رہ جاتی ہوں..... اندرونی خوف مجھ پر غالب آجاتا ہے اور تب میرا رُواں رُواں کھڑا ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے یہ ڈھانچہ ابھی اُٹھ کر مجھے دبوچ لے گا۔ مگر پھر میں اپنے اندر کے خوف کو دبا لیتی ہوں۔ کیونکہ نہ تو وہ بول سکتی ہے اور نہ ہی وہ چل سکتی ہے۔ اور جو شخص ہاتھ پاؤں ہلانے کے لیے ہی دوسرے کا محتاج ہو وہ بھلا کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟

وہ اب بھی میری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان اُس کا ساتھ نہیں دیتی۔ اور وہ، وہ سب کچھ مجھے آنکھوں کو زبان سمجھانا چاہتی ہے۔ مگر میں ایسی کند ذہن ہوں کہ اُس کی آنکھوں کی زبان نہیں سمجھ سکتی۔ حالانکہ کہا یہ جاتا ہے کہ۔ وہ عورت ہی کیا جو آنکھوں کی زبان نہ سمجھ سکے۔

مگر یہ جملہ صرف اُن آنکھوں کی زبان کے متعلق ہے جو کہ مرد آنکھوں ہی آنکھوں میں عورت سے بے شمار باتیں کر جاتا ہے اور وہ سمجھ بھی جاتی ہے..... مگر بھلا عورت، عورت ہی کی آنکھوں کی زبان کیسے سمجھ سکتی ہے؟

مجھے اس وقت خود پر بے تحاشا غصہ آرہا ہے کہ آخر میں آنکھوں کی زبان کیوں نہیں سمجھ رہی؟

مگر کیا سمجھوں؟

اُس کی آنکھوں میں تو پیلاہٹ ہے!

ویرانی ہے؟

اداسی ہے۔

آنسوؤں کی نمی ہے۔

بھلا یہ چیزیں مجھے کیا سمجھا سکتی ہیں؟

جی ہاں یہ سب میں پٹھانی کے متعلق بتا رہی ہوں۔

پٹھانی جس کا اصل نام تو رقیہ ہے۔ مگر وہ اپنی میدے جیسی سپید رنگت سنہری بالوں اور براؤن چمکتی آنکھوں کی وجہ سے پٹھانی کہلاتی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ اُسے پٹھانی کہتے ہیں۔ اور اس نام سے جانتے ہیں۔ رقیہ تو صرف قریبی لوگوں اور یا پھر پٹھانی کے والدین کو یاد ہے۔ یا پھر مجھے کیونکہ پٹھانی میری ہم عمر ہے۔ ہمارا بچپن ایک ساتھ گڑیاں پٹولے کھیلتے ہوئے گزرا۔ وہ پٹھانی جو بہت شوخ و چنچل ہوا کرتی تھی۔ نچلا بیٹھنا نہیں جانتی تھی۔ آج میرے سامنے وہ پڑی ہے۔ آج وہی پٹر پٹر بولنے والی پٹھانی میرے سامنے بے حس و حرکت لیٹی ہے۔ چھ ماہ قبل اُس پر فالج کا حملہ ہوا تو وہ قوتِ گویائی سے محروم ہوگئی پھر تین روز بعد پھر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بالکل مفلوج ہوگئی۔ حتیٰ کہ ہاتھ تک نہیں ہلا سکتی۔ چھ ماہ میں ہی سب اُس سے پریشان ہو گئے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی حکیم نہیں چھوڑا گیا۔ تعویذ دھاگے بھی کیے مگر وہ اس جانکنی کے عالم سے نہیں نکلتی نا ٹھیک ہوتی ہے اور نہ ہی موت اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹتی ہے۔ شاید موت بھی اس تیز طرار پٹھانی سے خوف کھاتی ہے۔ اور پٹھانی مسہری پر چت لیٹی چھت کی کڑیوں کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔ کئی روز سے اُس نے کچھ نہیں کھایا۔ اور اُس کے چہرے پر مردنی بڑھتی جا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کسی چیز میں جان اٹکی ہے۔ کسی کو دیکھنے کی تمنا ہے۔ آنکھوں میں انتظار کی جوت ہے۔

"طاہرہ بیٹی عالم صاحب آگئے ہیں۔ اگر جا ہو تو تم پردہ کرلو۔" ارشد علی صاحب کی آواز سے میں چونک اٹھی ہوں۔ وہ دروازے میں کھڑے ہیں۔

"چاچا جی لے آئیں آپ؟" میں نے اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا اور پھر پٹھانی کے قریب جا کر اُس کی چادر درست کی اُس کا کھردرا سا ہاتھ چادر کے اندر کیا۔ تب ہی عالم صاحب کمرے میں آگئے۔ سفید چغے میں ملبوس، بغل میں سیاہ جلد کتاب دبائے

وہ واقعی کوئی عالم تھے۔ اُن کا چہرہ بہت نورانی تھا اور ارشد علی صاحب بچھے جا رہے تھے۔

عالم صاحب نے اپنے بیگ میں سے کاغذ قلم نکالا۔ ایک کتاب نکالی نام پوچھا پھر کافی دیر تک وہ کاغذ پر لکھتے رہے۔ کبھی کتاب میں دیکھنے لگ جاتے۔ کمرے پر ایک سکوت طاری تھا اور سب گم صم تھے کہ عالم صاحب فال میں کیا بتاتے ہیں۔ ارشد علی صاحب کبھی پٹھانی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے، کبھی اُس کا سر تھپکتے۔ اور پھر اتنی ویران نظروں سے پٹھانی کو دیکھنے لگتے کہ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ ہائے یہ ماں باپ کی محبت بھی کیا شے ہے۔ اور بیٹیاں تو ویسے بھی باپوں کی بہت پیاری ہوتی ہیں۔

ارشد علی کو بھی پٹھانی سے بہت پیار تھا اور ان کی پہلوٹھی کی بیٹی جو تھی وہ۔ آدھے گھنٹے بعد عالم صاحب کی آواز نے کمرے کا سکوت توڑ دیا۔

''ارشد صاحب!'' وہ بولے۔ پھر پٹھانی کی طرف دیکھا۔

''اِس بی بی نے بہت ہی اہم ہستی کا دل دکھایا ہی۔ اور جب تک وہ اِسے معاف نہیں کرے گی۔ تب تک اس کی جان نہیں نکلے گی۔''

''آخر وہ کون سی ہستی ہے؟'' ارشد علی جلدی سے بولے۔

''یہ آپ کو یا بی بی کو پتا ہوگا۔ اب میں مزید حساب نہیں کر سکتا۔'' عالم صاحب بیگ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ تب ارشد علی بھی ان کے ہمراہ کمرے سے چلے گئے۔ پٹھانی نے میری طرف دیکھا اور اب میں اُس کی آنکھوں کی زبان سمجھ گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''طاہرہ بتاؤ میں نے کس کا دل دکھایا ہے؟''

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' میں نے اُس کو نظر انداز کر کے اس کے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''میں اب ٹھیک نہیں ہوں گی طاہرہ...... تم مجھے بتاؤ کہ میں نے کس کا دل دکھایا ہے؟''

اب میں اسے کیا بتاؤں کہ اس نے واقعی کسی کا دل دکھایا ہے۔ ہاں پٹھانی، عالم صاحب نے صحیح کہا ہے تُو نے بہت ہی عظیم ہستی کا دل دکھایا ہے۔

وہ جو کائنات کی خوب صورت ترین چیز ہے۔

وہ جو قدرت کی طرف سے بہترین تحفہ ہے۔

اُن کے لیے......

جو اُس کی قدر کرتے ہیں۔

جس کے پیروں تلے جنت ہے۔

اور...... قیامت کے روز جس کے نام سے بچوں کو پکارا جائے گا۔

ہاں وہ عظیم ہستی ماں ہے۔ ماں.....

ماں جس کی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔

تو پھر...... بددعائیں بھی یقیناً فوراً قبول ہوتی ہوں گی۔

اور شاید......

پٹھانی کی ماں نے بھی اُسے بددعا دی ہو گی......

اس نے ماں کا دل جو دکھایا تھا۔

مگر نہیں سنا تو یہ ہے کہ ماں کبھی بددعا نہیں دیتی اس کا تو رُواں رُواں اولاد کو دعائیں دیتا ہے تو پٹھانی کی ماں نے بددعا نہیں دی۔

تو پھر پٹھانی کو یہ عذاب کیوں سہنا پڑا؟

کیا جرم تھا اس کا جو وہ جانکنی کے عالم میں پڑی ہے۔ نہ مرنے والوں میں ہے نہ جینے والوں میں سے ہے۔

☆☆☆

راشد علی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھے۔ ارشد علی، اشرف علی، سکینہ اور شاہدہ۔ دونوں بیٹیاں بڑی تھیں۔ اس لیے پہلے اُن کی شادی کر دی گئی۔ سکینہ تو گاؤں ہی میں اُن کے مکان سے ایک مکان چھوڑ کر رہتی تھی جبکہ شاہدہ شادی کے بعد جھنگ چلی گئی تھی۔

راشد علی کی شہر میں کپڑے کی دو دکانیں تھیں ایک میڈیکل اسٹور تھا۔ جو کہ ارشد اور اشرف چلایا کرتے تھے۔ پورے گاؤں میں صرف وہی ایسے تھے جو شہر جا کر کماتے تھے۔ ان کا میل ملاپ بھی کسی سے نہ تھا۔ اپنے ٹیپ ٹاپ میں رہتے اور گاؤں کے غریب لوگوں سے بات نہ کرتے یا یوں کہا جائے کہ راشد علی کا گھرانہ غریب لوگوں سے بات کرنا پسند ہی نہ کرتا تھا۔

راشد علی کی بیوی کریم خاتون ایک مغرور عورت تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود مسی مسواک کرتی اُلٹے بال جماتی۔ آنکھوں میں سلائیاں بھر بھر سرمہ لگاتی۔ اور نوکروں پر حکم چلاتی۔

راشد علی کی بہن بھی شہر میں رہتی تھی۔ اُس کا میاں حیدر مل میں مزدور تھا۔ تین بیٹیاں جوان بیٹھی ہوئی تھیں اور ابھی تک رشتہ کوئی نہ آیا تھا۔ بیٹا تھا نہیں۔ ایک روز ارشد علی اپنی پھوپو کے ہاں گیا تو اُسے اُس چھوٹے سے مکان میں ایک ہیرا نظر آ گیا۔ یہ زرینہ تھی اس کی پھوپو کی بیٹی۔

چھینٹ کے پھولدار سوٹ میں ململ کا دوپٹہ قرینے سے اوڑھے وہ ارشد علی کو پانی دے رہی تھی۔ تب وہ جھکی جھکی سی سادہ سی زرینہ، ارشد علی کے دل میں اُتر گئی۔ اُس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس سادگی کے مجسمے کو اپنے کمرے میں نصب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

راشد علی تو بیٹے کی پسند پر جھوم اٹھے ان کی تو ولی مراد بر آئی تھی۔ کریم خاتون نے آئیں بائیں کی۔ مگر شوہر اور بیٹے کے سامنے ایک نہ چلی تب وہ پہلی مرتبہ اپنی نند کے ہاں گئیں۔ دوسری بار وہ بیٹا بیاہنے وہاں گئیں اُس کے بعد انھوں نے بھی نند کے گھر کی دہلیز پار نہ کی...... کیونکہ ان کی نند غریب تھی اور کریم خاتون کو غریبوں سے نفرت تھی۔

زرینہ، ارشد علی کی سنگت پا کر بہت خوش تھی مگر پتا نہیں تھا کہ اُس کی یہ خوشیاں صرف چند روزہ ہیں۔ کریم خاتون بہو کے کام میں کیڑے نکالتیں۔ اُس کے ماں باپ کی غربت کا طعنہ دیتیں۔ جہیز نہ لانے پر سو سو باتیں بنائیں۔ اور اُن کا ساتھ سکینہ بھی پوری طرح دیتی۔ تب زرینہ گھٹ کر رہ جاتی۔ آنسو اندر ہی اندر گرتے رہتے۔ وہ ارشد علی سے کوئی شکایت نہ کرتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں فساد ہو۔ وہ اللہ کی ذات سے مایوس نہیں تھی۔

پھر ایک روز ارشد علی نے کمرے میں آتے ہی اسے پیٹنا شروع کر دیا وہ مشین پر بیٹھی کپڑے سی رہی تھی۔ اِس ناگہانی آفت سے گھبرا گئی۔

''ارشد آخر ہوا کیا؟'' زرینہ اپنا بچاؤ کرتی ہوئی بولی۔

''بتا دروازے میں کھڑی کس سے باتیں کر رہی تھی؟'' ارشد نے اُس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

''خدا گواہ ہے۔ ارشد میں تو آج دروازے پر گئی نہیں۔'' وہ سسکی۔

''جھوٹ مت بول۔ سکینہ آپا نے خود دیکھا ہے گلی میں کوئی کھڑا تھا۔'' وہ غرایا۔

''ارشد تو یقین کر...... سکینہ آپا تو مجھ سے جلتی......''

''میری بہن پر الزام نہ لگا اپنا داغ چھپانے کے لیے۔'' ارشد علی نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔ تب زرینہ نے سوچا وہ غلطی پر تھی۔ اگر وہ ان کی زیادتیاں پہلے ہی ارشد کے کانوں میں ڈال دیتی تو یہ نوبت تو نہ آتی۔ اب تو واقعی ارشد کے کانوں میں غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں۔ پھر دونوں کے درمیان بیگانگی کی ایک چادر سی تن گئی۔ یونہی دن گزرتے گئے۔

روتے ہنستے۔

ڈیڑھ سال بعد اللہ تعالیٰ نے اُس کے چمن میں ایک پھول مہکا دیا۔

براؤن آنکھوں، سپید رنگ اور سنہری بالوں والی گڑیا نے جب اپنی دادی کریم خاتون کی گود میں آنکھیں کھولیں اور دھیرے سے مٹھیاں بند کیں۔

''یہ تو بالکل پٹھانی ہے۔'' کریم خاتون نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ تب زرینہ نے ہولے سے پلکیں موند لیں اور ایک طویل سانس لے کر سوچا۔ شاید اب میری اس گھر میں کچھ اہمیت ہو جائے۔ کیونکہ میں نے ایک کھلونا اس گھر کو دے دیا ہے۔

مگر......

یہ اس کی بھول تھی۔ پٹھانی پر پورا پورا دادی کا قبضہ تھا۔ بس جب وہ روتی تب کریم خاتون، پٹھانی کو اس کے پاس لے آتی اور دودھ پلانے کے بعد کریم خاتون اسے لے جاتی۔ کریم خاتون، پٹھانی کو زیادہ اپنے کمرے میں ہی رکھتی تھی۔ اور زرینہ دل مسوس کر

رہ جاتی تھی۔ کیسی ماں تھی یہ جو اپنی بیٹی کو پیار بھی نہ کر سکتی تھی۔

پٹھانی پانچ سال کی ہوگئی تھی اور اس کی دو بہنوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا وہ بھی پٹھانی کی طرح بہت خوب صورت تھیں۔ مگر زرینہ نے انھیں دادی سے زیادہ نہیں ملوایا تھا۔ وہ بس پٹھانی کو ہی دے کر چھاتی تھی۔ اور دونوں چھوٹی رضیہ اور رفیعہ دادی کے پاس جاتی بھی نہ تھیں۔ اور اُدھر پٹھانی ماں کے قریب نہ آتی تھی۔ صاف کہتی۔

''زرینہ مجھے تجھ سے نفرت ہے۔''

یہ جملہ سن کر زرینہ کے دل پر آرے چل جاتے۔ پٹھانی نے زرینہ کو کبھی اماں نہ کہا تھا۔ وہ پھوپو سکینہ اور دادی کو بالترتیب اماں، بڑی اماں کہتی تھی۔ جبکہ زرینہ کا جی چاہتا تھا کہ وہ اُسے اماں کہے...... کیونکہ جو عورت جب اپنی تخلیق کو بولتے سنتی ہے تو وہ یہی چاہتی ہے کہ وہ اُسے ماں بولے اور وہ اپنے...... سے جواب دے جی...... جی۔ اُسے علم تھا کہ پٹھانی کو یہ سب کچھ پھوپو اور دادی سکھاتی ہیں۔ ایک روز پٹھانی نے کہا۔

''ارے زرینہ''

اس طرزِ تخاطب پر زرینہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے پٹھانی کے گالوں پر تھپڑ جڑ دیے۔

''میں تیری ماں ہوں نوکرانی نہیں۔'' زرینہ نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''اے ہٹ!'' کریم خاتون دوڑ کر آئی اور پٹھانی بھی۔ ''بڑی اماں'' کہہ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اور اُس روز ارشد علی نے زرینہ کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

''تیری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی کو ہاتھ لگانے کی؟''

''ارشد وہ میری بھی بیٹی ہے۔'' زرینہ منمنائی۔

''تیری بیٹی...... وہ میری بیٹی ہے سمجھی۔'' ارشد علی مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

''اُس نے مجھے اس طرح بلایا تھا جیسے میں اس کی نوکر ہوں۔'' آخر زرینہ نے کہا۔

''ہاں تو اس کی نوکر ہے۔''

ارشد علی نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور پھر باہر چلا گیا۔

میں اور پٹھانی گاؤں کی گلیوں میں ہی کھیلتے۔ حالانکہ میرا گھر اُس کے گھر سے خاصا دور تھا۔ اس کی پھوپو سکینہ کے برابر میں تھا۔ پھر بھی ہمارا دروازہ دوسری گلی میں کھلتا تھا۔ مگر ہماری بہت دوستی تھی۔ سارا دن ہم ساتھ رہتے تھے۔

میں جب بھی اُس کے گھر جاتی اور جب اُس کا زرینہ کے ساتھ حقارت آمیز رویہ دیکھتی تو مجھے بہت دکھ ہوتا حالانکہ میں خود چھوٹی تھی۔ مگر مجھ سے ماں کی بے ادبی نہ دیکھی جاتی۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ چاہے وہ میری ماں تھی یا پٹھانی کی تھی تو ماں؟

جوں جوں پٹھانی بڑی ہوتی گئی ماں سے اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ہم بچپن کی حدوں کو چھوڑ کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے۔

پٹھانی اور میری عمر تیرہ برس ہو چکی تھی۔ انھیں دنوں بڑی منتوں مرادوں کے بعد تین بہنوں کے بعد پٹھانی کا بھائی بھی اس دنیا میں آ گیا...... مگر وہ بہنوں کی طرح خوب صورت نہیں تھا۔ اُس کا جسم بالکل سرخ تھا۔ جو کہ بعد میں کالا ہو گیا۔

ارشد علی تو ویسے ہی شکّی مزاج آدمی تھا۔ زرینہ کے پہلو میں ننھے فرشتے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بتا یہ کس کا ہے؟''

''ارشد یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' زرینہ کی آنکھیں مارے حیرت کی پھٹی رہ گئیں۔

''میں پوچھ رہا ہوں یہ کس کا ہے؟'' ارشد نے الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔

''ارشد یہ...... یہ ہمارا بیٹا ہے۔'' زرینہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

''صرف تمہارا...... یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔'' ارشد علی نے نفرت سے زرینہ کو دیکھا۔

''نہیں یہ تمہارا ہی خون ہے۔ تم غور سے دیکھو یہ تمہارا ہی بیٹا ہے۔'' زرینہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اگر یہ میرا ہے تو پھر تینوں لڑکیوں کی طرح خوب صورت کیوں نہیں؟''

''ضروری تو نہیں کہ خدا اپنے ہاں کی تمام خوب صورتی ہمارے ہی بچوں کو بخش دے۔ اور لڑکیاں خوب صورت نہ ہوں تو اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں جبکہ لڑکوں کے لیے ایسی کوئی مشکل نہیں۔'' زرینہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

''مجھے اپنی باتوں میں نہ اُلجھا...... یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔'' ارشد علی تنتناتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اور زرینہ گم صم بیٹھی رہ گئی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ یا خدا تُو تو جانتا ہے۔ میں نے تو کسی نامحرم کی آج تک شکل نہیں دیکھی۔ یہ کس جرم کی سزا ہے؟ یا خدا...... یا تو تُو نے پہلے بچے بھی کالے کلوٹے دیے ہوتے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا تھا تو تُو اُسے بھی خوب صورت بنا دیتا...... وہ بچے کو سینے سے چمٹا کر بُری طرح رو دی۔

پھر یہ ہوا کہ ننھے شعیب کو سوائے ماں اور رضیہ اور رفیعہ کے کوئی پیار نہ کرتا۔ دادی تو دیکھنا پسند نہ کرتی اور جب بھی نظر پڑتی تو فوراً کہتی۔

''نہ جانے کس کا پھل ہمارے اُجلے آنگن میں آن گرا ہے۔''

ایک روز پٹھانی نے کہا۔'' بڑی اماں...... اس جملے کا کیا مطلب ہے؟''

''شعیب تیرا بھائی نہیں ہے۔ پتا نہیں کس کا نطفہ ہے۔'' کریم خاتون نے منہ بنا کر کہا اور پھر یہ جملہ پٹھانی کے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ اور اس نے شعیب کو کبھی بھائی نہ سمجھا۔

پٹھانی ارشد علی سے زرینہ کی جھوٹی شکائتیں لگا کر ارشد علی سے مار پٹواتی۔ اور زرینہ کئی کئی روز اپنے جسم کو سینکتی رہتی...... ایک روز شام کو میں اور پٹھانی گڑیاں کھیل رہے تھے۔ وہ پورا دن میں نے پٹھانی کے ساتھ گزارا تھا۔ شام درختوں پر جھک آئی تھی تب ہی ارشد علی آ گیا۔

''بابا۔'' پٹھانی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ ارشد علی نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ حالانکہ وہ چھوٹی بچی نہیں تھی۔

''بابا آج زرینہ نے میری گڈی اٹھا کر پھینک دی۔ اور مجھے مارا بھی تھا۔ یہ دیکھ!'' پٹھانی نے اپنی کلائی باپ کو دکھائی اور ارشد علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ زرینہ چولہے پر بیٹھی ہانڈی بھون رہی تھی۔ ارشد علی نے اُسے چوٹی سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ اور پھونکنی سے اس کا جسم داغ داغ کر دیا۔ اور میں سہم کر کیکر کے تنے سے لگ گئی۔ جب میری نظر پٹھانی پر پڑی وہ اپنی دادی کی گود میں بیٹھی اپنی ماں کے پٹنے کا منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے ڈھیروں جگنو بھر دیے گئے ہیں۔

''تُو نے پٹھانی کو کیوں مارا ذلیل عورت۔'' ارشد علی چیخ رہا تھا۔

تب میں ماں کو پٹتے نہ دیکھ سکی...... تیزی سے آگے بڑھ کر میں نے پھونکنی ارشد علی کے ہاتھ سے لے لی۔

''چاچا...... ماسی نے تو پٹھانی کو کچھ بھی نہیں کہا۔''

''تُو چلی جا یہاں سے۔'' ارشد علی نے ایک جھٹکے سے پھونکنی میرے ہاتھ سے لے لی۔ مجھے بازو سے پکڑا اور پھاٹک سے باہر نکال کر کھٹکا لگا دیا۔ اور میں گھر واپس آتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چاچا میں تو تم کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ پٹھانی کی کلائی جو سرخ نشان ہے وہ مار کا نہیں بلکہ چند لمحے ہی اس نے ہونٹوں سے چوس چوس کر سرخ نشان بنایا ہے؟ مگر اُس نے تو میری پوچھی ہی نہ تھی۔ میں گھر آئی اور اپنی اماں کے سینے سے لگ کر رو دی۔ کتنی بدنصیب تھی پٹھانی جسے ماں کی شفقت آمیز گود اور محبت بھرا سینہ میسر نہیں تھا۔ اور میری ماں مجھ سے رونے کا سبب پوچھتی رہی۔ مگر میں کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر میں نے پٹھانی کے ہاں جانا بند کر دیا مجھے پٹھانی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب میں اس کی پھوپھو سکینہ کی اکلوتی بیٹی حمیدہ جو کہ میری ہم عمر تھی اس سے کھیلتی۔ وہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی کئی علاج کروائے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے صحن میں

کوئی اور پھول نہ مہکایا۔

ایک ہفتہ بعد ہی پٹھانی نے مجھے میرے گھر آ کر سنا لیا۔ ظاہر ہے وہ میری دوست تھی۔ اور ہم بچے ہی تھے ایسی باتیں جلد ذہن سے اتر جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی میں اُس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''پٹھانی تو اپنی ماں کو مار کیوں پڑواتی ہے؟''

''مجھے نفرت ہے زرینہ سے۔'' پٹھانی نے کہا۔

اس نے کبھی ماں کو اماں نہیں کہا تھا۔

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''بڑی ماں بتاتی ہیں کہ زرینہ کے ماں باپ بہت غریب ہیں اور دیکھو ہم لوگ تو امیر ہیں نا مجھے غریبوں سے سخت نفرت ہے۔'' اس نے اپنی خوب صورت ناک سکیڑ کر کہا۔

''یہ تو کوئی بات نہیں کہ تم صرف غربت کی وجہ سے اُن سے نفرت کرو چلو اُن سے کرتی ہو مگر ماں سے تو نہ کرو..... آخر وہ تمہاری ماں ہے۔'' میں نے سمجھایا۔

''دیکھو تاری مجھے کچھ نہ بتاؤ میری ماں سکینہ پھوپو ہے، میری بڑی اماں ہے۔ پھر زرینہ کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ بس اس نے پیدا کیا ہے اگر وہ نہ کرتی تو کہیں اور میں پیدا ہو جاتی۔'' اس نے یوں بے پروائی سے کہا جیسے کہ جنم لینا کوئی مشکل کام نہ ہو۔

''اچھا اگر تو ماں کو اماں نہیں کہنا چاہتی تو جھوٹ بول کر باپ سے مار تو نہ پٹوایا کر۔''

''مجھے مزا آتا ہے۔ جب وہ روتی ہے۔'' پٹھانی نے کہا۔ ''اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی جیسے وہ تصور میں اسی منظر سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

بھلا میں بھی جونک لگی ہے۔ میں بھی ہار کر خاموش ہو گئی۔ یونہی تین سال بیت گئے۔

پٹھانی کا ایک اور بھائی ہو گیا جو بالکل اپنی بہنوں کی طرح خوب صورت تھا۔ تب کریم خاتون پوتے کو پا کر نہال ہو گئی۔ شاہدہ جھنگ سے آئی ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی اپنی ماں اور بہن سے مختلف......

وہ شعیب کو بہت پیار کرتی۔

''بھابی اسے تو مجھے دے دے۔ امیر علی کے ساتھ کھیلا کرے گا۔'' شاہدہ نے بھتیجے کے گال چومتے ہوئے کہا۔ اس کا بھی صرف ایک بیٹا تھا۔ دس سال کا امیر علی۔

''اسے پتا نہیں کس کا ہے اور تو لینا چاہتی ہے۔'' کریم خاتون نے اسے ٹوکا۔

''کیا مطلب اماں!'' شاہدہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''دیکھ تو سہی گھر میں کسی سے ملتا بھی ہے۔''

'اماں اس کا خون تو ہم لوگوں سے ملتا ہے۔ آخر میرے بھائی کا خون ہے۔ شکل وصورت بھی من بھاولی ہے بس ذرا سانولا ہے۔'' شاہدہ ماں کی بات سمجھ کر بولی۔

''بس شاہدہ بہن تو تو بے تکی باتیں کرتی ہے چل اسے دے۔ آ میرے گھر چل۔'' سکینہ نے شاہدہ کی کلائی پکڑ کر کہا اور پھر شاہدہ نے شعیب کا منہ چوم کر اسے پنگوڑے میں ڈال دیا۔

☆☆☆

میں نے بتایا تھا نا کہ پٹھانی کی پھوپو سکینہ ایک مکان چھوڑ کر رہتی تھی اور بیچ میں جو مکان تھا وہ خدا بخش درزی کا تھا۔ خدا بخش درزی ماشکی تھا۔ جب اس کی بیوی ایک لڑکی اور لڑکا چھوڑ کر مری تو اس نے درزی کا کام شروع کر دیا گھر ہی میں اس کی دکان تھی۔ اس کی بیٹی شادو پورا گھر سنبھالتی تھی۔ جب زرینہ بیاہ کر آئی تھی تو شادو چودہ پندرہ سال کی تھی اور بھائی اس کا آٹھ سال کا تھا۔ شادو دیوار سے زرینہ سے باتیں کرتی رہتی۔ شادو کھڑی ہو کر دیوار سے جھانکتی جبکہ زرینہ اپنے گھر میں بیٹھی کام بھی کرتی رہتی اور شادو سے باتیں بھی۔ شادو دوسری دیوار سے اُس کی نند سکینہ سے بھی باتیں کرتی......اور سکینہ تو بعض مرتبہ خود ہی دیوار پر کھڑی ہو جاتی۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ زرینہ نے شادی سے کہا۔

''تیرا باپ مسجد جاتا ہے۔ تو جانے سے پہلے میرے ہاں سے بھی افطاری لیتا جایا کرے۔

شادو نے باپ سے کہا اور خدا بخش نے کہا لے کر رکھ لیا کر میں لے جایا کروں گا۔ پھر روز شادو دیوار سے افطاری لے لیتی اور خدا بخش مسجد لے جاتا۔

وہ تیرہواں روزہ تھا۔ زرینہ روزہ کھول کر بیٹھی تھی اور بچوں کے عید کے لیے کپڑے سی رہی تھی۔ ارشد علی ہمیشہ کی طرح تنتناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''الٰہی خیر'' زرینہ کے ہاتھ کپکپا گئے۔

''بتا تو ادھر دیوار پر کیوں کھڑی تھی؟'' وہ غرایا۔

ہوں تو رپورٹ پہنچ چکی ہے۔ زرینہ نے سوچا۔ ہمیشہ شادو کھڑی ہو کر اس سے پلیٹ لیا کرتی تھی۔ آج شاید وہ بھول گئی تھی اور روزہ کھلنے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ زرینہ نے خود ہی کھڑے ہو کر اُسے آواز دی اور اوپر سے اُسے پلیٹ پکڑا دی۔ تب شادو شرمندہ سی بولی۔

''آج ماسی میں بھول گئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' زرینہ مسکراتی ہوئی دیوار سے ہٹ گئی۔

''بول نا؟'' ارشد علی غرایا۔

''میں تو روز مسجد افطاری بھجواتی ہوں...... شادو کو دے دیتی ہوں اس کا باپ لے جاتا ہے۔'' زرینہ نے بے دھڑک کہا۔

''مسجد میں بھجواتی ہے یا خدا بخش کے لیے دیتی ہے۔ کتنی عورت مجھے پہلے ہی شک تھا۔ یہ شعیب بھی اس کالے بھٹ ماشکی کا ہے۔'' ارشد غلاظت بکنے لگا۔

''ارشد منہ سنبھال کے بات کرو...... خدا گواہ ہے میں نے خدا بخش کو آج تک نہیں دیکھا وہ چٹا ہے یا کالا۔'' وہ چیخ پڑی۔ اور بھلا ارشد اس تیز لہجے کا کب عادی تھا۔ کپڑے دھونے والا سوٹا زرینہ کی کمر پر برسنے لگا۔ رفیعہ اور رضیہ ماں کو چھڑا رہی تھیں ایک تو زرینہ زچگی سے دو ماہ قبل فارغ ہوئی تھی پھر روزے بھی رکھ رہی تھی۔ اتنی کمزوری تھی کہ مار برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔

اور جب زرینہ کو ہوش آیا تو رفیعہ اور رضیہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ رفیعہ ماں کے تلوے مسل رہی تھی اور رضیہ سر دبا رہی تھی۔ زرینہ نے ادھر اُدھر دیکھا مگر پٹھانی نظر نہ آئی۔ یہ ممتا کتنی بے وقوف ہوتی ہے۔ کتنی بھولی ہوتی ہے۔ پٹھانی تو اپنے غریب ننھیال کی وجہ سے ماں سے نفرت کرتی تھی۔ اور آج بھی یہ زخم اُسی نے دلوائے تھے ہمیشہ کی طرح۔ آج اس کی پھوپو سکینہ کو شادو نے بتایا تھا۔ کہ ماسی زرینہ افطاری مسجد میں بھجواتی ہے اور میرا ابا لے کر جاتا ہے۔ شادو غریب کو کیا پتا تھا کہ وہ زرینہ کی ازلی دشمن کو یہ بات بتا رہی ہے۔ پھر سکینہ نے پٹھانی کو سکھایا کہ تو اپنے باپ سے کہنا کہ زرینہ نے اپنے ہاتھ سے خدا بخش کو پلیٹ دی تھی۔ اور پٹھانی جو کچھ کہتی ارشد علی تو یوں مانتا جیسے یہ حدیث ہو۔

دوسرے دن ہی سکینہ نے اپنے آس پڑوس کی عورتوں کو یہ بات بتادی کہ میری بھابی زرینہ کے خدا بخش درزی سے تعلقات ہیں۔ اور شام تک یہ بات پوری گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ خدا بخش کو پتا چلا۔ اس نے مسجد میں جا کر قرآن اٹھا دیا۔ اور پورے گاؤں والوں کے سامنے بولا۔

''لوگو! میں نے تو اس عورت کی شکل کیا کبھی اُس کا پلو بھی نہیں دیکھا۔ ارشد علی جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی بیوی میری ماں کے برابر ہے۔ بہن کی مانند ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں کہہ سکتا۔'' سب لوگوں نے ارشد علی کو لعنت ملامت کی۔ مگر وہ ارشد علی ہی کیا جو ٹک جاتا۔ روز کے جھگڑے...... خدا بخش کا طعنہ، زرینہ کو دیتا۔ آخر خدا بخش نے دھمکی دی کہ اگر زرینہ کو میرا کسی بھی قسم کا طعنہ دیا تو میں ہتک عزت کا دعوا کر دوں گا۔ تب ارشد علی نے خاموشی اختیار کی۔

مگر شاید تو شتۂ تقدیر لکھا جا چکا تھا۔ سکینہ بھائی کو اپنے شوہر کی بہن سے شادی کرنے کے خواب دکھا رہی تھی۔

چاند رات کو زرینہ نے رفیعہ اور رضیہ کے ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ پھر کبھی وہ اپنے بچوں کے ساتھ اس طرح عید نہ منا سکے گی۔

''آ پٹھانی میں تیرے ہاتھوں پر بھی مہندی لگاؤں۔'' زرینہ مہندی کی پلیٹ لیے پٹھانی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''نا..... بڑی اماں سے لگواؤں گی میں۔'' پٹھانی ہمیشہ کی طرح منہ بنا کر بولی اور زرینہ دل مسوس کر رہ گئی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پی گئی۔

رات کو وہ بستر پر لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دل میں عجیب طرح کے درد کروٹیں لے رہے تھے۔ ارشد علی گھر پر نہیں تھا۔ نا جانے کہاں تھا۔ زرینہ نے رفیہ اور رضیہ کو اچھی طرح کمبل اوڑھا کر ان کی پیشانی چومی۔ پھر شعیب کو پیار کیا اور ڈھائی ماہ کے فاروق کو سینے سے لگا کر نا جانے کیوں رو دی۔ کمرے میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ یہ رات اسے صدیوں پر بھاری معلوم ہو رہی تھی۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔

صبح وہ اذان کے وقت اٹھی۔ ہمیشہ کی طرح نماز پڑھی قرآن پاک کی تلاوت کی اور پھر روز مرہ کے کاموں میں لگ گئی ہے۔ بچے بھی جلدی اٹھ گئے۔ سب کو نہلا دھلا کر اس نے کپڑے بدلوائے۔ پھر دودھ کی سویاں بنا کر بانٹیں بچوں کو بھی کھلائیں۔

''آ پٹھانی تو بھی کھا لے۔'' زرینہ نے پیالے میں سویاں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں نے کھالی ہیں۔ بڑی اماں نے پستے بادام ڈال کر بنائی تھیں۔'' پٹھانی نے بے پروائی سے بولی۔

''اچھا عید تو مل لے۔'' زرینہ نے اپنے سینے سے لگانے کی خواہش کو نہ دبا سکی۔

''غریبوں سے عید نہیں ملتے۔'' پٹھانی نے تیزی سے کہا اور اپنی دادی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اور زرینہ رو دی۔

یہ دن تو ایسا ہوتا ہے کہ دشمن بھی گلے لگ جاتے ہیں پٹھانی۔ تو تو میری بیٹی ہے میں نے تجھے جنم دیا ہے تیری تخلیق کا درد سہا ہے۔ یا اللہ میں نے تو کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا پھر میری ہی اولاد مجھے ماں کیوں نہیں تسلیم کرتی۔ اس کے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔

''اماں پٹھانی بہت گندی ہے۔ یہ تجھے رلاتی ہے نا۔ یہ بھی ساری زندگی روئے گی'' بارہ سالہ رضیہ نے بڑی سچے کی بات کہی اور ماں کے آنسو اپنے کرن لگے دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

''بیٹا کرن خراب ہو جائے گی۔'' زرینہ نے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''اماں تمہارے آنسوؤں سے زیادہ اچھی نہیں ہے یہ کرن۔'' رضیہ بہن کے ساتھ سہیلیوں سے ملنے چلی گئیں اور زرینہ کام میں لگ گئی۔ دوپہر کو ارشد علی گھر آیا تو وہ خلاف معمول بہت خوش تھا۔ اس سے پہلے کہ زرینہ اس سے خوشی کی وجہ پوچھتی وہ کہنے لگا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔''

''وہ تو نظر آ رہا ہے۔ ویسے بھی اس دن تو سب بہت خوش ہوتے ہیں۔ عید کا دن ہر خاص و عام کے لیے خوشیاں لاتا ہے نا؟'' زرینہ مسکرائی۔

''ہاں یہ دن میرے لیے بھی بہت خوشیاں لایا ہے۔ مسلسل عذاب سے میری جان چھوٹ جائے گی۔''

''کیسا عذاب؟'' زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

''تم عذاب مسلسل سے کم نہیں ہو..... میں تمہیں طلاق دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔'' وہ تیزی سے اس کی طرف دیکھے بغیر بولتا گیا۔

''ارشد!'' زرینہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''ہاں۔ میں تجھے طلاق دیتا ہوں اس لیے کہ مجھے تجھ پر شک ہو گیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ شک کا ناگ مجھے تا عمر ڈستا رہے۔ اس لیے میں تجھ سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔'' ارشد علی نے مسہری پر دراز ہوتے ہوئے کہا اور زرینہ تو یوں کھڑی تھی جیسے کہ اس نے کچھ سنا نہ ہو۔ اس کے تو اردگرد دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اور ان دھماکوں نے سماعت پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ وہ ٹک ٹک ارشد علی کے خوشیوں سے تمتماتے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا بے حس انسان تھا وہ.....

''ارشد...... ہمارے بچے۔'' اس کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''بچے صرف میرے ہیں اور جو تمہارا ہے اسے تم ساتھ لے جانا۔ بس اپنے ناپاک وجود سے میرے گھر کو خالی کردو...... اور اپنے گناہ کی پوٹ کو لے کر میرے گھر سے نکل جاؤ۔'' ارشد علی بستر سے کھڑا ہوگیا۔

''اگر...... شعیب میرے گناہ کی پوٹ ہے۔ تو پھر باقی چاروں بھی میرے گناہوں کا پھل ہیں۔ ہاں ارشد میں نے گناہ کیا تم جیسے ظالم بے حس انسان کو پوجا تمہاری پرستش کی۔ میں نے چاہا کہ جہاں جہاں تمہارے قدم پڑیں میں اپنے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے تمہاری راہوں میں بچھادوں۔ مگر ارشد تم نے میری محبتوں، میری پوجا میری ریاضتوں کا یہ صلہ دیا ہے۔ مجھ سے سہاگن کا لفظ چھین کر طلاقن کا ٹیکہ میرے ماتھے پر سجادیا ہے۔ میں کیا منہ لے کر اپنے ماں باپ کے ہاں جاؤں گی۔'' زرینہ رودی۔

''جس منہ سے آئی تھی۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''تب تک میرے جسم اور میری روح کے اتنے حصے نہیں ہوئے تھے۔ میں تنہا یہاں آئی تھی اور۔ اور اب تو میرا وجود ان پانچ پھولوں میں تقسیم ہوگیا ارشد۔ خدا کے لیے مجھے میرے بچوں سے علیحدہ نہ کرو۔ جس طرح روح کو جسم کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح مجھے بھی ان بچوں کی ضرورت ہے اور بچوں کو میری۔''

''تمہیں ہوگی مگر بچوں کو ضرورت نہیں ہے۔ چلی جاؤ۔'' ارشد علی نے شعیب کو اٹھا کر اس کی طرف اچھالا تب اس نے شعیب کو بازوؤں میں تھام لیا اور پھر ارشد علی نے اسے بازو سے پکڑا تقریباً گھسیٹتا ہوا گیٹ تک لایا اور پھر اس کو گلی میں دھکا دے کر آہنی گیٹ بند کردیا۔

وہ زرینہ جس کا پلو بھی محلے والوں نے نہ دیکھا تھا وہ تین سال کے شعیب کو سینے سے چمٹائے رو رہی تھی۔ آہ و بکا کررہی تھی۔ اپنے شوہر کو بچوں کو داسطہ دے رہی تھی۔ آخر سامنے دائی عطو نے اسے اپنے گھر میں لاکر بٹھادیا۔ زرینہ کے آنسو رک ہی نہ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ارشد علی وہیں آکر طلاق کے کاغذات اسے دے گیا۔

ہائے وہ بھی کیا وقت تھا۔ جب شام کو وہ شہر جارہی تھی۔ کتنا دل کیا تھا اپنے بچوں سے مل لے۔ اپنے ڈھائی ماہ کے فاروق کو آخری مرتبہ اپنی چھاتی سے دودھ پلادے۔ اپنا خونِ جگر دودھ کی شکل میں بوند بوند اس کے منہ میں ٹپکادے۔

رفیعہ، رضیہ کو بھائی کا دھیان رکھنے کی ڈھیروں نصیحتیں کرے اور۔ اور...... ہاں۔ پٹھانی سے کہے۔ بیٹا اب تو میں جارہی ہوں اماں تو کہہ دے۔

مگر جو کچھ ہمارا دل چاہتا ہے وہ ہم نہیں کرسکتے...... اور ڈوبتے سورج نے بھی دیکھا کہ آج صبح جب وہ طلوع ہوا تو ایک ماں کتنی خوش تھی زمانہ خوش تھا۔

کائنات خوش تھی۔

پنکھ پکھیرو خوش تھے۔

اور کیوں نہ ہوتے عید کا جو دن تھا۔

مگر...... ڈوبتے سے اُس نے دیکھا ایک ماں اپنی ناکام آرزوؤں کا لاشہ کاندھے پر اٹھائے تین سال کے اپنے سانولے سلونے بیٹے کو کندھے سے لگائے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان سمیٹے راجہ پور کی حدود سے نکل رہی تھی۔

☆☆☆

حیدر ابھی لیٹا ہی تھا۔ اس کی بیوی انوری اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں شگفتہ اور عائشہ اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں اور تھوڑی دیر پہلے ہی گئی تھیں۔

''حیدر سب آتے ہیں زرینہ نہیں آتی۔ عید کے دن انوری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دور بھی تو بہت ہے وہ جھیلنی۔ پھر چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اس کے۔ شگفتہ اور عائشہ تو یہیں نزدیک ہی رہتی ہیں نا؟'' حیدر نے بیوی کو سمجھایا۔

''تو مجھے بھی تو نہیں جانے دیتا۔ اس کا شعیب ہوا تھا تو وہ آئی تھی اب پورے تین سال ہوگئے

ہیں۔'' انوری روہانسی ہوگئی۔

''تجھے پتا تو ہے تیری بھابی کا رویہ کیسا ہو جاتا تھا۔ جب ہم جاتے تھے۔ بس ہمیں خوش رہنا چاہیے خدا ہماری بٹی کو سکھی رکھے۔'' حیدر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''ٹھک..... ٹھک..... ٹھک۔'' دروازہ بج اٹھا۔

''کون آ گیا؟'' حیدر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''لالٹین لیتے جاؤ۔ باہر اندھیرا ہے۔'' انوری نے کیل سے لالٹین اتار کر حیدر کو دی۔

اور جب حیدر نے دروازہ کھول کر لالٹین اونچی کر کے دروازے پر کھڑی ہوئی بیٹی کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے کہ اس کا دم نکل جائے گا سانس رک جائے گی۔ نبضیں تھم جائیں گی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

''با..... با۔'' آنے والے کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ حیدر کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ گئی اور وہ ہیولا حیدر کے سینے سے لگ کر اپنی بربادی پر آنسو بہانے لگا۔

''کیا ہوا زرینہ پتر؟'' حیدر نے بڑی مشکل سے پوچھا۔

''بابا میں لٹ گئی ہوں۔ شاید ماں باپ بیٹیوں سے اسی لیے ڈرتے ہیں۔ وہ بیٹیوں سے نہیں ان کی قسمتوں سے ڈرتے ہیں۔ ان کے مقدر کے لکھے سے ڈرتے ہیں۔ بابا ارشد نے مجھے طلاق دے دی۔ بچے چھین لیے ہیں بابا..... میرا گھر اجڑ گیا ہے۔ میرا گھر اجڑ گیا ہے۔'' اور پھر وہ حیدر کے بوڑھے بازوؤں میں جھول گئی۔

وہ جو حیدر کی پیاری اور پہلوٹھی کی بٹی تھی۔ جسے وہ راتوں کو لوریاں دیتا تھا مگر اس کے بازو نہ تھکتے تھے۔ وہی زرینہ اب بے ہوش ہو کر حیدر کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ اور پھر ایک دم سے حیدر کی کمر جھک گئی۔ کنواری بیٹیوں کے گھر نہ بسنے کا اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا سہاگن بٹی کے گھر کے اجڑنے کا دکھ والدین کو مار دیتا ہے۔ حیدر نے بہت چاہا کہ وہ ایک بار ارشد سے جا کر ملے۔ بٹی کا قصور پوچھے۔ مگر زرینہ نے اسے جانے سے منع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باپ کو بھی ارشد کے شک کا پتا چلے۔ پھر شاید اس کا باپ شعیب سے بھی پیار نہ کرے کیونکہ اسی کے سانولے رنگ کی وجہ سے تو شک کی پہلی اینٹ ارشد کے دل میں فٹ ہوئی..... اور پھر تین سال کے اندر اندر مزید اینٹیں چنی گئیں اور اب وہ پختہ عمارت بن چکی تھی جسے زرینہ کی محبت اور خدمت گزاری بھی نہ گرا سکی۔

زرینہ کی ماں انوری بٹی کا دکھ برداشت نہ کر سکی اور ہمیشہ کے لیے پرسکون ہوگئی۔

☆☆☆

زرینہ کبھی کبھی راجہ پور جاتی تب چوری چوری رفیعہ، رضیہ اس سے ملنے آتیں فاروق کو بھی لے آتیں۔ تب وہ ماستا کی ماری خود بھی روتی اور بچوں کو بھی رلاتی۔ چھ ماہ گزر گئے گھر میں اب پوری طرح پٹھانی کا راج تھا ایک روز کریم خاتون سیڑھیاں اتر رہی تھیں کہ پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ تب راشد علی نے بیوی سے کہا۔

''یہ زرینہ کی آہ تم کو لے ڈوبی ہے سکینہ کی ماں۔ اور ابھی تو پتا نہیں اس گھر پر کتنے عذاب آئیں گے۔ تمہاری کرنیوں کے بھرنے اس کو دینے پڑیں گے۔'' وہ بھی بہن سے شرمندہ تھے۔

''اُس کے کرتوت ہی ایسے تھے میں نے کیا کیا ہے؟ اولاد تک تو اُس سے نفرت کرتی ہے۔ آخر پٹھانی نے کچھ دیکھا ہوگا بھی تو ماں سے بات نہیں کرتی تھی۔'' بستر مرگ پر بھی پڑے ہوئے..... کریم خاتون جھوٹ بولنے سے باز نہ آئی۔

''یہ تو وقت بتائے گا۔'' راشد علی نے ایک آہ بھر کر کہا۔

''تم اپنی بھانجی کی طرف داری نہ کرو گے تو اور کون کرے گا؟'' کریم خاتون نخوت سے بولیں۔

''اشرف علی نے شادی کی اور وہ علیحدہ ہو گیا۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ ماں میں اپنے بچوں کی پہچان ان کی ماں سے کروانا چاہتا ہوں۔ دادی پھوپھی سے نہیں۔'' پھر وہ کبھی کبھی آتا۔ اور وہ الگ

خوش بھی بہت تھا۔ اسے اپنی بھابی زرینہ کے ساتھ اپنی ماں اور بہن کے سلوک کا علم تھا اور وہ جب بھی ارشد کو سمجھانے کی کوشش کرتا وہ فوراً کہتا میں تم سے بڑا ہوں مجھے نصیحتیں نہ کرو...... اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا ۔ اور جب بھی پٹھانی اس کے سامنے آتی اس کا دل چاہتا کہ اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دے۔ مگر وہ تو گھر بھر کی ایسی لاڈلی تھی سب سے بڑھ کر کریم خاتون کی۔ اس کو کچھ کہنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ دینے کے مترادف تھا۔ اشرف جھنجھلا کر رہ جاتا۔ اسی طرح سال بیت گیا اور وہ جو کہتے ہیں کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ ایک روز راشد علی اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ کریم خاتون بھی ان کے برابر چارپائی پر لیٹی تھیں۔ باہر بہت زبردست طوفان آیا ہوا تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ بادل برس رہے تھے اور بجلی کی کڑک بادلوں کی گرج سے دل دہلے جا رہے تھے۔ کہ اچانک بالکل اچانک ہی اتنے پکے کمرے کی چھت ان پر آ پڑی۔ اور وہ چیخ بھی نہ سکے۔ راشد علی نے یہ بڑی سی حویلی اپنی نگرانی میں بنوائی تھی اور بے حد مضبوط تھی یہ۔ کئی سالوں تک دراڑ تک پڑنے کا خطرہ نہ تھا۔ چہ جائیکہ چھت گر پڑی۔

تب بھی پورے گاؤں والوں کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ ''غریب زرینہ کی آہ اسے لے ڈوبی۔ توبہ توبہ ایسی موت کسی کو نہ آئے۔ پہلے کمر ٹوٹی۔ سال چارپائی پہ پڑی ایڑیاں رگڑتی رہی اور اب دب کر ختم۔''

جہاں دو عورتیں بیٹھتیں کریم خاتون اور زرینہ کا ذکر ضرور ہوتا۔ ہر ایک کی ہمدردیاں زرینہ کی طرف ہوتیں۔ مرنے کے بعد بھی۔ کریم خاتون کو بُرے الفاظ میں یاد کیا جا رہا تھا۔ زرینہ اپنی بیٹیوں سے ملنے آتی تو ان کو ڈھیروں نصیحتیں کرتی۔ پٹھانی کا خیال رکھنے کا کہتی۔ ماں بیٹیاں ایک دوسرے کو اتنا پیار کرتیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے۔ رفیعہ، رضیہ، شعیب سے لپٹ لپٹ جاتیں۔

اور پھر ایک روز پٹھانی کو پتا چل گیا۔ اس نے پہلے تو دونوں بہنوں اور فاروق کو خوب مارا اور پھر ارشد علی سے بھی مار پڑوا دی۔ اور اس دن سے بہنوں کو پٹھانی سے شدید نفرت ہو گئی۔ پٹھانی اُن کی بہن کیا تھی یوں لگتا تھا خدائی فوجدار ہو...... یا خدانخواستہ سوتیلی ماں ہو۔ زرینہ شہر میں سلائی کڑھائی کر کے اپنا گزرا کرتی اور پھر کچھ اس کا باپ بھی لے آتا تھا۔ مگر ماں کی عادتیں۔ ہائے کیسی ہوتی ہیں۔ وہ ذرا ذرا سی چیزیں سنبھال کر رکھتی۔ اپنی بیٹیوں کے لیے۔ جب وہ ملتیں تو اپنی محبت کے ساتھ ساتھ وہ انھیں چھوٹے چھوٹے تحائف بھی دیتی۔ شعیب کو اس نے مل کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ وہ اسکول چلا جاتا اور پیچھے وہ اپنے کام میں لگ جاتی۔

☆☆☆

پھر سب نے سنا کہ سکینہ اپنی نند سے ارشد علی کی شادی کروا رہی ہے مگر انھوں نے بدلے میں پٹھانی کا رشتہ سکینہ کے دیور کے لیے مانگا تھا۔ ارشد علی نے حامی بھر لی اور جب زرینہ کو پتا چلا تو اس کا کلیجہ شق ہو گیا۔ کچھ بھی تھا بیٹی تو تھی وہ۔ اور سکینہ کا دیور ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اول درجے کا نشے باز اور جواری پہلی بیوی مر چکی تھی۔ پھول جیسی پٹھانی تو بالکل اس کے قابل نہ تھی۔ سکینہ بہت خوش تھی۔

تب پٹھانی نے پہلی بار اپنے ذہن سے سوچا۔ وہ ہمیشہ پھوپھی اور دادی کے ذہنوں سے سوچتی اور بولنے کے لیے اپنی زبان استعمال کرتی۔ آج پہلی بار اس نے خود سوچا۔ تو ایک لفظ اس کے ذہن میں آیا۔

''پھوپھی۔ پھوپھی ہی ہوتی ہے وہ ماں نہیں بن سکتی۔'' شاید زندگی میں پہلی بار اسے افسوس ہوا تھا۔ مگر وہ اتنی گہری تھی کہ اس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے اس بات کا افسوس ہے۔

زرینہ ہمارے ہاں آئی تو وہ سخت پریشان تھی۔ پٹھانی کی نسبت طے ہونے کا سن کر۔

''طاہرہ...... تو اُسے سمجھا یہ ادلے بدلے کی شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں...... وہ باپ کے بدلے میں شادی نہ کرے ارشد تو اس کی بات مانتا ہی ہے۔'' زرینہ رو دی۔

''ماسی تجھے پٹھانی سے محبت ہے ابھی بھی۔''

''پگلی ہے تو تو...... آخر وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے اُسے دودھ کی صورت میں اپنا خونِ جگر پلایا ہے تو کیا مجھے اس سے محبت نہ ہوگی۔ جب تم ماں بنو گی تو پتا چلے گا کہ ممتا کیا ہے اولاد کیا ہے؟''

''مگر وہ تو......؟''

''وہ خود نہیں ایسا کرتی اسے سکھایا جاتا تھا۔ اسے مجھ سے نفرت کرنا سکھایا گیا اُسے میں نے ایسا تو پیدا نہیں کیا تھا۔''

''مگر اب تو اس کی دادی مر چکی ہے وہ اب بھی تم سے نفرت کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بچپن کی عادتیں بہت پختہ ہوتی ہیں۔ نقش بہت دیرپا ہوتے ہیں جو کبھی نہیں مٹتے۔ میری طرف سے جو نفرت انھوں نے اس کے دل و دماغ میں بٹھادی ہے۔ اُسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ ہاں اُسے یہ نہ بتانا کہ میں نے منع کروایا ہی۔ وہ بہت ضدی ہے مجھے ہمیشہ نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ وہ ضد میں اپنی زندگی تباہ کرلے گی۔'' ماسی زرینہ نے کہا۔

تب میں نے سوچا واقعی ماں ایک ایسی مشعل ہے جو کہ ہمیشہ سیدھے راستے پر ہی روشن رہتی ہے۔ عقلمند اُس روشنی میں اپنی صحیح منزل کا تعین کرلیتے ہیں اور بے عقل بھٹک جاتے ہیں۔

پھر میں پٹھانی سے ملی اور اُس سے کہا کہ وہ حنیف سے شادی سے انکار کردے۔ میری بات سن کر اس نے ایک طویل سانس لی اور بولی۔

''طاہرہ میرے باپ کا گھر نہ بس سکے گا۔ اس گھر میں ذمے دار عورت نہ آسکے گی۔''

''پھر تو سوچ یہ تو تیرے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں اور وہ بڈھا بالکل تیرے قابل نہیں دوسرے وہ لوگ غریب ہیں۔ سب کچھ وہ جوئے میں ہار چکا ہے۔ اور تجھے تو غریبوں سے نفرت ہے۔'' میں نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''یہ...... یہ تو تُو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے غریبوں سے سخت نفرت ہے۔ مگر سکینہ اماں نے تو مجھے یہ سب کچھ نہیں بتایا۔'' پٹھانی تعجب سے بولی۔

''وہ پھوپو ہے ماں نہیں جو تجھے سچ بتادیتی بگلی۔'' میں نے کہا۔ موم پگھل رہا تھا۔

''بس تو ٹھیک ہے میں بابا سے کہوں گی کہ وہ شادی کرلیں مگر میں ڈیڑھ دو سال بعد شادی کروں گی۔'' پٹھانی نے کہا اور میں خوشی سے لپٹ گئی۔ میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ حالانکہ مجھے نہیں علم تھا کہ واقعی حنیف غریب ہے۔ اور پٹھانی کی غریبوں سے ازلی نفرت کو جانتی تھی اس لیے میں نے یہ جھوٹ بولا تھا اور دوسروں کی باتوں پر عمل کرنے والی پٹھانی کے دل سے اب یہ بات کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔

پھر اس نے ارشد علی سے فاروق کے چھوٹے ہونے کا بہانہ کرکے اپنی شادی ملتوی کروادی اور ارشد علی تو بیٹی کی بات بے چوں چراں مان لیتے تھے۔ یوں ایک ماہ بعد ہی حنیفہ ان کی ماں بن کر آگئی۔

وہ ماں جسے معاشرہ سوتیلی ماں کہتا ہے۔

مگر حنیفہ بھلا زرینہ کی جگہ لے سکتی تھی؟ بس پٹھانی تھی جس کا پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ حنیفہ کے آنے سے خوش ہے یا ناخوش۔ جبکہ رفیعہ اور رضیہ نے تو حنیفہ کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ انھیں ماں بالکل پسند نہیں آئی۔

ارشد علی نے گھونگٹ اُلٹتے ہی حنیفہ سے کہہ دیا تھا۔

''تم صرف میرے بچوں کی پرورش کے لیے یہاں لائی گئی ہو۔ اگر کسی دن تمہاری وجہ سے میرے بچوں کو کوئی تکلیف ہوئی تو وہ دن اس گھر میں تمہارا آخری دن ہوگا۔''

اور پہلے ہی روز کے اس جملے نے حنیفہ کی زبان بند کردی تھی۔ وہ بہت گم صم رہتی۔ پورے گھر پر پٹھانی کا راج تھا۔ گھر کی چابیاں پٹھانی کے پاس رہتیں۔ پٹھانی کٹورے سے چاپ کر آٹا نکال کر حنیفہ کو گوندھنے کو دیتی۔ گھر کی صفائی اپنی نگرانی میں کرواتی۔ اور حنیفہ چپ چاپ اس کی تلخ و ترش باتیں سنتی۔ حنیفہ نے تو ارشد علی سے اس لیے شادی کی تھی تاکہ اس کے لنڈورے بھائی کا گھر بس جائے۔ مگر اسے بھائی کا گھر بستا مشکل نظر آرہا تھا۔ حنیفہ بہن

سے ملنے آتا رہتا تھا۔ پٹھانی اسے پسند بھی بہت آئی تھی نازک سی پچی کچنار کی مانند سرخ وسپید پٹھانی۔ جوانی بھی اس پر ٹوٹ کر آئی تھی جسم تو ناگ کی طرح بل کھاتا تھا۔ پتلی کمر پر نہیں بالوں کی وہ سنہری ناگن آدمی کے سینے سے لپٹ جاتی۔

مگر بہن کے ساتھ پٹھانی کا سلوک دیکھ کر وہ پریشان ہوجاتا۔ وہ نشئی آدمی تھا اور نشے باز عموماً بزدل ہوتے ہیں۔ اس نے پٹھانی کی تیزی دیکھتے ہوئے شادی سے انکار کردیا۔

تب ارشد علی غصے سے دیوانہ ہوگیا اس نے کھڑے کھڑے حنیفہ کو طلاق دے دی اور حنیفہ صرف سات ماہ بعد پھر ماں باپ کے سینے پر مونگ دلنے کو میکے جا بیٹھی۔ مگر حنیفہ بہت خوش تھی اسے اس قفس سے تو رہائی ملی تھی جس کا قفل پٹھانی لگا دیتی تھی اور وہ اندر بے بس پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتی۔

☆☆☆

پھر وقت اپنی مخصوص رفتار سے چل پڑا۔ زرینہ اب بھی گاؤں آتی تھی اور بچے اس سے ملا کرتے مگر وہ بے مروت پٹھانی کبھی ماں سے نا ملی۔ ایک بار میں نے کہا۔

''پٹھانی..... تو کیوں ماں کا دل دکھاتی ہے ایک بار صرف ایک بار اس سے مل لے۔''

''مجھے اس سے نفرت ہے۔'' اس کے چہرے پر تختی آجاتی۔

''مجھے خود پتا نہیں کہ میں اس سے کیوں نفرت کرتی ہوں۔ اور جب سے میں نے خدا بخش درزی کا قصہ سنا ہے مجھے اس سے اور بھی نفرت ہوگئی ہے۔''

''وہ جھوٹ تھا۔ خدا بخش نے قرآن اٹھا دیا تھا۔ کہ تمہاری ماں اس کی بہن ہے۔

وہ جھوٹ تھا۔ تو پھر شعیب ہماری طرح۔''

''پٹھا..... نی.....'' میں یا کیا زرینہ پر اتنا بڑا الزام نہ سن سکی اور میرا ہاتھ پٹھانی کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ تم اتنی ذلیل بھی ہوگی۔ پٹھانی کوئی بیٹی تجھ جیسی کمینی نہیں ہوگی۔''

''بڑی اماں کہتی تھیں.....'' پٹھانی نے کہنا چاہا۔

''اور اُن کی موت دیکھی ہے۔ سال بھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری ہے۔ چھت گر گئی تو اسے جب نکالا گیا اس کے جسم کا ایک ایک حصہ علیحدہ تھا۔ غسل تک تو نصیب نہ ہوا۔ جبکہ تمہارے دادا کی لاش بالکل صحیح سالم تھی۔ اپنی عاقبت سنوار پٹھانی۔'' میں نے اُسے سمجھایا۔

''میں کیا کروں میرے ذہن سے یہ بات نہیں نکلتی مجھے زرینہ سے نفرت ہے۔'' پٹھانی ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''پٹھانی ماں کا دل دکھانے والے کی بخشش نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اسلامیات کا سبق نہ پڑھا۔'' وہ چڑ کر بولی جب اُس سے کوئی بات نہ بنتی تھی وہ چڑ جایا کرتی تھی۔

اُسے سمجھانا پتھر سے سر ٹکرانے کے مترادف تھا۔ اس سے ٹکرانے والا خود ہی لہولہان ہوجاتا تھا۔ میں بددل ہوکر گھر آگئی۔

☆☆☆

لمحے اور آگے سرک آئے۔

پھر اچانک ہی میرے سہرے کے پھول کھل اٹھے۔ ہاں اسے میں اچانک ہی کہوں گی۔ بات کچھ یوں ہے کہ چوہدری مشتاق بھٹی کی شادی تھی۔ زبیدہ میری بہت اچھی سہیلی تھی اور اس کی شادی کے کاموں میں پیش پیش تھی۔ مشتاق بھٹی کے دوست کا بیٹا زبیر جو آرمی میں کیپٹن تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور نا معلوم اُسے مجھ میں کیا نظر آیا کہ شادی سے واپس جانے کے بعد فوراً ہی تقریباً ایک ہفتہ بعد ہی زبیر کے والدین اور بہنیں میرا رشتہ لے کر آگئے۔ میرے غریب والدین کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ان کی بیٹی کا تو نصیب کھل گیا تھا۔ انہیں تو امید ہی نہ تھی کہ ان کی بیٹی کو اتنا اچھا رشتہ ملے گا۔

چوہدری مشتاق کی وجہ سے رشتہ جلد طے ہوگیا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔ اور مجھے تو خود اپنی شادی کا یقین نہ تھا۔ اور جس روز میں دلہن بنی میرا نکاح ہوا۔ ہاتھوں میں سہاگ کی مہندی رچی تب مجھے

یقین آیا۔
زبیر شادی کے بعد مجھے لے کر شہر آ گئے۔ چھاؤنی میں انھیں بہت خوب صورت بنگلہ ملا ہوا تھا۔ میں دیہاتی لڑکی۔ نئی نئی چیزیں دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ تو زبیر مجھے بہت محبت سے سمجھاتے۔ ہر چیز کے استعمال کے بارے میں اس طرح سمجھاتے جیسے کسی بچے کو سمجھا رہے ہوں۔ انھوں نے مجھے پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا اور میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ ہر ہفتے ہم جیپ پر راجہ پور جاتے۔ اماں ابا سے ملنے۔ میرے والدین ہمیشہ میرا نصیبہ اچھا ہونے کی دعائیں کرتے۔

میری شادی کو چار ماہ ہو گئے تھے۔ میں اماں کے ہاں رہنے آئی ہوئی تھی۔ زبیر ان دنوں کوہاٹ گئے ہوئے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو مجھے کبھی تنہا ''راجہ پور'' نہ رہنے دیتے اور بھلا مجھے بھی کہاں چین آتا تھا ان کے بغیر۔ اب تو مجبوری تھی۔

ہم لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ جہاں ہماری برسوں کی یادیں بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ کسی اجنبی کے ساتھ چند ماہ گزارنے کے بعد وہ جگہیں ہمیں اچھی نہیں لگتیں۔ دل اداس سا رہتا ہے۔ اصل میں بیگانے جو اپنے بن جاتے ہیں۔ اگر یہ قانون قدرت نہ ہو تو ہم اپنوں کو یاد کرتے کرتے مر جائیں پھر مجھے پتا چلا کہ پٹھانی کا باپ تیسری شادی کر رہا ہے۔ پٹھانی کے بدلے میں۔ پھر پورے گاؤں میں ارشد علی کی شادی کے چرچے تھے۔ آخر ایک روز صبح کو پٹھانی بیاہ کر لیے گئی اور شام کو لیہ سے ارشد علی، بخت بی بی کو بیاہ کر لے آیا۔

تیسرے روز پٹھانی واپس آ ئی۔ اور اس نے شور مچا دیا کہ وہ واپس لیہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ اس کا شوہر خوب صورت بھی تھا اور امیر بھی مگر وہ توتلا تھا۔

ارشد علی نے کہہ دیا کہ میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے تم بھی اپنی بیٹی اپنے پاس رکھو۔ اور اس طرح دو روز کی بیاہی دلہنیں واپس میکے کی دہلیز پر آ گئیں۔ دو گھر اجڑ گئے۔

''اگر وہ توتلا تھا تو کیا تھا پٹھانی۔ تیرا نجوگ تو اس کے ساتھ ہو گیا تھا۔ خدا کو یہی منظور تھا۔'' ہنگامہ ٹھنڈا ہونے پر میں نے پٹھانی سے کہا۔

''بات یہ نہیں طاہرہ۔ میں خود کو ذہنی طور پر اس کے توتلے پن کے لیے قبول نہ کر سکی تھی اگر وہ ایک دو روز ٹھہر جاتا تو کیا تھا۔ میں نے اُسے منع کیا ڈانٹا بھی کہ میرے قریب نہ آئے۔ مگر اس نے مجھ سے زبردستی کی۔ وہ توتلا تو تھا مگر اس میں بہت طاقت تھی۔ شاید وہ اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے زبردستی کی۔''

پٹھانی رو دی۔ پتھر میں سے بھی پانی پھوٹ پڑا تھا۔

''یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ تو نے فسانہ بنا دیا۔ آخر تو اس کی قانونی بیوی تھی۔''

میں دل ہی دل میں خوش تھی کہ ایک جاٹ نے اس کا غرور چکنا چور کر دیا تھا۔

''لیکن اسے بھی تو سوچنا چاہیے تھا نا؟'' پٹھانی نے کہا۔

''تم ہمیشہ اپنی بات اوپر رکھتی ہو۔ تم تو وہ بید کی چھڑی ہو جس میں جتنی بھی لچک پیدا کی جائے وہ پھر سیدھی ہو جاتی ہے۔ جھکنے میں بہت عظمت ہے پٹھانی۔'' میں نے اُسے سمجھایا۔

''چھوڑ پرے بس میرا دل نہیں چاہتا کہ میں یہاں سے جاؤں۔'' اس نے ہنستے ہوئے بات ختم کر دی مگر مجھے اس کی ہنسی میں سینکڑوں آنسوؤں کی آمیزش محسوس ہوئی میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پٹھانی نے جلدی سے سر جھکا لیا۔ شاید وہ اپنے آنسو مجھ سے چھپانا چاہتی تھی۔ یہاں بھی وہ اپنی بہادری کا لوہا منوانا چاہتی تھی۔

گھر آئی تو زبیر آئے ہوئے تھے۔ میرا دل مارے خوشی کے دھڑک اٹھا۔ جن کے آنے کی امید نہ ہو وہ لوگ اچانک آ جائیں تو کس قدر خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس کو میں الفاظ میں نہیں بیان کر سکتی۔ زبیر مجھے لپٹاتے ہوئے بولے۔

''چاچی نے بتایا تھا کہ تم اپنی سہیلی کے پاس گئی ہو جس کی دو روز قبل شادی ہوئی ہے۔''

"ہاں۔ میں، میں معافی چاہتی ہوں آپ سے نہ پوچھا۔" میں نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

"یوں تو معافی نہیں ملے گی۔" زبیر جھک کر بولے۔

"کیا مطلب؟" میں نے جلدی سے سر اٹھایا اور پھر زبیر کی آنکھوں میں انجانے فتنے دیکھ کر جلدی سے سر جھکا لیا اور زبیر نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر میرے لبوں کا رس چوس لیا۔

پھر شام کو ہم واپس چھاچھی آ گئے۔

☆☆☆

یونہی کچھ دن اور آگے بڑھے۔ ہمارے ہاں نئے آنے والے مہمان کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زبیر بہت خوش تھے وہ مجھے کوئی کام نہ کرنے دیتے۔ صبح اتنے پریم سے مجھے جگاتے کہ میں شرمندہ ہو جاتی۔

پہلا کیس تھا ہمارے ہاں رواج ہے کہ پہلا بچہ ننھیال میں پیدا ہوتا ہے۔ آخر زبیر مجھے گاؤں چھوڑ گئے۔ ہر دوسرے روز چکر لگا جاتے۔ اماں میرا بہت خیال رکھتیں میں پٹھانی سے ملنے گئی تو یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ بھی ماں بننے والی ہے۔

"ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں پٹھانی اور اب تم چاہتی ہو کہ اب بھی ساتھ ہی رہیں۔ ایک ساتھ ہی ہمیں ماں کا عظیم رتبہ عطا ہو۔" میں نے کہا تو پٹھانی شرما گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی سرخی نے مجھے بتایا کہ وہ بہت خوش ہے۔

رفیعہ اور رضیہ بھی پٹھانی کی بہت دیکھ بھال کرتیں۔ شاید ماں نے انہیں سمجھایا تھا۔ کیونکہ وہ اب بھی زرینہ سے ملتی تھیں مگر پٹھانی ایسی ضدی تھی کہ کبھی ماں سے نہ ملی تھی۔ پتا نہیں کیسی لڑکی تھی پورے آٹھ برس ہو گئے تھے ان کی ماں کو طلاق ہوئے۔ مگر ان آٹھ سالوں میں کوئی ایسا لمحہ نہ آیا تھا جب اس نے اپنی ماں کو یاد کیا ہو...... پتا نہیں کیسی نفرت تھی جو کہ اس کے دل سے ختم نہ ہوئی تھی۔ اب تو وہ نفرت کا بیج تناور درخت بن گیا تھا۔

"کیسا پتھر دل تھا اس کا جو موم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ اس کے جسم میں دل نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

ایک روز جس مہمان کا انتظار تھا وہ بھی آ گیا بیٹا پا کر میں اور زبیر بہت خوش تھے۔ اماں ابا نے بھی خوب خوشی منائی تھی۔ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب لڑکا پیدا ہو تو سرخ، سبز، پیلے رنگ گھول کر کپڑوں میں پھینکے جاتے ہیں یہ خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ زبیر کو تو رنگوں میں نہلا دیا گیا تھا۔ اور وہ بہت خوش تھے۔ میرا ماتھا چوم کر بولے۔

"تاری جان اگر شہر میں یہ پیدا ہوتا تب بھلا اتنی خوشیاں مناتے۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ہمارا دوسرا بچہ بھی یہیں ہوگا۔"

"ابھی ایک خوشیاں تو پوری ہو جائیں۔" میں جھینپ گئی۔ اور زبیر ہنس دیے۔

صرف پانچ روز بعد پٹھانی نے بھی ایک بیٹے کو جنم دیا۔ خوب صورت پٹھانی کا بدصورت بیٹا۔

جس کا رنگ سیاہ تھا۔

اماں نے مجھے بتایا اور میرا کتنا دل چاہا تھا کہ میں پٹھانی کو دیکھوں اس کے بچے کو دیکھوں مگر ایک تو ہم دیہاتیوں میں بہت رکھ رکھاؤ ہے۔ دو زچہ عورتیں ایک دوسرے سے چھلے تک نہیں ملتیں۔ حالانکہ شہر میں، میں نے دیکھا تھا۔ میں دل مسوس کر رہ گئی۔

اس روز زرینہ ماسی ہمارے ہاں آئی تھی۔ میرے بیٹے کے لیے کھلونے اور کپڑے لائی تھی اور اسی طرح کی چیزیں وہ پٹھانی کے بیٹے کے لیے لائی تھی۔

"یہ تو اپنی طرف سے دینا اسے طاہرہ!" زرینہ ماسی نے کہا۔

"ہاں میں جب بھی جاؤں گی اسے دے دوں گی۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"میرے نواسے کو میری طرف سے بھی خوب پیار کرنا۔" ماسی زرینہ رو دیں اور ان کے آنسوؤں نے میرے دل میں کئی زخموں کا اضافہ کر دیا۔

میں نے چھلہ نہایا اور پٹھانی کے ہاں جانا چاہتی تھی مگر اماں نے مجھے منع کر دیا جب تک وہ چھلہ نہ نہائے تم نہ جاؤں یوں پانچ روز مجھے اور انتظار کرنا

پڑا۔

میں اس سے ملنے کو بہت بے چین تھی بھلا ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے اُس سے اتنے دن کی دوری کبھی نہیں ہوئی تھی۔

میں بے تابانہ پٹھانی کے ہاں گئی۔ وہ گود میں بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ ارشد علی کمرے میں ٹہل رہے تھے جیسے کہ کسی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا رہے ہوں۔

''سلام چاچا۔'' میں نے کہا۔ تب انھوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''وعلیکم سلام طاہرہ بیٹی۔ بیٹا مبارک ہو۔'' انھوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا مگر ان کی آنکھوں میں چمک پیدا نہ ہو سکی ان کی آنکھیں ان کے ہونٹوں کا ساتھ نہ دے سکیں۔

''آپ کو بھی مبارک ہو چاچا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے پٹھانی کی طرف بڑھ گئی۔ پٹھانی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں حیران رہ گئی۔

ان کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے لہرا رہے تھے۔ آنکھوں میں شبنم تیر رہی تھی۔ وہ سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خاصی دیر روتی رہی ہو۔

''پٹھا......نی۔'' میں حیران و ششدر رہ گئی۔ میرا اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اس نے بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔ ارشد علی باہر چلے گئے۔

''پٹھانی ہوا کیا؟'' میں نے اُسے اپنے آپ سے لپٹا لیا۔ ''خدا نے اتنا پیارا بیٹا دیا ہے تم خوش نہیں ہو۔''

''تاری...... وہ الو کا پٹھا تو تلا کہتا ہے یہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ تو بتا تاری۔ کبھی میں نے کسی غیر آدمی کو دیکھا۔ یہاں پر تو سب تیلی، کمہار، ترکھان رہتے ہیں اور مجھے ان سے نفرت ہے۔ تمھیں علم ہے کہ مجھے غریبوں سے نفرت ہے۔''

''تو وہ آئے تھے؟''

''ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے گئے ہیں۔'' پھر پٹھانی نے بتایا کہ انھوں نے کہلوا بھیجا تھا کہ لڑکا ہوا ہے آ کر دیکھ جائیں تو وہ سب آج آئے۔ اور انور یعنی پٹھانی کے شوہر نے کسی کا لحاظ بھی نہ کیا اور سب کے سامنے بچے کو دیکھتے ہی بولا۔

''بتا پٹھانی یہ کس کا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' پٹھانی نے حیرت سے کہا۔

''تو اتنی بچی نہیں ہے۔ تو بھی خوب صورت ہے اور میں بھی برا نہیں پھر یہ کالا کس پر گیا ہے تیرے گھر میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے۔'' انور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''منہ سنبھال کر بات کرو انور۔'' ارشد علی گرجے۔

''سچ سننے کا آپ میں حوصلہ نہیں ہے۔ ارشد علی صاحب! اور میں سچ بول رہا ہوں۔ میری بہن نے بھی یہاں دو راتیں بسر کی تھیں۔ مگر اس کے تو اولاد نہیں ہوئی۔ اور تمہاری بیٹی مجھ سے میرا خون بھی لے آئی میرا نیا روپ۔ میں مان بھی جاتا مگر اس کی شکل وصورت تو ہم میں سے کسی سے نہیں ملتی۔'' انور نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے بدنامی سے بچنے کے لیے اسے میرے سر منڈھ دیا۔''

''تو...... ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جا۔ چلے جاؤ۔ تم سب چلے جاؤ۔'' ارشد علی ہذیانی انداز میں چلاتے۔

''سچ سننے کا حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔'' انور نے کہا اور پھر وہ لوگ چلے گئے۔

یا خدا یوں اپنی کرنیاں سامنے آتی ہیں۔ کیا واقعی یہ سچ ہے کہ اپنے اعمالوں کا کچھ بدلہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ ارشد علی نے اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

ایک روز انھوں نے بھی تو بالکل اسی طرح زرینہ سے شعیب علی کے متعلق پوچھا تھا۔ جیسے انور پٹھانی سے پوچھ رہا تھا۔

''بتا یہ کس کا ہے؟''

ارشد علی کی جگہ انور نے لے لی تھی۔

زرینہ کی جگہ پٹھانی تھی۔

وہی ازلی شکی، تنگ نظر اور ظالم مرد تھا۔

اور...... ہمیشہ کی طرح ایک مظلوم عورت تھی جو

اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکی۔

یہی حال اب اس کی بیٹی کا بھی تھا۔

ارشد علی کو بڑی شدت سے زرینہ یاد آ رہی تھی۔ جو کہ اس کی پہلی محبت تھی۔ جس کے ساتھ گزرے دنوں کے خواب اب بھی اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے بن کر تیرتے رہتے جو اس کے بچوں کی ماں تھی۔

اور...... جس نے راشد علی کے سامنے کبھی زبان نہ کھولی تھی۔

اس کے ہر ظلم کو چپ کر کے سہا۔ مگر اُف نہ کی۔

شک کا ظالم ناگ جب ارشد علی کے دل میں کھلبلی مچاتا تو وہ بے دریغ زرینہ کو مارتا تھا۔ وہ تو بس پٹھانی کی باتیں سنتا تھا۔ اور ماں بھی پٹھانی کی باتوں کی حمایت کرتی نکڑے لگاتی رہتی۔ اور پھر وہ زرینہ پر پل پڑتا۔ اس سے کچھ نہ پوچھتا۔

اور جب سے وہ اس گھر سے گئی تھی۔ جیسے خوشیاں ہی روٹھ گئی تھیں۔

پتا ہی نہیں تھا کہ خوشی کس چڑیا کا نام ہے۔ دکھوں نے گھر دیکھ لیا تھا۔ اور، اور ارشد علی کا سکون چھن چکا تھا۔ اس نے سکون حاصل کرنے کے لیے دوبارہ گھر بسایا تھا۔ مگر دونوں بار ہی پٹھانی کی وجہ سے اس کا گھر اجڑا تھا۔

وہ بھی تو کسی کی بیٹی تھی جسے میں نے بے عزت کیا تھا اور خدا کہتا ہے کہ اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو۔

آج میری بیٹی کو بھی انور نے بے عزت کر دیا ہے کیا رہ گیا ہے میرے پاس...... کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

پٹھانی رو رہی تھی۔ اس الزام پر، اس چر کے پر جو کہ انور اس کے سینے پر لگا کر گیا تھا۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ میں بھی۔ پٹھانی کے سینے پر ایک چر کا لگاؤں۔ اس سے کہوں پٹھانی تجھے اپنی ماں پر شک تھا۔ شعیب کو تو اپنا بھائی نہیں مانتی۔ یہ خدا نے تجھے بدلہ دیا ہے۔ بعض مرتبہ وہ بد صورت لوگوں کی خوب صورت تخلیقات بناتا ہے۔ اور بعض مرتبہ وہ خوب صورت لوگوں کے لیے مسلسل عذاب کے لیے بدصورت بچے بھیج دیتا ہے۔ آخر وہ بے نیاز جو ہوا۔ وہ دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ وہ کیا نہیں کر سکتا۔

عزت، ذلت سب اس کے ہاتھ میں ہے پٹھانی۔

وہی ذلت جو کبھی تیرے باپ نے اور دادی نے تیری ماں کو دی تھی خدا نے وہی اب تیرے حصے میں لکھ دی ہے۔ اس نے بتا دیا ہے ارشد علی کہ اگر زرینہ بدکار تھی تو پھر پٹھانی بھی بدکردار ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ تو سب کچھ ہم جیسے شاکی لوگوں کے امتحانات کے لیے کرتا ہے۔ کہ کون ثابت قدم ہے۔ اور کون دین سے بے راہ رو ہے۔ میں یہ سب کچھ سوچ کر رہ گئی۔ مگر اس سے کہہ نہ سکی۔ میں اپنی سکھی کو مزید دکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ میں سوائے اُسے تسلی دینے کے اور کر ہی کیا سکتی تھی اس نے خود ہی تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اور ظاہر ہے زخم ہوا تھا تو تکلیف بھی ہوئی تھی۔ رونے سے خوشیاں تو نہیں ملتیں نا؟

☆☆☆

یونہی کئی سال بیت گئے۔ وقت بہت آگے نکل آیا۔ زبیر کیپٹن سے میجر بن گئے تھے اور ہم لوگ پشاور میں مقیم تھے میرے چمن میں دو پھول اور ایک کلی کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جن کی خوشبو سے میں مدہوش رہتی۔ بچے بھی مجھے بہت چاہتے تھے۔ اب بھی ذہن کے پردوں سے پٹھانی ضرور ٹکراتی تھی۔ اور میں پریشان ہو جاتی اس کا دکھ مجھے اپنے سینے میں محسوس ہوتا۔ میری شادی کے صرف دو سال بعد اماں ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر میرا گاؤں جانا بھی کم ہو گیا میکہ تو ماؤں کے دم سے ہوتا ہے مگر گاؤں کی میرے پاس بھی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔

پٹھانی کی دونوں بہنوں رفیعہ اور رضیہ کی بھی شادیاں ہو گئی تھیں۔ رفیعہ کو اس کی پھوپھو شاہدہ نے اپنے بیٹے امیر علی کی دلہن بنا لیا تھا اور رضیہ گاؤں ہی میں بیاہی گئی تھی۔ سنا تھا کہ زرینہ اور شعیب، شاہدہ کے ہاں جاتے تھے وہیں رفیعہ سے ملتے۔ اور پھر وہیں رضیہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ ماں سے ملنے

آ جاتی۔ چار پانچ روز ماں بیٹیاں اکٹھے گزارتیں اور وہ دن ان کی زندگی کا حاصل ہوتے ..... پھر ملنے کی آس میں بچھڑ جاتیں۔

ارشد علی کو پتا چلا تھا کہ زرینہ اس کی بہن کے ہاں جا کر لڑکیوں سے ملتی ہے۔ اس نے بہن سے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

''دیکھو ارشد، زرینہ بے قصور تھی تم نے اس سے زیادتی کی ہے۔ اور میں بھی ماں ہوں ممتا کی تڑپ کو محسوس کر سکتی ہوں۔ وہ تمہارے ہاں تو جا کر لڑکیوں سے نہیں ملتی نا؟'' شاہدہ نے نہایت متانت سے کہا۔

''مگر وہ میری بیٹیوں سے نہ ملے۔'' ارشد علی ہمیشہ اپنی بات منواتے تھے۔

''اگر تم اپنی میری کا سوال رکھتے ہو تو کان کھول کر سن لو وہ اب میری بہو ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ امیر علی کا گھر ہے۔ اور ہم جیسا چاہیں گے وہی ہوگا۔'' شاہدہ نے بپھر کر کہا تو ارشد علی خاموش ہو گئے۔ ڈر گئے کہ کہیں دوسری بیٹی کا بھی گھر نہ اجڑ جائے۔

سکینہ نے بھی اپنی بیٹی حمیدہ کی شادی کی۔ لڑکا گاؤں میں ایک ڈاکٹر کی دکان پر کمپوڈر تھا۔ اور شہر سے ڈاکٹر کے ساتھ ہی آیا تھا بہت خوب صورت تھا۔ حمیدہ دوا ایک بار ڈاکٹر کو دکھانے گئی تو کمپوڈر نواز سے دوائی لیتے ہوئے انگلیوں کا ایسا ٹکراؤ ہوا کہ دل بھی آپس میں ٹکرا گئے۔ پھر حمیدہ روز کی مریضہ رہنے لگی۔ ڈاکٹر کی دکان پر جانے کے لیے نت نئی بیماری گھڑ لیتی کبھی پیٹ میں درد ہے، تو کبھی سر پھٹا جا رہا ہے۔ کبھی پسلیاں چل رہی ہیں۔ محبتیں بڑھیں اور آخر نواز ایک روز ان کے گھر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا ہے کوئی آگے پیچھے نہیں۔ گھر داماد بننے پر راضی تھا۔ یوں چند روز بعد ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔

سہاگ رات گزری جب صبح حمیدہ کی آنکھ کھلی تو نواز چارپائی پر نہیں تھا۔ اس نے سوچا شاید باہر گیا ہوگا۔ دوپہر ہو گئی مگر وہ نہ آیا۔ لڑکیاں اسے دلہن بنانے کے لیے کمرے میں آ گئیں۔ انھوں نے اسے تیار کیا۔

''زیور کہاں ہے تیرا؟''

''یہیں میز پر پرس رکھا ہے اسی میں ہوگا۔'' حمیدہ نے کہا۔ کیونکہ رات کو نواز نے سارا زیور اتروا کر پرس میں رکھ دیا تھا۔ مگر پرس وہاں ہوتا تو ملتا؟ اور پھر پتا چلا کہ وہ تو لٹیرا تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے پتا چلا کہ ان کے یہاں آنے سے قبل اس کے پاس آیا تھا اور پھر انھوں نے اسے ملازم رکھ لیا انھیں نہیں معلوم کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔

بھلا ڈاکٹر نے بیٹی کی شادی تو اس سے نہ کرنی تھی کہ پوری چھان پھٹک کرتا؟ سکینہ نے جب یہ سنا تو اس کا دماغ ہی الٹ گیا۔ وہ کپڑے پھاڑتی ہوئی خود کو اپنے غلیظ دانتوں سے نوچتی ہوئی گلیوں میں نکل گئی۔

لو بھلا دماغ کو بھی ابھی پلٹنا تھا جب بھائی کا گھر تین مرتبہ اجڑا۔ تب تو یہ دماغ صحیح رہا۔

بھتیجی بے گھر ہوئی تب تو کچھ نہ ہوا۔ بس بیٹی کا اجڑنا ہی غضب ہو گیا؟

سب لوگ اس کا انجام دیکھ کر کانوں کو انگلیوں سے پکڑ پکڑ کھینچتے۔ توبہ توبہ کرتے۔

میرے سوہنے خدا ہمارے گناہ بخش دے۔ ایسا انجام کسی کا نہ ہو؟''

''سب کا یہی خیال تھا کہ زرینہ کی آہ لے ڈوبی اس گھر کو۔''

☆☆☆

وقت کبھی نہیں رکتا یہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بالکل اُس سیلاب کی مانند جو یہ نہیں دیکھتا کہ وہ اپنے راستے میں آنے والے کتنے سرسبز کھیتوں کو اجاڑ رہا ہے۔ کتنی بستیاں ہیں جنھیں روند رہا ہے۔ اور کتنے لوگوں کو موت سے ہمکنار کر رہا ہے پھر زبیر کا ٹرانسفر بہاولپور ہو گیا۔ میں بہت خوش تھی چلو اب گاؤں مہینے میں ایک بار تو جا سکوں گی۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ بڑا بیٹا ظہیر، بیٹی زہرا، دونوں اسکول جاتے تھے۔ ظہیر چھٹی کلاس میں تھا اور زہرا دوسری میں، ظاہر ہے ان کی پڑھائی کی وجہ سے میں صرف چھٹیوں میں گاؤں جا سکتی تھی۔ اس روز میں ننھے اظہر کو بہلا رہی تھی کہ

زبیر آ گئے۔ آج خلاف توقع وہ جلد آ گئے تھے۔
''آج آپ جلدی آ گئے؟'' میں کھڑی ہو گئی۔
''تم کو خوشی نہیں ہوئی؟'' وہ مسکرائے۔
''توبہ ہے آپ تو زبان پکڑتے ہیں؟''
''اچھا آؤ میں تم کو علی سے ملواؤں بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس کا بھی یہیں ٹرانسفر ہو گیا ہے ابھی اُسے مکان نہیں ملا اس لیے چند روز یہاں رہے گا۔ پھر جب مکان مل جائے گا تو اس کی ماں آ جائے گی اور وہ چلا جائے گا۔''
''اتنی تمہید کا مطلب؟'' میں چپل پہنتے ہوئے کہا۔
''مطلب یہ کہ تم اسے دیکھ کر پریشان نہ ہو جاؤ۔ بمعہ ساز و سامان کے۔'' زبیر نے میرا ہاتھ پکڑا۔
ڈرائنگ روم میں علی، زہرا اور ظہیر سے باتیں کر رہا تھا اور ان دونوں شریر بچوں نے اس کو انگلیوں پر نچا رکھا تھا۔ بچے اس سے اس طرح فری ہو گئے تھے جیسے عرصے سے جانتے ہوں۔
''انکل آپ نے اعزازی تلوار حاصل کی ہے۔ کیا بہت محنت کرنا پڑتی ہے؟'' زبیر نے کہا۔
''ہاں..... بہت'' اس نے اس کے پھولے پھولے گالوں کو چوم لیا۔
''کتنی؟'' ظہیر نے پوچھا۔
''بہت..... بہت زیادہ۔'' وہ بھی بچوں کی طرح بولا۔
''کوئی پھیلا کر بتائیں۔'' زہرا بولی۔
''اتنی۔'' اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور مجھے ہنسی آ گئی۔
''علی تم میرے بچوں سے نہیں جیت سکتے آخر..... اولاد کس کی ہیں۔'' زبیر نے ان کی بحث کو ختم کرا دیا۔ علی مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑی۔
''بھئی یہ میری بیگم ہیں طاہرہ زبیر اور تاری یہ ہے کیپٹن شعیب علی۔'' زبیر نے متعارف کرایا۔
''آداب!'' اس نے سر جھکا کر کہا۔ وہ سانولا سلونا سا شعیب علی مجھے بہت پسند آیا، تھا بھی بہت سیدھا سادا..... اس کے نقوش مجھے جانے پہچانے لگ رہے تھے اور نام بھی سنا ہوا تھا۔ آپ کا تعلق راجہ پور سے تو نہیں ہے۔'' میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''ہے نہیں..... بلکہ تھا۔ بس بھابی یہ سمجھ لیں کہ میں نے جنم وہیں لیا پلا بڑھا شہر میں۔'' وہ مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ میں وہ بات نہیں تھی جو کہ نوجوانوں کا خاصا ہوتی ہے۔
آخر میں نے ذہن میں کلبلاتا ہوا سوال کر دیا۔
''آپ..... ارشد علی کے بیٹے تو نہیں۔ پٹھانی کے بھائی۔''
''جی..... جی ہاں۔'' وہ فوراً بولا۔
''آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں پٹھانی کی دوست طاہرہ ہوں۔''
''ارے اماں آپ کا بہت ذکر کرتی تھیں۔'' وہ ایک دم خوش ہو گیا۔
''کیسی ہیں ماسی زرینہ۔''
''بالکل ٹھیک ہیں۔ بس مکان مل جائے تو انہیں لے آؤں گا۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بتا رہا تھا۔
''لو جی ہم تو سمجھے تھے کہ ہم ہی آپ کا تعارف کروا رہے ہیں پتا چلا پہلے کے شناسا ہیں۔''
زبیر عجیب سے لہجے میں بولے..... تو میں ہنس دی۔
''زبیر آپ تو۔''
''بس میں سب جانتا ہوں..... اب تم علی بے چارے کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی یا پرانی جان پہچان سے پیٹ بھراؤ گی۔''
''یوں کہیں آپ کو بھوک لگی ہے۔'' میں نے شاکی لہجے میں کہا۔
''ظاہر ہے۔'' زبیر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے اور میں ہنستی ہوئی باہر آ گئی۔
پھر علی ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا۔ صبح کو زبیر کے ساتھ آفس چلا جاتا۔ اور شام کا وقت ہمارے بچوں کے ساتھ گزارتا۔ رات کو اسکول کا کام بھی کرواتا۔ بچے بھی اس سے چند روز میں ہی مانوس ہو گئے تھے یوں

جیسے کہ علی جنم جنم سے ان کے ساتھ رہتا آیا ہو؟ اسے جب بھی وقت ملتا میرے پاس آ بیٹھتا۔ اور ڈھیروں باتیں کرتا۔ اس کی زیادہ تر باتیں پٹھانی کے متعلق ہوتیں۔ اب وہ پٹھانی کے ناتے مجھے بھی آپا کہتا تھا۔

''طاہرہ آپا میری پٹھانی آپا کیسی ہیں؟''

''سنا ہے بہت حسین ہیں؟ بہت مغرور ہیں؟

''کیا یہ سچ ہے؟ کیا وہ امی کی طرح نرم خو، نرم گفتار نہیں ہیں؟''

''مجھے بہت شوق ہے اُن سے ملنے کا...... جی چاہتا ہے وہ مجھے پیار کریں...... تاکہ میری تمام عمر کی تشنگی مٹ جائے...... کیا وہ بھی رفیعہ آپا اور رضیہ باجی جیسی ہیں۔''

اور میں اُس کے سوالات کے جوابات دیتے دیتے پریشان ہوجاتی۔ اصل میں جھوٹ بولنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور پٹھانی کے بارے میں جب وہ مجھ سے کچھ پوچھتا تو میں جھوٹ ہی بولتی تھی...... کہ۔

''سسرال والوں نے اس کی قدر نہیں کی۔''

''تم جب بھی اس سے ملو گے اپنا منتظر پاؤ گے...... وہ دونوں بازو پھیلا کر تمھیں سینے سے لگائے گی۔''

''اصل میں وہ بہنوں کو تم سے ملنے کے لیے بھیج دیتی تھی اور خود گھر سنبھالتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باپ کو شک ہو......'' میں بھی پٹھانی کی وکالت کرتی۔

''اب بھلا یہ باتیں جھوٹ ہی تو تھیں جو میں گھڑ گھڑ کر اسے سناتی تھی...... جبکہ پٹھانی تو ان باتوں کے بالکل برعکس تھی۔

پھر ماسی زرینہ بھی آ گئی کیونکہ علی کو بنگلہ مل گیا تھا۔ ماسی زرینہ کا وہ وقت میرے پاس گزرتا جب علی آفس میں ہوتا۔ وہی تو تھا ان کی کل کائنات اور جب وہ آفس سے آتا تو سارا دن ماں بیٹا اکٹھے رہتے یا شام کو کبھی ہمارے طرف آ نکلتے یا کبھی ہم ان کی طرف چلے جاتے۔

ماسی زرینہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے شعیب کو نہیں بتایا کہ کس وجہ سے انھیں طلاق ہوئی۔ پٹھانی کو ایک ہمدرد بہن کے روپ میں اس کے ذہن و دل میں بٹھایا ہے تاکہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ بہن سے نفرت نہ کر سکے۔ باپ کے بعد بھائی ہی تو اجڑی بہنوں کا سہارا ہوتے ہیں اور جب پٹھانی کو سہارا دینے کا وقت ہوگا تو یقیناً علی بہن کو اپنی بانہوں میں بھرے گا اس کے بیٹے کو سینے سے لگا لے گا۔''

تب میں نے سوچا مائیں بہت عظیم ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص اگر چاہے بھی تو ماؤں کے احسانوں کے بدلے نہیں اتار سکتا۔ ماں جیسا بننا چاہے بھی تو نہیں بن سکتا۔

راتوں کو جاگ جاگ کر لوریاں سنانے والی ماں۔

خود بچے کے پیشاب والی بستر کی گیلی جگہ پر سونے والی ماں...... اور بچے کو سوکھے بستر پر سلانے والی ماں۔ (ایسا عموماً ہماری دیہاتی مائیں کرتی ہیں)

کتنا بڑا احسان ہے ماں کا......

ماں کو تو اللہ تعالیٰ نے محبت، شفقت، ہمدردی، تخلیقی درد کے خمیر سے گوندھا ہے۔

جبھی تو اتنی عظیم ہے ماں...... قدرت کا حسین تحفہ ماں۔ قدرت کا عکس ہمیں ماں میں مل سکتا ہے۔ کائنات کی خوب صورت شے ماں۔

اسی طرح چھ ماہ بیت گئے۔ اس دوران میں گاؤں بھی ایک دو بار گئی۔ اور پٹھانی سے بھی ملی۔ مگر اب وہ پہلے جیسی پٹھانی نہیں رہی تھی بے حد گم صم ہوگئی تھی۔ اس کا بیٹا اُسے بہت پریشان کرتا تھا۔ پیسے چرا لیتا۔ گندم کے دانے چرا کر لے جاتا اور دکان پر بیچ کر چیز کھا لیتا۔

ماں کا ست لڑا سونے کا ہار صرف پچاس روپے میں اُس نے بیچ دیا تھا۔

شفیع وہ حرکت کرتا تھا جو کہ گاؤں کے غریبوں کے بچے پیسے نہ ملنے کی بنا پر کرتے تھے...... اگر پٹھانی اسے پیسے نہ دیتی تو شفیع اس کا منہ نوچ لیتا۔ اور کہتا۔

''پٹھانی مجھے پیسے دے ورنہ تیرا دل چیر دوں گا۔''

ایک روز اس نے یہی جملہ میرے سامنے کہا

جب میں پٹھانی سے ملنے گئی اور میں حیران رہ گئی وہ صرف گیارہ برس کا لڑکا بالکل جوان...... بدمعاشوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

''پٹھانی...... تو نے اس کی کیسی تربیت کی ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''طنز مت کرو تاری...... میں شروع میں اس کی ہر خواہش پوری کرتی تھی تاکہ یہ، یہ نہ سوچے کہ باپ نہیں ہے تو ماں میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے تب بابا بھی مجھے خاصے پیسے دیا کرتا تھا۔ اب تو ان کا کاروبار بالکل ختم ہوگیا ہے۔ اب پیسے نہیں ہیں تو میں کیا کروں۔'' پٹھانی کی براؤن آنکھیں نم ہوگئیں۔ اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر گالوں پر پھیل گئے مجھے یوں لگا جیسے جھیلوں میں دو راج ہنس تیر رہے تھے جو کہ پلکیں جھپکنے پر اڑ گئے۔

''بہرحال پھر بھی تم شفیع کو مار دو سمجھاؤ۔ اسے کسی اسکول میں ڈال دو۔''

''اسکول میں بھی بٹھایا تھا میں خود چھوڑنے جاتی تھی اور جب واپس آتی تو نا جانے یہ کون سے راستے سے مجھ سے پہلے گھر پہنچ جاتا۔ پیار سے بھی اور مار سے بھی سمجھایا ہے مگر سنتا نہیں۔ پتا نہیں کب سمجھے گا۔ تاری مجھے تو لگتا ہے کہ اس کی پوری زندگی جیل میں بسر ہوگی اور میں غریب ماں......''

''غریب۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں...... اب کیا ہے ہمارے پاس...... بابا سارا دن حقہ گڑگڑاتا ہے۔ پہلے کی جو جمع پونجی ہے وہی چل رہی ہے۔ آخر وہ بھی کب تک چلے گی۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

''فاروق کچھ نہیں کرتا وہ بھی تو سترہ اٹھارہ سال کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسے سارا دن لڑکیاں تاڑنے سے فرصت ہو۔ صبح شام کھا پی کر مونچھوں کو مروڑے دیتا ہوا چلا جاتا ہے اور رات گئے گھر میں گھستا ہے۔ اسے تو اپنے غریب باپ اور بہن کا خیال بھی نہیں۔ ہم غریب ہی تو ہیں تاری۔'' وہ ہنسی۔ ایک دکھی سی ہنسی۔

''مگر تجھے تو غریبوں سے نفرت تھی۔''

''ہاں۔''

''اب خود سے نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔

''اب پتا چلا ہے تاری کہ ہر شخص خوشی سے غریب نہیں بنتا۔'' وہ اک آہ لے کر بولی۔

''اور ہر بہن بھی ماں نہیں بن سکتی۔ دیکھو تمہاری ماں کے جانے سے کیسا......''

''مت لو اس کا نام۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''اسی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے نہ وہ خدا بخش درزی کے ساتھ......''

''بکواس بند کرو پٹھانی۔'' میں اس کی بات کاٹ کر چیخی۔

''تمہاری ماں بہت عظیم ہے اگر وہ ایسی ویسی ہوتی تو بتاؤ...... بتاؤ وہ اب تک شادی نہ کر لیتی۔ تم دیکھو۔ اس نے شعیب کی پرورش کیسے کی ہے۔ آج وہ پاک فوج کا بہادر جوان ہے۔ دھرتی کو اس پر ناز ہے۔ اور تمہیں بھی ناز کرنا چاہیے کہ وہ تمہارا بھائی ہے۔'' میں غصے میں کانپ رہی تھی۔

''وہ میرا بھائی نہیں ہے۔'' وہ اب بھی بید کی لچکدار چھڑی ہی تھی۔

''پٹھا...... نی۔'' میرا ہاتھ اٹھا اور اس کے زرد گال پر اپنے نشان ثبت کر آیا۔

''پٹھانی فرض کرو ایسا ہے تو بتاؤ...... شعیب نے اور تم نے ایک ہی کوکھ سے جنم لیا۔ ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر خدانخواستہ تمہاری ماں واقعی بدکردار ہوتی اور شعیب گورا چٹا ہوتا تو تم اسے تب اپنا بھائی تسلیم کر لیتی...... صرف اس کا سانولا رنگ ہی مصیبت بن گیا۔ نقوش تو اس کے تم ہی لوگوں سے ملتے ہیں اور......''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''تو پھر ایک بات سن لو...... آج سے گیارہ برس پہلے انور نے جو سوال کیا تھا وہ میں کرتی ہوں بتاؤ...... بتاؤ شفیع کس کا ہے؟'' میں نے اس کی براؤن آنکھوں میں آنکھیں الجھا دیں۔ میں آج اس کے دل سے ماں کے لیے نفرت نکالنا چاہتی تھی۔ ماں کی محبت کا چشمہ اس کے سینے میں بہتا دیکھنا چاہتی تھی۔

''تاری تم تو مجھے جانتی ہو؟'' اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

''تمہاری ماں کو بھی تو پورا گاؤں جانتا تھا۔ خدا بخش نے تو قرآن شریف اٹھا کر تمہارے باپ سے کہا تھا زرینہ میری بہن ہے۔ بیٹی ہے۔ تم لوگوں کو قرآن کی مار پڑی ہے۔ اس بے نیاز کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ تمہاری اور بھی تو بہنیں ہیں خدا نے کتنا بخت لگایا ہے انھیں کیا نہیں ہے ان کے پاس۔ تمہارے پاس کیا ہے؟ بگڑا ہوا بیٹا اور بھائی۔ بیمار باپ۔ تنہائیوں کا درد۔ کسک۔ جلن۔ خلش۔

یہ سب تمہارے پاس ہے۔ یہ ماں کی بددعا لگی ہے۔ تم اس سے معافی مانگو اسے ماں کہو۔'' میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔''

''ہونہہ معافی اور زرینہ سے۔ ماں اور زرینہ کبھی نہیں۔'' اس کے چہرے پر سختی کے آثار پیدا ہو گئے...... ''اس کی وکالت مت کرو تاری۔''

پھر میں نے اسے بہت سمجھایا۔ مگر شاید اسے سمجھاتے ہوئے میں یہ بھول گئی تھی کہ بچپن کے نقوش بہت دیرپا ہوتے ہیں کبھی نہیں مٹتے کبھی...... کبھی نہیں۔ مجھے پٹھانی سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ویسے بھی محبت تو بہت آہستہ ہوتی ہے مگر نفرت کے لیے ایک لمحہ کافی ہے۔

☆☆☆

اس روز میں زہرا کا فراک سی رہی تھی۔ زبیر آفس گئے ہوئے تھے اور بچے باہر ماں کے ساتھ کھیل رہے تھے...... کہ تب ہی علی گھبرایا ہوا میرے کمرے میں آ گیا وہ کبھی خواب گاہ میں نہیں آیا تھا میرے ہاتھ رک گئے میں کھڑی ہو گئی۔

''آپو، آپو'' وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''کیا ہوا علی!'' میں پریشان ہو گئی۔

''آپو'' وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ میں جلدی سے کچن میں گئی اور اس کے لیے ٹھنڈا پانی لائی۔ وہ مجھے بالکل بھائیوں کی طرح پیارا تھا۔

''علی یہ پی لو۔ میرے بھائی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اُسے سہارا دے کر پانی پلایا اس نے صرف دو گھونٹ پیے میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپو۔ آپو میری پٹھانی آپا جی بہت بیمار ہے۔ آپ ضرور جائیے تاکہ ان کی خبر میں رکھ سکوں۔ میں نے جب سے سنا ہے میں آگ پر لوٹ رہا ہوں اور میرا وجود ان شعلوں سے سلگا جا رہا ہے۔'' وہ اب بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔

''مگر اسے ہوا کیا آخر۔؟'' میں نے کہا۔

''سنا ہے فالج گر گیا ہے۔ پلیز آپو ضرور جائیں آپ۔ میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مجھے وہ ان دیکھی آپا بہت پسند ہے۔ بے حد پسند ہے۔ لگتا ہے جو میرا جسم ہے۔ اس جسم میں روح پٹھانی آپا جی کی ہے۔'' اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''پلیز آپ میری بات مان لیں۔ ورنہ میں بے موت مر جاؤں گا۔ اور اگر آپ نے میری بات نہ مانی...... تو دنیا کچھ بھی کہے میں ان تک پہنچ جاؤں گا۔ چاہے ارشد علی مجھے دھکے دے دیں۔ پلیز آپ میری بات مان لیں۔ مجھے مرنے سے بچالیں۔''

اس نے میری دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ وہ لحیم شحیم سا کیپٹن۔ آہنی عزائم والا مرد مومن اپنی بہن کے دکھ پر رو رہا تھا۔ اس بہن کے دکھ پر جو اُسے بھائی تسلیم نہیں کرتی تھی۔ میرے دل میں اچانک پٹھانی کی محبت نے جوش مارا آخر وہ میرے بچپن کی دوست تھی۔ حالانکہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس سے نہیں ملوں گی مگر مجھے...... اس کے دکھ کا سن کر چین بھی تو نہ آیا تھا۔ جی چاہا کہ ابھی پہنچ جاؤں اس کے پاس۔

''ماسی زرینہ کو پتا ہے؟'' میں نے اس کے آنسو اپنی انگلی کی پور سے صاف کیے۔

''میں ابھی تو رفیعہ باجی کے ہاں سے آ رہا ہوں وہ تو گاؤں جانے کو تیار کھڑی تھیں انھوں نے مجھے منع کر دیا کہ میں اماں کو نہ بتاؤں...... ورنہ وہ نہیں رہ

سکیں گی۔ آپ گاؤں چلی جائیں۔ میں روز شام کو آپ کے بھائی کے ہاں آ کر آپا کی خیریت دریافت کرلوں گا۔'' علی نے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پھر وہ چلا گیا۔ اور مجھے بے چین کر گیا۔ پٹھانی کی بیماری کے متعلق سن کر مجھے صدمہ ہوا تھا۔ سہ پہر کو زبیر آئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں ان سے گاؤں جانے کے متعلق بات کی۔

''کیوں جاناں؟'' زبیر نے دلفریب لہجے میں کہا۔ اور پھر جواب میں، میں نے علی کا آنا اور پٹھانی کے متعلق انہیں بتادیا۔ اور ساتھ ہی آنسو بھی میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے تم ضرور جاؤ۔ آخر وہ تمہاری دوست ہے اور پھر علی کی بہن بھی تو ہے۔'' زبیر نے میری کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اپنے قریب کرلیا۔

''ایک بات تو بتاؤ کیا واقعی پٹھانی، علی کی حقیقی بہن ہے۔'' زبیر نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور پھر میں نے بھی کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا۔ اور پٹھانی کے متعلق سب کچھ بتادیا۔ اس سے پہلے نہ انھوں نے پوچھا تھا اور نہ ہی میں نے بتانا چاہا تھا سب کچھ سن کر زبیر بولے۔

''یہ ماں کی بددعا ہے جو اسے لے ڈوبی۔ حیرت ہے گاؤں میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں زبیر۔ اور یہ واقعات گاؤں میں ہی ہوتے ہیں۔ جہاں پرانے وقتوں کی بڑی بوڑھیاں اگر اپنی بہوؤں کو پسند نہیں کرتیں اور انتقام لینا چاہتی ہیں تو وہ اپنے پوتے پوتیوں کے ذریعے وہ سب کچھ کر گزرتی ہیں جو چاہتی ہیں۔ ان کی غلط سلط باتوں کے نقوش بچوں کے ذہنوں پر اس طرح ثبت ہوجاتے ہیں جیسے دیوار میں کیل کا نشان۔ حالانکہ پٹھانی سمجھدار ہے سب کچھ جانتی ہے اور اس کا دل بھی مانتا ہوگا کہ اس کی ماں بے قصور ہے۔ مگر اس کا ذہن ماں کو تسلیم نہیں کرتا۔''

''تقریر اچھی خاصی کرلیتی ہو۔'' زبیر میری بات کاٹ کر بولے تو میں نے گھور کر اُن کی طرف دیکھا وہ آنکھوں میں لاتعداد جگنو روشن کیے بڑے والہانہ پن سے مجھے تک رہے تھے اور پھر میری نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

شام کو میں نے گاؤں جانا تھا زبیر اور بچے بھی ساتھ جارہے تھے کہ لاہور سے میری نند آ گئی۔ وہ میلسی اپنے سسرال جارہی تھی کہ بھائی کی محبت نے جوش مارا اور وہ ایک روز کے لیے بہاولپور آگئی۔ ظاہر ہے پروگرام کینسل ہوگیا میں نے آپا پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ ہم کہیں جارہے تھے۔ دوسرے روز شام کو زبیر، آپا کو چھوڑنے میلسی چلے گئے۔ اب ظاہر ہے ہماری روانگی اگلے روز ہوئی تھی۔ علی کی تو بُری حالت تھی دسیوں چکر کاٹا ہمارے ہاں۔ ماسی زرینہ بھی ایک بار آئیں یہ پوچھنے کہ علی کچھ..... پریشان ہے اُس نے اپنی پریشانی کی وجہ تمھیں بتائی۔''

مگر میں نے انھیں تسلی دی کہ ان کے ہاں انسپکشن ہونے والا ہے نا اور وہ نیا ہے اس لیے گھبرا گیا ہوگا۔'' اور پھر ماسی زرینہ نے میری بات کا اعتبار کرلیا۔ وہ ہمیشہ میری بات مان جایا کرتی تھی۔ یقین کرلیا کرتی تھی۔ اسے اعتماد تھا مجھ پر۔

رات کو دو بجے زبیر کی میلسی سے واپسی ہوئی اور اگلے روز صبح ہماری موٹر راجہ پور کی طرف دوڑی جارہی تھی۔

بچوں اور زبیر کو میں نے بھائی جان کے ہاں بھیجا اور خود سیدھی پٹھانی کے ہاں پہنچ گئی۔ پٹھانی اپنے کمرے میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ویران و اداس بڑی بڑی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی پھر معدوم ہوگئی۔ وہ پٹھانی۔ جب میں آتی تھی تو بانہیں پھیلا کر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ چومتے تھے۔ آج وہی پٹھانی بالکل بے حس پڑی تھی باوجود خواہش کے وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ نہ سکتی تھی۔ ارشد علی ایک کرسی پر گم صم بیٹھے تھے۔

''اسلام علیکم چاچا۔'' میری آواز پر وہ چونک اُٹھے۔

''آؤ۔ طاہرہ بیٹی کب آئیں؟''

کھڑے ہوگئے۔ میں جو ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی اندر آ گئی۔

''ابھی آئی ہوں۔ زبیر اور بچے بھائی کے ہاں چلے گئے اور میں یہاں آ گئی۔ رفیعہ کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی۔''

''وہ چند لمحے پیشتر رضیہ کے ہاں گئی ہے ابھی بلواتا ہوں۔''

''نہیں رہنے دیں آ جائے گی۔'' میں پٹھانی کے قریب بیٹھ گئی۔

''بے چاری تین روز سے آئی ہے اور پریشان ہے اس لیے میں اُسے رضیہ کے ہاں بھیج دیتا ہوں تاکہ ذہن بٹے اور دل سنبھلے۔'' ارشد علی بولے۔

''اچھا کرتے ہیں۔'' میں نے پٹھانی کا بے جان سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا مگر جواباً مجھے وہی گرمجوشی نہ ملی۔ پٹھانی کی آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں میں نے اپنے پلو سے صاف کر دیا۔ اف کتنی مجبور ہوگئی تھی وہ پٹھانی۔ ہاتھ بھی نہ ہلا سکتی تھی۔ لوگوں سے آنسو چھپانے کے لیے آنسوؤں کو پونچھ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ اوروں کو بے بس کرنے والی پٹھانی۔ اب خود بے بس تھی۔ بڑی مضبوط پکڑ میں آئی تھی وہ، جہاں سے نکلنا بہت مشکل تھا۔

پھر ارشد علی بتانے لگے کہ پہلے دن تو زبان پہ فالج گرا۔ اور صرف تین روز کے وقفے کے بعد پورا جسم مفلوج ہوگیا۔ پٹھانی سرسوں کا پھول ہوگئی تھی بالکل مرجھا گئی تھی وہ۔ اور اسے دیکھ کر ہی مجھے پتا چلا تھا کہ گالوں کے گلاب زردیوں میں کس طرح بدلتے ہیں۔''

آنکھوں کی خیرہ کر دینے والی روشنی کس طرح معدوم ہوتی ہے؟ آنکھیں ویران کیسے ہوتی ہیں۔ دل میں کیسے کسک اُٹھتی ہے۔'' پھر میں پٹھانی کے پاس بیٹھ کر کتنی دیر تسلیاں دیتی رہی۔ اُسے غم نہ کرنے کی تلقین کرتی رہی جبکہ میرا دل اسے یوں دیکھ کر رو رہا تھا۔ اندر ہی اندر درد سو سو انگڑائیاں لے رہا تھا۔

کافی دیر۔ میں اُس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر گھر آ گئی جہاں بھیا، بھابی اور زبیر میرے منتظر تھے۔ اور تب ہی کوئی تیزی سے میرے قریب آیا۔ یہ شعیب علی تھا۔

''میری آپو کیسی ہیں؟'' بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''دعا کرو۔ مگر تم کب آئے؟'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

''پندرہ منٹ ہوگئے ہیں اور آپو یہ پندرہ منٹ مجھے پندرہ صدیوں پر محیط نظر آ رہے تھے۔ پریشانی کی تو کوئی بات نہیں نا؟'' اس نے پھر پٹھانی کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں علاج ہو رہا ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ آج کل کوئی مرض لاعلاج نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

میں ایک ہفتہ گاؤں میں رہی۔ پٹھانی کی تیمارداری میں لگی رہی۔ جب اپنی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھتی تو میرا رواں رواں کپکپا جاتا۔ وہ اتنی حسرت۔ اور بے چارگی ہوتی ان آنکھوں میں کہ مجھے کلیجہ منہ کو آتا ہوا محسوس ہوتا۔ علی روز بہن کی خبر گیری کے لیے آتا۔ اور اُسے میں پوری رپورٹ دیتی۔ اور پھر کسی کی خاطر گھر بار تو چھوڑ کر نہیں بیٹھا جاتا۔ زبیر بہت اچھے ہیں مگر میں نہیں چاہتی تھی کہ زبیر کچھ کہہ دیں اور مجھے دکھ ہو۔ میں ایک ہفتے بعد گھر آ گئی۔ مگر علی کو کہاں چین تھا دوسرے تیسرے دن مجھے گاؤں لے جاتا صرف چند گھنٹوں کے لیے...... زبیر نے بھی اجازت دے رکھی تھی وہ علی کی حالت دیکھ کر خود بھی کڑھتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ پٹھانی بیمار نہیں علی بیمار ہوگیا ہو۔ ماسی زرینہ اس کی بگڑتی ہوئی صحت سے پریشان تھیں کیونکہ ابھی انھیں کچھ نہ بتایا گیا تھا۔ میں انھیں تسلی دیتی۔ تو وہ پُرسکون ہو جاتیں۔ ایک روز علی بہت پریشان تھا تب زبیر بولے۔

''یار تم بلا کھٹکے چلے جاؤ بہن کو دیکھنے ڈر کس بات کا۔''

''زبیر بھائی میرے باپ نے دوسری شادی کی خاطر میری ماں کو چھوڑا تھا۔ اور جب یاں وہاں سے

چلنے لگی تھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہولیا تھا۔ اب میں کس منہ سے اس گھر میں جاؤں۔ اور اب تو میری بہن بھی تو بے زبان ہے اگر ابا جی مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم دیں گے۔ فرض کریں مجھے دھکے دیں تو ڈھال کون بنے گا؟ آپا تو نہیں ہیں۔ اماں بتاتی ہیں وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔'' علی گھومتے پنکھے کو دیکھ رہا تھا۔

''بس کرو علی۔'' میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ ماسی زرینہ نے یہ جھوٹ اس سے کس طرح بولا ہوگا۔ انھوں نے بیٹے کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کی خود کو مظلوم نہیں بتایا۔ پٹھانی کو ظالم نہیں بتایا۔ اُف کیسی ماں ہے زرینہ ماسی! میں رو دی۔

''آپو..... آپ کیوں رو رہی ہیں۔'' علی میرے قریب آ گیا۔

''نہیں تو.....'' میں نے آنسو پونچھے جو انجانے طور پر آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ ''بس پرانی باتیں سن کر دکھ ہوتا ہے اور علی چاند یادیں سوائے دکھوں کے کچھ بھی تو نہیں دیتیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یادوں سے صرف دکھ ہوتا ہے۔ مگر یہ یادیں پیچھا تو نہیں چھوڑتیں۔ دن مہینے سال گزر جاتے ہیں۔ مگر یہ یادیں ذہنوں پر نقش ہو جاتی ہیں یہ کبھی نہیں مٹتیں۔'' علی ایک طویل سانس لے کر بولا اور میں اور زبیر بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

پٹھانی کو چارپائی پر پڑے پورے چھ ماہ ہو گئے تھے چند روز سے تو اس کی بہت بُری حالت تھی اس سے کھایا ہی نہ جاتا۔ بھائی اور بیٹا اس کی بے عزتی کرتے۔ کہ ''نہ مرتی ہے نہ منجی چھڈتی ہے۔''

''بہانے بازی چھوڑ دے۔''

فاروق تو یہ جملے روز ضرور بولتا۔ شفیع کو کھلی چھوٹ ہو گئی تھی وہ ٹرنک میں سے پیسے نکال لیتا اور پٹھانی چپ آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتی بھلا کیا کر سکتی تھی اس کا۔ اور اب میں دو روز سے یہیں تھی۔ زبیر مجھے خود ہی چھوڑ گئے تھے۔ صرف چند لمحوں کے لیے میں اپنے بھائی کے گھر چلی جاتی جہاں علی میرا منتظر ہوتا۔ تاکہ اس کی بہن کے متعلق میں اسے کوئی اچھی خبر سناؤں۔ مگر پٹھانی تو زندگی سے دور موت سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میرا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر علی سب کچھ سمجھ جاتا اور کہتا۔

''آپو کچھ مت کہنا۔'' وہ تڑپ کر مجھے منع کر دیتا۔

اور ابھی چند لمحے پہلے عالم صاحب جو کچھ بتا کر گئے ہیں وہ بالکل صحیح کہہ کر گئے ہیں۔ واقعی پٹھانی نے بڑی عظیم ہستی کا دل دکھایا ہے۔

اور وہ عظیم ہستی ماں ہے۔ جسے وہ ماں تسلیم نہیں کرتی۔ جس کی غربت سے اسے نفرت تھی۔ مگر ماں تو کبھی امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ اس کے لیے تو سب بچے برابر ہوتے ہیں۔ ممتا نہ امیر ہوتی ہے نا غریب۔ وہ صرف ممتا ہوتی ہے۔

''طاہرہ بیٹی۔'' ارشد علی کی آواز مجھے ماضی کے ریگزاروں میں سے واپس لے آئی۔ میں چونک اٹھی۔

''کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟''

''کچھ نہیں چاچا جی!'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''عالم صاحب نے جو کچھ کہا ہے تم متفق ہو۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میرے خیال میں انور کو بلا لیا جائے۔'' انھوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے انھیں دیکھا۔

''آخر شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔ شاید اسی کی۔''

''نہیں چاچا جی۔'' میں نے ان کی بات کاٹی۔ ''پٹھانی نے انور کو کچھ نہیں کہا بلکہ انور نے پٹھانی کی پاکدامنی پر شبہ کیا ہے۔ آپ کو ابھی تک خیال نہیں آیا کہ وہ عظیم ہستی کون ہے؟'' میں نے ارشد علی کی آنکھوں میں دیکھا جو مجھ کو ہی دیکھ رہے تھے۔

''آخر کون؟''

''پٹھانی کی ماں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

''جی ہاں پٹھانی نے اپنی ماں کا دل دکھایا ہے۔''

آپ کو پتا ہے حضور اکرم ﷺ کے پاس ایک مقدمہ آیا۔ ایک آدمی بہت بیمار تھا۔ اس کی نہ جان نکلتی تھی نہ وہ ٹھیک ہوتا تھا۔ حضور نے دریافت فرمایا کہ اس شخص کی ماں ہے۔ جواب ملا۔ ہاں ہے۔ مگر وہ الگ رہتی ہے کیونکہ یہ آدمی اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر اپنی ماں کی تضحیک کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا جب تک اس شخص کی ماں اسے معاف نہیں کرے گی۔ اس کی جان نہیں نکلے گی اور یہی ہوا۔ جب اس عورت نے بیٹے کو معاف کر دیا تو بڑی آسانی سے اس کی جان نکل گئی۔ اور میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی پٹھانی کی ماں کو بلوائیں ورنہ یہ یونہی پڑی رہے گی۔ آپ اپنے سینے سے یہ سل اتاریں اور اسے بھی اس عذاب سے چھٹکارا دلوائیں۔ انیس سال بعد ماسی زرینہ کو اس گھر میں آنے کی اجازت دیں۔''

''مگر...... مگر میں اسے کہاں تلاش کروں۔''
ارشد علی نے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

''مجھے علم ہے اس کا...... اور...... اور اس کے ساتھ شعیب بھی آئے گا کیونکہ اسے اپنی بہن سے ملنے کا بے حد شوق ہے وہ بہت بے چین ہے پٹھانی سے ملنے کو۔ ماسی زرینہ نے عورت ہوتے ہوئے اس کی بہترین خطوط پر پرورش کی ہے آج وہ قابل فخر نوجوان ہے۔''

شعیب۔ میرا بیٹا۔ طاہرہ بیٹا بلا لو اسے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ خود اپنے ضمیر کی ملامت سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں۔ مگر میرے اندر کی آوازیں مجھے چین نہیں لینے دیتیں۔ تم انہیں بلوا لو میں خود معافی مانگوں گا ان سے۔ میں پٹھانی کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں۔ اس کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

ارشد علی رو دیے۔ اور انہیں روتا دیکھ کر مجھے واقعی بہت دکھ ہوا۔ ہائے اس نے زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ میں نے دیکھا پٹھانی رو رہی تھی میں نے فوراً اس کے آنسو پونچھ دیے۔

شام کو شعیب علی آیا تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا اور وہ اسی وقت جیپ لے کر شہر چلا گیا۔ ہم سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ رفیعہ، رضیہ، فاروق بھی موجود تھے اور آج تو پٹھانی کو بھی ماں کا انتظار تھا میں نے اس کی آنکھوں میں انتظار کے جلتے دیپ دیکھ لیے تھے۔

رات کو تقریباً گیارہ بجے پٹھانی کے گھر کے سامنے جیپ آ کر رکی میں تیزی سے آگے بڑھی۔ تو زبیر اور شعیب علی، ماسی زرینہ کو سہارا دے کر جیپ سے اتار رہے تھے۔ ماسی زرینہ بے حد لاغر نظر آ رہی تھیں۔

''ایک دم ہی پٹھانی کی بیماری کی اطلاع ملی تو گم صم ہو کر رہ گئیں اور جب سکتہ ٹوٹا تو رو رو کر برا حال کر لیا کہ فوراً پٹھانی کے پاس لے چلو۔''

زبیر نے مجھے بتایا۔ پھر ہم تینوں ماسی زرینہ کو لیے اندر آ گئے۔ ممتا بڑی ظالم شے ہے۔ اولاد کتنی بھی تذلیل کرے۔ مگر ماں کبھی اولاد سے نفرت نہیں کرتی۔ شعیب علی تو تیزی سے کمرے میں چلا گیا اور میں زبیر کے ساتھ ماسی کو تھامے ہوئے دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو ٹک ٹک دیکھ رہی تھیں۔ پھر نا معلوم کیسے ماسی زرینہ میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ ہم سے اپنا آپ چھڑا کر تیزی سے پٹھانی کی طرف بڑھیں۔

''پٹھانی۔ میری بیٹی میری جان۔ میری زندگی۔''
وہ دیوانہ وار اسے چوم رہی تھیں۔ اور بار بار ایک ہی جملہ کہہ رہی تھیں۔

''میری جان مجھے اماں کہہ دے۔ میں تیرے منہ سے لفظ اماں سننا چاہتی ہوں۔'' ماسی زرینہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔

''پٹھانی تو مجھے اماں کہہ دے تاکہ میرے تڑپتے دل کو قرار آ جائے۔''

''میری بے چین روح کو چین آ جائے۔''

''بول...... پٹھانی بول...... مجھے بول اماں۔ آج تجھے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ کوئی بھی تو نہیں ہے۔'' ماسی زرینہ اس کے چہرے پر سر رکھ کر رو دیں۔

کمرے میں سب رو رہے تھے۔ ماسی کی تڑپ سب کے دل پر اثر کر رہی تھی۔ اور...... تو اور آج

سخت دل پٹھانی کے دل میں بھی محبت کے جھرنے پھوٹ نکلے تھے۔ تبھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو موتیوں کی طرح تکیے پر گر رہے تھے۔

''ماسی آپ پٹھانی کی گستاخیوں کو معاف کر دیں۔ جو بددعا دی ہے آپ نے۔'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں نے کوئی بددعا نہیں دی۔ میرا رواں رواں ہمیشہ اس کے لیے دعائیں کرتا رہا ہے۔ پتا نہیں کس نے اسے بددعا دی ہے۔ یہ خود گستاخیاں نہیں کرتی تھی طاہرہ..... اسے گستاخیوں پر اکسایا جاتا تھا۔'' انھوں نے پٹھانی کا زرد چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور ان کے آنسو پٹھانی کے چہرے کو بھگونے لگے۔

''مگر پھر بھی آپ اسے معاف کر دیں۔'' میرے مجبور کرنے پر وہ بولیں۔

''میں نے کبھی کوئی بددعا نہیں دی اسے باری تعالیٰ تو گواہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی تجھ سے کہا۔ کہ پٹھانی کے دل میں میری محبت ڈال دے۔ بالکل ایسے جیسے میرے دل میں اس کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ مگر نامعلوم کیوں میری دعائیں قبول نہ ہوئیں میں نے اسے معاف کیا۔'' اور پھر زندگی میں پہلی بار ہم سب نے معجزہ ہوتے دیکھا۔ ایک چمک تھی جو پٹھانی کی آنکھوں میں لہرائی۔ اور وہ چمک بھائی، ماں کی محبت کی چمک تھی۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے علی کو قریب بلایا اور پھر علی اس کے سینے پر سر رکھے آنسو بہا رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے پٹھانی کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر کیا؟

پھر اس کے لب مسکرائے۔ اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر دوسروں کے دل دکھ جائیں۔ اور پھر اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہم سب گم صم کھڑے تھے کہ ہمیں ہیپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ اور پھر اس کے منہ سے ایک ہی لفظ ادا ہوا۔

''اماں.....'' اس ایک لفظ میں کتنی شیرینی تھی یہ تو ماسی زرینہ کو پتا تھا جبھی تو وہ دیوانہ وار اسے چوم رہی تھیں۔

''پھر بول پٹھانی۔ میری دھی..... میری سوہنی پھر بول۔ مجھے یقین ہو جائے کہ یہ تصور نہیں حقیقت ہے۔''

''اماں۔'' پٹھانی کو بھی شاید یہ لفظ ادا کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں گھومتی ہوئیں علی پر ٹک گئیں جو فاروق اور شفیع کو لپٹائے کھڑا تھا اور تب یہ دیکھ کر پٹھانی کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی لب مسکرائے اور پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو گئی۔ پتا بھی نہ چلا اور اس کی روح پرواز بھی کر گئی۔ میں حیرت میں تھی۔ کہ زبیر نے آگے بڑھ کر پٹھانی کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ علی رو رہا تھا۔ ارشد علی۔ شعیب کو گلے لگا کر بچوں کی طرح رو رہے تھے اور ماسی زرینہ پٹھانی کی مسہری کی پٹی سے سر ٹیکے بین کر رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی۔

حدیث شریف میں ہے کہ والدین کا نافرمان نہیں بخشا جائے گا تو کیا پٹھانی.....؟

نہیں باری تعالیٰ! تو اسے بخش دینا اس نے بہت دکھ سہے ہیں، بہت عذاب جھیلے ہیں۔ کبھی گھر نہ بس سکا۔ سہاگن ہو کر بھی ابھاگن رہی۔ اب اسے سکون دے دینا کیونکہ وہاں کا عذاب سہنے کی اس میں ہمت نہیں ہو گی۔ اب خبر نہیں میری بھی دعا مستجاب ہوئی یا نہیں۔

کئی برس بیت گئے ہیں اس سانحے کو گزرے۔ ارشد علی، فاروق اور شفیع پٹھانی کی موت کے بعد شعیب کے پاس ہی آ گئے۔ اصل میں وہ زبردستی انھیں لے آیا تھا۔ پٹھانی کا دکھ ماسی زرینہ کی جان لے کر ہی گیا صرف دو ماہ بعد وہ اس سے جا ملیں۔ بہت پیاری تھی انھیں پٹھانی۔ پہلوٹھی کی جو تھی؟ فاروق کو علی نے ایک کپڑوں کی دکان کھول دی تھی۔ اور شفیع کالج میں زیر تعلیم ہے۔ شعیب آج بھی ہر جمعرات کو اپنی پٹھانی آپا کی قبر پر چراغاں کرنے جاتا ہے۔ وہ آپا جس نے آخری وقت میں ہی اسے بھائی تسلیم کیا تھا۔ شاید۔ شاید اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے۔ یا قبر پر دیا جلوانے کے لیے۔

☆☆☆

دوسری طویل سچ بیانی

انگاروں پہ رقص!

ریاض حسین شاہد

اُس نوجوان کی داستان جسے محبت راس نہ آسکی

خزاں کی رُت جاتے جاتے پوری نباتات کا سبزہ، کلیاں پھول غنچے نوچ کر انھیں بے برگ وثمر کر کے بہار کی بانہوں میں دے کر رخصت ہو رہی تھی۔ بہار اور خزاں کا سنگم ہو رہا تھا۔ وسط فروری کے دن تھے۔ دن کو دھوپ کی شدت محسوس ہوتی تھی۔ اور رات لحافوں میں جاڑے سے دانت بجتے تھے۔ بی ایس سی کے پیپرز جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے تھے دے کر میں فارغ ہی تھا۔ صبح ناشتے کے بعد تھوڑی ہی دھوپ نکلی تو میں چھت پر چلا آیا۔ جہاں میرا چھ سالہ بھتیجا شیراز پتنگ اڑانے کی ریہرسل کر رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ کچھ دیر تو میں چار سو بکھری آبادی اور اس سے پرے دکھائی دیتے والے درختوں کے مناظر دیکھتا رہا، میرے گاؤں کی آبادی کس قدر بڑھ گئی تھی۔ پچھلے بیس سالوں میں یہ دوگنا بلکہ دگنے سے بھی زیادہ پھیل گیا تھا۔

''چاچو! مجھ سے پتنگ نہیں اڑائی جا رہی۔ پلیز میری مدد کرو۔ بس تم دونوں ہاتھوں سے پتنگ ہوا میں اچھال دو۔ پھر میں اڑا لوں گا۔'' شیراز بڑے معصومانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ میں نے پتنگ پکڑی۔ فضا میں اچھالی۔ وہ خوشی سے ڈور کو جھٹکے دیتا ہوا پچھلے قدموں جا رہا تھا۔ مگر پتنگ کافی بڑی تھی۔ جو اس سے سنبھالی نہ جا رہی تھی۔ اس لیے وہ نیچے لڑھکتی چلی آئی۔

''او، ہو چاچو یہ تو پھر نیچے چلی آئی۔ ویسے چاچو تم پتنگ اڑا لیتے ہو۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں؟''

''تو پھر تم اڑاؤ نا۔'' اس نے اچھل کر کہا۔

میں نے شیراز کی خواہش پر اس سے ڈور سنبھالی، اسکول کے دور میں ہم پورے پتنگ باز رہ چکے تھے۔ لہٰذا کئی سالوں بعد یہ موقع پھر ہاتھ آیا۔ تو جلد ہی پتنگ فضا میں اڑتی چلی گئی۔ شمال کی طرف کوئی دس بارہ گھر چھوڑ کر وہ اپنی چھت پہ کھڑی اپنے گیلے بالوں کو سکھا رہی تھی۔ میری ایسے ہی ادھر نظر اٹھی تو وہیں ٹھہر سی گئی۔ وہ نازک اندام سی دوشیزہ جھکتے ہوئے جھٹکا دے کر بالوں کو اپنے آگے گراتی تو اس کی دراز زلفیں پھیل کر اس کے گھٹنوں تک پہنچ جاتیں پھر وہ آہستہ سے گردن اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی زلفوں کو اپنے شانے سے گزار کر پیچھے کمر پر پھیلا لیتی۔ وہ کانوں کی لو سے انگلیوں کے ساتھ بالوں کو

سنوارتی۔ یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا۔ تو زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی دھڑکنوں میں ایک ہیجان سا محسوس ہوا۔ بے اختیار میں نے اپنی پتنگ کا رخ اس کی چھت کی طرف موڑ دیا۔ جو آہستہ آہستہ مشرقی کونے سے شمال کی سیدھ میں آنے لگی۔ مجھے ڈور زیادہ دینا پڑ رہی تھی کہ اس کا گھر پتنگ کی پہنچ سے دور تھا۔ جب وہ چھت پر پڑی چارپائی پہ بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ مجھے شعروشاعری سے تو کوئی رغبت نہیں رہی مگر اس لمحے میرا دل شاعری اور گنگنانے کی طرف مچل رہا تھا۔ اس کے بالوں میں سرکتی ہوئی کنگھی مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی مانگ میں کنگھی پھنسا کر دھیرے دھیرے نیچے لاتی۔ اور شانوں پہ بکھری زلفوں کو سنوارتی ہوئی کنگھی اس کی گود میں کہیں جا کر غائب ہو جاتی۔

پتنگ اُس کے روبرو پہنچی تو اس نے چونک کر اوپر دیکھا چند لمحوں تک اس کی گردن اوپر اٹھی رہی۔ پھر وہ سر جھکا کر بال سنوارنے لگی۔ مگر پھر وہ بار بار پتنگ کو دیکھ سا لیتی۔ ادھر میری ڈور ختم ہو رہی تھی ادھر پتنگ اس سے ایک مکان پیچھے تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے پتنگ کو دو تین جھٹکے کرائے۔ بوکاٹا کا انداز اپنایا تو وہ بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اس کی نگاہیں ادھر اُدھر جھانکتی ہوئی سیدھی مجھ پر مرکوز ہوئیں۔ تو میں نے کپکپاتے ہاتھ سے اسے بائے بائے کیا۔ وہ میری اس حرکت پر چونک سی گئی۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ پھر وہ پلٹی چارپائی پہ اس کا گلابی دوپٹہ پڑا تھا۔ جو اس نے اٹھا کر سر پر اوڑھ لیا۔ پھر میری طرف پشت کر کے چارپائی کی آڑ لے کر قدموں کے بل نیچے بیٹھی۔ اور ایک بار پھر کنگھی کرنے لگی۔

نجانے بار بار کنگھی کرنا، بار بار آئینے میں خود کو جھانکنا جوانی کو اتنا اچھا کیوں لگتا ہے۔ مجھے وقت کا



کچھ احساس ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ رہی تھی کہ شیراز نیچے بھاگ گیا تھا۔ میں یہ بھی جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اور تو کوئی اپنی چھت پہ کھڑا میری ان حرکات کو نہیں دیکھ رہا۔ بس وقت کہیں تھم سا گیا تھا۔ اور میں ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اچانک وہ ننگے سر اٹھی۔ اسی حالت میں میری طرف پلٹی۔ پھر مجھے جوں کا توں سامنے کھڑا دیکھ کر ذرا سی جھینپ گئی اب اس نے بالوں کی چٹیا باندھ لی تھی۔ ایک بار پھر اس نے آنچل اوڑھا۔ اپنی گردن موڑتے ہوئے کمر پہ کندھوں کو جھاڑا پھر پاؤں پاؤں چلتے ہوئے کپڑے جھاڑتے ہوئے جیسے وہ چور نگاہوں سے ادھر جھانک رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو مصروف رکھتے ہوئے پہلے سامنے سے قمیض کا دامن ایک ہاتھ سے اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے اُسے جھاڑا۔ پھر پیچھے سے دامن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھٹکے دیے۔ کبھی دائیں کندھے پہ گردن موڑ کر کبھی بائیں طرف صراحی کی سی گردن گھما کر دیکھتی اور کندھوں پہ ہتھیلیوں سے نا جانے کیا سمیٹ کر نیچے پھینکتی۔ پھر اس نے میری طرف بایاں رخ کر کے دونوں ہاتھوں سے آنچل کو دائیں بائیں لہرا کر اس کا ایک سرا سامنے لٹکنے دیا۔ اور دوسرا سرا ٹھوڑی کے نیچے سے گزار کر کندھے سے پیچھے اچھال دیا۔ اس کی کلائی میں بجی چوڑیاں تھیں۔ اب وہ نیچے جا رہی تھی۔ چھت کے اطراف میں گیلری تو تھی نہیں۔ تین چار کمروں کی چھتیں لمبائی میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ درمیانے حصے تک ٹہلنے کے انداز میں پتنگ کو جھانکتی ہوئی پہنچی۔ پھر شاید سیڑھیوں کی طرف مڑی۔ وہ جیسے جیسے زینے نیچے اتر رہی تھی۔ میرا دل ویسے ویسے ڈوبتا جا رہا تھا۔ جب وہ کندھوں تک اوٹ میں چلی گئی تو اس نے وہیں سے پلٹ کر نا جانے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ یا پتنگ کی طرف نظر ڈالی تھی۔ اور پھر وہ جیسے کسی کنویں میں اترتی چلی گئی۔

میں پتنگ کی ڈور سمیٹ رہا تھا اور یاس حیرت بھری نظروں سے اُدھر جھانک رہا تھا۔ جہاں کی ساری فضا ہی ویرانی اور اداسی میں ڈوب گئی تھی۔ ڈور سمیٹتے سمیٹتے پتنگ کو میرے پاس لے آئی۔ جانے کیوں میں نے جھک کر پتنگ کو سینے سے لگا لیا۔ کیونکہ جس ہستی کو اتنی دور سے دیکھ کر میں اپنا سب کچھ ہار بیٹھا تھا یہ کاغذ کا ٹکڑا اس کے قریب سے ہو کر آیا تھا۔ اس کی خوشبو کو پتنگ اپنے ساتھ سمیٹ لائی تھی۔ پتنگ کو میں نے گیلری کی دیوار پہ رکھا۔ اور ڈور کی ڈھیری بنانے لگا۔ مگر میری بے تاب نگاہیں ادھر جھانکتے رہنے پر مجھے مجبور کیے دے رہی تھیں۔

شیراز اوپر آیا اور پتنگ کو پھر سے اڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اسے بہانہ بنائے چھت پہ ہی کھڑا تھا۔ کوئی بیس منٹ کا عرصہ گزرا کہ وہ پھر چھت پر نمودار ہوئی تو جیسے مجھے قارون کا خزانہ مل گیا۔ میری دھڑکنیں پھر بے ترتیب ہو کر مجھے اندر سے جھنجھوڑنے لگیں۔ اس کی نگاہیں سیدھی ہماری طرف اٹھ رہی تھیں اس نے شاید مجھے متوجہ کرنے کے لیے آنچل پھیلایا۔ دائیں بائیں اپنی بانہوں کو پھیلا کر پھر سے آنچل کا ایک سرا سامنے اور دوسرا کمر پر اچھالا۔ اور نا جانے جھک کر کیا کام کرنے لگی۔ پھر چلتی ہوئی جہاں چارپائی رکھی تھی وہاں تک گئی۔ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ دیر خلاؤں میں جھانکتی رہی۔ جیسے اور کوئی کام نہ ہو بس چھت پہ رہنا ہی سب سے بڑا کام ہو۔ نا جانے محبت کے پہلے لمحے سے بے چینی کیوں شروع ہو جاتی ہے۔ جو آخری سانس تک جان نہیں چھوڑتی۔ محبت نہ ہوئی کوئی اضطراب ہوا۔ محبت کہنے سے نہیں ہو جاتی نا ہی کرنے سے ہوتی ہے۔ بس ایویں ہی ہو جاتی ہے۔ کوئی اس اضطراب بھری محبت کا کیا کرے۔ اب وہ چارپائی کے ایک طرف والے دونوں پائے اٹھا کر پاؤں سے اُسے جھٹکے مار مار کر شاید اس پر جمی گرد کو جھاڑ رہی تھی پھر اسے دوبارہ چھت پہ ڈالا میں محویت سے اسے جھانک رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی اشارہ بے شک نہ کرے بس اسی طرح چھت پہ موجود رہے اور عمر تمام ہو جائے۔

اب وہ ہاتھ پہ کلائی رکھے جیسے دور کسی کو اُدھر پہنچانے کی کوشش کر رہی ہو مگر اس طرف تو دور دور تک کوئی بھی نہ تھا۔ ہر سو تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں کسی کے پالتو کبوتر اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے

میرا بھتیجا پتنگ اڑانے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں آزما رہا تھا۔ باقی میری نگاہ میں ساری کائنات کا نظام ساکت ہو چکا تھا۔ وقت نے رک کر گہری سانسیں لینا شروع کر دی تھیں۔

اب وہ پھر نیچے جانے والی سمت کی طرف جیسے خود کو دھکیلتے ہوئے جا رہی تھی پہلے زینے پہ رکی ہلکی سی گردن موڑی، چوڑیوں سے سجی کلائی فضا میں اٹھا کر ہلائی اور تیزی سے نیچے اتر گئی۔ مجھے لگا جیسے میری سانسیں سینے سے حلق میں آ کر ٹھہر گئی ہیں۔ پلکیں ساکت اور دل کی دھڑکن کچھ وقت کے لیے تھم سی گئی ہے۔ اور پھر تو جیسے میں فضاؤں میں اڑتے کبوتروں کے ساتھ اڑنے لگا۔ کتنا عرصہ میں نے وہیں گزار دیا پورا دن عجیب سی کیفیت میں بسر ہوا۔ رات سپنوں میں بسر ہو گئی۔ سنا تھا بیماروں اور غم کے ماروں کو نیند نہیں آتی لیکن مجھے تو خوشی سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کسی کروٹ دل کو چین نہیں مل رہا تھا۔ بھلا اس اضطراب کو محبت کہا جا سکتا ہے۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی تو دھڑکنوں کا نیٹ ورک پھر سے وہاں جا جڑا ہے۔ جہاں سے رات کو ٹوٹا تھا۔ کچھ لمحے اک حسین سے تصور میں بیتے۔ ایک ہی خواہش مچل رہی تھی کہ فوراً چھت پر پہنچو۔ میں سب کو بھول گیا تھا بس اپنی محبت کا منظر یاد تھا۔ نہا کر خود کو تازہ دم کیا۔ ناشتے کے لقمے حلق میں دھکیلے۔ بھابی چائے لے آئی تو حیرت سے پوچھا۔

''آج بہت جلدی تیار ہو گئے کہیں جا رہے ہو کیا؟''

''ن..... نہیں تو.....'' میں نے کچھ ہچکچا کر کہا۔

''شاید امی جان آج خالہ فیروزہ کے ہاں جائیں۔'' بھابی نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں امی جان سے مل لیتا ہوں۔ اگر ان کا پروگرام ہوا تو میں لے جاؤں گا انہیں۔'' میں نے چائے کے گرم گرم گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور پھر چائے کی آخری چسکی لے کر بالوں کو سنوارتا دو دو زینے پھلانگتے ہوئے چھت پر پہنچا۔ اجلی اجلی دھوپ ہر سو بکھری تھی۔ بے قرار نگاہیں ادھر آئیں تو وہاں ویران چھتوں پر اداسی بکھری تھی۔ ایک آہ سی لبوں سے پھسل گئی۔ میں ٹہلنے کے انداز میں چھت پر شرقی جانب گلی تک چلا گیا۔ گلی میں جھانکا تو میرا دوست عمیر اپنی بائیک لیے گلی میں آتا دکھائی دیا۔ وہ مجھ سے ہی ملنے آ رہا تھا۔ میں نے اسے ہلکی سی آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اس نے بائیک کی رفتار کم کر دی۔ اور ادھر ادھر جھانکا۔

''اوپر دیکھ میری جان اوپر۔'' میں نے پھر سے پکار کر کہا۔ اس نے اوپر جھانکا تو مسکرا کر بائیک روکی اور ہیلمٹ اتار کر شرارت سے پوچھا۔

''یار! چھت پر کیا ہو رہا ہے بھائی۔ خیریت تو ہے نا......؟''

''ہاں ہاں۔ سب خیریت ہے۔ تم آؤ میں بیٹھک کھلواتا ہوں۔'' میں نے اسے کہا اور تیزی سے پلٹا۔ اچانک نگاہیں ادھر اٹھیں تو وہ پوری سج دھج سے اپنی چھت پر موجود تھی۔ اور دونوں ہاتھ شانوں پر رکھے میری ہی طرف متوجہ تھی۔ میں چونک کر رکا ہلکی سی سر کو جنبش دی اس نے بھی مسکرا کر ہلکا سا گردن کو خم کیا۔ دھڑکنوں میں طلاطم برپا ہوا سانس پھول سی گئی۔ بے اختیار ہو کر مشرق کی طرف رخ کر کے اپنی انگلی کو نیچے سے اوپر آسمان کی طرف اٹھا کر اشارہ دیا پھر مغرب کی طرف آسمان سے نیچے کی طرف انگلی لہرائی اور ساتھ ہی اپنے قدموں کی طرف انگلی لے جا کر اسے بتایا کہ صبح سورج طلوع ہونے اور شام کو غروب ہونے تک میں یہاں ہوں گا۔ تم بھی اس وقت آ جایا کرنا۔ مگر اس نے مسکرا کر انکار میں گردن ہلا دی۔ تب مجھے ٹھیس سی لگی۔ کچھ لمحے بس ایک دوسرے کو دیکھتے گزر گئے۔ پھر وہ دو قدم پیچھے پلٹ گئی۔ پھر میری طرف آتے ہوئے یکا یک سر اٹھایا۔ اور مشرق افق سے انگلی اٹھا کر اپنے سر کی سیدھ میں اوپر پہنچائی کہ دوپہر بارہ بجے کا وقت یہاں گزارنا بہت بہتر رہے گا۔ چلو اس نے مان تو لیا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی تو اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ ایسے میں چھوٹی روبی بھاگتی ہوئی اوپر پہنچی۔

''انکل آپ کے دوست بلا رہے ہیں نیچے۔''

نے بتایا تو مجھے یاد آیا کہ عمیر تو نیچے میرا منتظر بیٹھا ہے۔ میں نے اسے ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہا وہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مجھے نیچے بلایا گیا ہے۔ جواب میں اس نے اپنی انگلیاں ٹھوڑی تک آہستہ سے ملائیں اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں زینہ پھلانگتا گیا اور وہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔

☆☆☆

شام سے کچھ پہلے میں اپنی بائیک پر شہر سے لوٹا تو اس کی گلی سے گزرا اس کا مکان پہچاننے میں مجھے ذرا دیر نہ لگی اونچی چار دیواری اور بڑا سا گیٹ جس سے ملحقہ جالی دار دروازے والی بیٹھک شیشے کی ونڈو سے اندر لٹکتا ہوا پھولدار پردہ گیٹ سے ذرا آگے شیشم کا پیڑ جس کے نیچے بھینس بندھی تھی۔ گلی میں اینٹوں سولنگ لگا تھا۔ میں نے گیٹ سے جھانکا نیم وا کواڑ سے کچھ دکھائی نہ دیا گلی کے کارنر پر چون کی دکان تھی میں نے گلی موڑتے ہوئے پیچھے جھانک کر دیکھا سب کچھ تھا بس وہ دکھائی نہ دے رہی تھی۔

اگلے روز دوپہر کو میں یوں چھت پر جا رہا تھا کہ جیسے میں چھت پر نہ پہنچا تو نا جانے کیا ہو جائے گا۔ دھوپ میں تمازت تھی۔

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا ننگے پاؤں کوٹھے پہ آنا یاد ہے

میں نے چھت پر وقت گزاری کے لیے اخبار جہاں کا تازہ شمارہ ہاتھ میں تھام رکھا تھا اوپر پہنچا تو وہ نہ تھی۔ میں نے ایک جگہ منڈیر کے قریب منتخب کی اور پاؤں سمیٹ کر بیٹھا رہا۔ میگزین کی ورق گردانی بھی کرتا رہا اور اِدھر اُدھر جھانکتا بھی رہا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس چھت پر نمودار ہوئی اور مجھے سامنے پا کر گلاب کی طرح کھل گئی۔ پھر میری سیدھ میں چھت پر بیٹھ گئی۔ شاید اس کے ہاتھ میں اخبار کا ورق تھا سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ مزاج پوچھا اور بیٹھ رہی۔ پھر اس نے اشارے سے پوچھا۔ کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے میگزین کا سرورق جس پر ایک دوشیزہ کی بڑی سی تصویر سجی تھی اس کا رخ اِدھر کر کے اسے دکھایا کہ یہ میگزین ہے۔ وہ اپنے اخبار ہی سے کبھی خود پنکھا جھلانے لگتی۔ کبھی اخبار سر پر تھام لیتی کبھی گود میں اور کبھی ہاتھ میں پکڑ کر اشارے سے بات کرتی۔ پتا نہیں محبت اشاروں کی زبان کیسے سمجھ لیتی ہے۔ ہم ایسے اشارے کنایوں میں ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے جیسے پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔

اب وہ اپنے ماتھے پہ ہتھیلی کا رخ نیچے کیے اور دونوں ہاتھوں سے ڈھول بجانے کا اشارہ کر کے پوچھ رہی تھی کہ سہرا سجالیا ہے کہ ابھی نہیں۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا کہ ابھی نہیں تو وہ زور سے ہنس دی۔ پھر جب میں نے اس کی طرف اور پھر اپنی طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں کی شہادت انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اسے بتایا کہ میں تو تم سے بیاہ کروں گا تو گھٹنوں میں سر چھپا کر کتنی دیر لجاتی رہی شرماتی رہی اور کھکھلاتی رہی۔ پھر شہادت کی انگلی مٹھی بند کر کے میری طرف زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔ بہت شریر ہو تم۔ پھر میں نے میگزین سے ایک دوشیزہ کی تصویر جس نے بالوں میں گلاب سجایا ہوا تھا نکال کر اسے دکھائی اور پھول پہ انگلی رکھ کر پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے فوری انگوٹھا اور انگلی جوڑ کر اپنے ناک کے قریب کر کے مجھے بتایا کہ یہ سونگھنے والا پھول ہے۔ تب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے کی آخری پور آپس میں جوڑ کر اس کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے اسے گلاب کا پھول پیش کیا ہو۔ اس نے بھی تقلید کی اور ہاتھ بڑھا کر مجھ سے پھول وصول کیا۔ اور اپنا آنچل ہٹا کر اپنے بالوں میں چٹکی بھری۔ جیسے پھول ٹانکا ہو۔ پھر ہتھیلی پھیلا کر کہا کہ لو اب تو راضی ہو۔ ہاں میں نے گردن ہلا کر کہا تو وہ پھر شرما کر گھٹنوں میں سر دبا گئی۔ وہ اپنے گھٹنوں کو اپنی بانہوں کے دائرے میں لیے بیٹھی تھی۔ اور اُس کا شرما کر گھٹنوں میں سر دبانے کا انداز اتنا دلکش تھا اور حسین بھی کہ وہ یونہی بیٹھی رہے اور میری جوانی کی دوپہر کٹ جائے۔ وہ قربت کے پر کیف لمحات۔ وہ خوش کن گھڑیاں، وہ شباب کی ترنگ وہ وصل بھرے پل۔ وہ جذبوں کی نزاکت۔ وہ دلفریب ادائیں سب کچھ ایک حسین

خواب کی طرح تھا۔

☆☆☆

اگلے روز میں شہر سے دوربین لے آیا اور جب اس میں اس کا چہرہ فوکس کر کے دیکھا تو اپنے مقدر پر فخر کرنے کو جی چاہا۔ بہت معصوم سا چہرہ، بہت خوبصورت خدوخال کمان سی بھنوؤں کے نیچے بولتی آنکھیں پلکوں کی لمبی سی جھالریں۔ جب جھپکتیں تو وقت کی نبضیں تھم سی جاتیں اوپر والے ہونٹ کی بائیں کنارے پر ننھا سا تل، کشادہ جبیں پہ دائرے سے لپٹی زلف، کانوں میں سجے ٹاپس اور ہونٹوں کی گلابی رنگت مل کر جیسے جشن بہاراں منا رہے ہوں۔ وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے مجھے محویت سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ماتھے پر ہلکی سی تیوری چڑھا کر جیسے مجھے کہا کہ اب بس بھی کرو۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کہا کہ اب دوربین مجھے دو تاکہ میں بھی آپ کو دیکھ لوں، آپ نے تو مجھے دیکھ لیا۔ اب میں کیا کروں گی۔ میں نے اسے کھڑے ہو کر بائیک چلانے کا اشارہ کیا کہ میں دوربین لے کر تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ دروازے پر آ کر لے لینا تو اس نے شہادت کی دونوں انگلیاں زبان پر لگا کر کانوں کو لگالیں اور ہاتھ باندھ کر مجھے معاف کرنے کا اشارہ کیا۔ اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں نیچے اتر گئی جیسے اُسے آواز دے کر بلایا گیا ہو۔ میں بھی اس کے حسین تصور میں ڈوبا کچھ دیر بعد نیچے چلا آیا۔

''عرفان بیٹا! تم اتنا وقت کوٹھے پر کیا کرتے رہتے ہو۔'' امی جان نے اچانک غیر متوقع پوچھا تو میں سر سے پاؤں تک لرز سا گیا۔

''ک..... کچھ نہیں امی جان! بس منڈیر پر بیٹھ کر دور کھڑی فصلیں، اڑتے پرندے اور درختوں کے جھنڈ دوربین لگا کر دیکھتا رہتا ہوں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔'' اس بیری محبت کی خاطر ماں سے پہلی بار جھوٹ بولنا پڑا۔

''نہیں بیٹا..... ہر روز تو ایسا کرنا اچھا نہیں لگتا نا۔ اڑوس پڑوس محلے دار تمہیں چھت پر دوربین لگائے روز دیکھتے ہوں گے تو کیا خیال کرتے ہوں گے ہمارے متعلق۔ ہم دیہات میں رہنے والے لوگ ہیں بیٹا۔ بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہو جائیں گی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ سارا گاؤں ہماری عزت کرتا ہے۔ نا بیٹا آئندہ بلا مقصد چھت پر نا جانا۔''

امی جان نے بہت ساری نصیحت کے بعد مجھ پر پابندی عائد کر دی۔ میری معصوم محبت کی راہ میں سماج کی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ میں چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔ بھابی جان معنی خیز انداز میں مسکراتی بھی رہیں اور گھر کے کام کاج بھی سرانجام دیتی رہیں۔

جی چاہ رہا تھا بھاگ کر چھت پر پہنچ جاؤں اور اپنی اس منتظر بے نام محبت کو پکار پکار کر کہہ دوں کہ اب میں کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ میرا انتظار نا کرنا۔ میرے لبوں سے سرد سی آہ نکل گئی۔ اور بے اختیار رو دینے کو جی چاہا۔ ساری دوپہر کمرے میں کٹ گئی اور وہ چھت پر نا جانے کس کیفیت سے گزر رہی تھی۔

☆☆☆

عمیر ملنے آیا تو مجھے اداس اور پریشان دیکھ کر اس کیفیت کا سبب پوچھنے لگا۔ بالآخر مجھے تمام صورت حال سے آگاہ کرنا پڑا۔

''کون سی گلی میں گھر ہے ان کا۔'' عمیر نے پوچھا۔

''منیر جنرل اسٹور والی گلی میں۔'' میں نے بتایا تو عمیر چونک پڑا۔

''ارے اس گلی میں تو میری پھوپو کا گھر ہے۔ بس ہم ابھی وہاں چلتے ہیں۔ شہزاد میرا پھوپو زاد بھائی ہے۔ وہ ہمیں ان کا تعارف کروا دے گا۔ یہ کون سی پریشانی والی بات ہے۔'' عمیر نے مجھے ڈھارس دی تو انجانی سی خوشی میں کھل اٹھا۔

پھر ذرا دیر بعد عمیر مجھے بائیک پر لیے اس گلی میں پہنچا جو مجھے ساری گلیوں سے زیادہ حسین اور اپنی اپنی سی لگی۔

دائیں طرف عمیر نے جس دکان پہ بائیک روکی اس سے کوئی تین چار گھر چھوڑ کر بائیں جانب اس کا گھر تھا۔ جس کے اجنبی میں نام سے بھی نا آشنا تھا۔ وہ جلدی سے اندر گیا۔ اور بیٹھک کا دروازہ کھلوایا۔ جب

تک میں جانی پہچانی چھت والے گھر کے دروازے اور اس کے در و دیوار کو انہماک سے دیکھتا رہا۔ عمیر کا پھوپوزاد بھائی شہزاد نہم کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ ذرا دیر بعد ہمارے لیے چائے لے آیا۔ تب تک میں مطلوبہ مکان کا حوالہ عمیر کو دے چکا تھا۔

''شہزاد یار! یہ تمہاری گلی میں بائیں طرف مشرق کی طرف ٹاہلی والا مکان کس کا ہے؟'' عمیر نے شہزاد سے پوچھا۔

''وہ جس کے باہر بھینس بندھی ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''وہ تو چاچے فضل دین کا گھر ہے۔ کوئی کام ہے ان سے۔؟''

''ن نن...... نہیں تو...... بس ویسے ہی پوچھ رہے تھے۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش میں کہا۔

''کیا نام ہے اس کے بیٹے کا؟'' عمیر نے پوچھا۔

''بڑے کا نام مشتاق علی ہے اور اس سے چھوٹے کا اشتیاق علی ہے جو میرے ساتھ اسکول میں پڑھتا ہے۔ کاشف اور آصف ابھی چھوٹے ہیں۔''

''ہوں!'' عمیر نے اپنی ہوں کو حیرت سے کھینچ کر سر ہلایا۔

''بس وہ چار بھائی ہی ہیں۔'' عمیر نے بڑا چبھتا سوال کیا اور میری جان پر بن آئی۔

''نہیں ان کی دو بہنیں بھی ہیں۔ بڑی نے تو اب اسکول چھوڑ دیا ہے جبکہ چھوٹی چھٹی میں پڑھتی ہے۔'' شہزاد نے گھر بھر کے افراد کا تعارف تفصیل سے کروایا۔ بس اب نام کا مسئلہ باقی تھا۔ عمیر نے وہ بھی پوچھ لیا۔

''بڑی نے اسکول کیوں چھوڑ دیا۔''

''میٹرک میں اس کی انگلش رہ گئی تھی۔ پھر پرائیویٹ بھی امتحان دیا مگر پھر کمپارٹ آ گئی۔ تو امبر کو گھر بٹھا لیا گیا۔'' شہزاد نے امبر کا نام بتا کر ہماری بہت بڑی مشکل حل کر دی۔ پھر عمیر نے اسے برتن دے کر گھر بھیج دیا۔

''جی جناب امبر کے گھر کا تعارف حاصل ہو گیا۔''

''ہاں یار بڑی مہربانی تمہاری۔ تم نے بڑی چابکدستی سے معلومات حاصل کیں۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا خیال ہے اب چلیں۔''

''ہاں یہ کہہ کر ہم دونوں ایک ساتھ باہر گلی میں آ گئے۔ میری نگاہیں بے اختیار ادھر اٹھ گئیں۔ ارے میں چونک گیا۔ وہ وہی تھی۔ جو دروازے سے نکل کر بھینس کے پاس دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے کھڑی تھی۔ دو بچے اس کے قریب گیند سے کھیل رہے تھے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اسے صاف پہچان لیا۔

''ارے! کہیں وہ امبر ہی تو نہیں کھڑی؟'' عمیر نے مجھے ٹہوکا دے کر دھیرے سے پوچھا۔ میں نے اقرار میں ہلکے سے ہاں کہی۔ ادھر امبر کی نگاہ ہم پر اٹھی۔ اس نے چونک کر دوبارہ بغور مجھے دیکھا میں مسکرا دیا تو وہ حیرانی سے کچھ گڑبڑا سی گئی۔ عمیر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا اور اُدھر امبر تیزی سے پلٹ کر اپنے دروازے تک پہنچی جلدی سے ایک نگاہ ہماری طرف پھینکی اور اندر چل پڑی۔ اگر اس نے مجھے پہچان لیا تھا تو پھر اس نے بھاگ کر اندر جانے میں کیوں جلدی کی۔ اگر نہیں پہچانا تو بھی اس کی کیفیت میں بے چینی پیا نہیں ہونا چاہیے تھی۔ یا شاید اس نے مجھے پہچان کر مجھ سے ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ کہ آج تم چھت پر کیوں نہیں آئے؟ کچھ نا کچھ تو ہوا ہے۔ میں گھر تک انہی سوچوں میں گھرا رہا۔ مگر اب چھت پر جانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

یہ پچھلے چند روز سے جو کچھ میرے ساتھ بیت رہا تھا۔ یہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اور غیر ارادی طور پر ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں کمرے میں تنہا لیٹا سوچ رہا تھا کہیں میں بھی اپنی بستی کے ایک نوجوان ناصر کی طرح محبت کے بہاؤ میں تو نہیں آ گیا ہوں اور اب بے سمت بہے چلا جا رہا ہوں۔ ناصر نے بھی گاؤں کی ایک دوشیزہ سے محبت کے پیمان باندھے تھے۔ اسے اپنانے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر سماجی دیواریں ان کی راہ میں حائل ہو گئیں۔ ناصر کے اہل خانہ ہی اس کے دشمن بن گئے۔ لڑکی کے ورثاء غیرت کی آگ میں جل اٹھے

اور جب ہنگامی بنیادوں پر لڑکی کو بیاہنا چاہا۔ تو اس نے ناصر کے ساتھ راہ فرار اختیار کو فوقیت دی۔ اندھی محبت کی پٹی باندھ کر وہ فرار ہوگئے۔ کورٹ میرج کی۔ مگر تین ماہ بعد ہی لڑکی کے بھائیوں نے ان کو تلاش کرلیا۔ اور گولیوں سے اڑا دیا۔ دو گھر اجڑ گئے۔ دو خاندان برباد ہوگئے۔ اس بیری محبت نے اسی لیے مجھ پر پابندی عائد کردی تھی کہ میں چھت پر رہ کر اتنا وقت گزارتا ہوں۔ کہیں میں بھی جوانی کے نشے میں رہ کر نہ بھٹک جاؤں۔ واقعی محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ میں کیسے بے خوف و خطر ننگی چھت پہ کھڑا ہو کر پہروں اُس سے اشارے کنایوں میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ ناجانے کس کس نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ میرے اور میرے گھر والوں کے متعلق اس نے کیا کیا رائے قائم کی ہوگی۔

نا بابا میری توبہ...... اچھا ہوا ابھی امبر سے ملاقات نہیں کی۔ ورنہ شاید ہماری واپسی بھی ناممکن ہوجاتی۔ میں نے امبر کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اگلے چند روز تک میری کیفیت کچھ عجیب سی رہی۔ امبر کا خیال کئی بار آتا۔ کچھ لمحوں کے لیے میں کھوسا جاتا پھر جلد ہی میں اپنی حالت پر قابو پالیتا۔ پھر نا تو میں نے امبر کو کبھی ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہ کبھی میرے روبرو آئی۔

☆☆☆

شہر میں مجھے ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب مل گئی۔ ساتھ ساتھ میں بی ایس کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران ابو کے ملنے والے کی وساطت سے مجھے جرمنی جانے کا چانس مل گیا۔ گھر کا سب کچھ داؤ پر لگا کر میں دیار غیر روانہ ہوگیا۔ جس دن میری روانگی تھی۔ گھر میں ایک شادی کا سماں تھا جانے کیوں میں جانے سے پہلے خود کو چھت پر جانے سے نا روک سکا۔ کئی مہینوں بعد چھت پر جا رہا تھا تو جانے کیوں امبر کی یاد بڑی شدت سے بے چین کرنے لگی۔

میں چھت پر پہنچا۔ میری بے چین نگاہیں پل بھر میں وہاں جا کر اتریں جہاں روز امبر کو دیکھا کرتی تھیں۔ مگر اب وہاں ایک ویرانی سی برس رہی تھی۔ خاموشی اور اداسی کا راج تھا۔ میرا دل بجھ سا گیا۔ ذرا دیر میں وہاں سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا پھر بوجھل قدموں سے سرد آہ فضا میں چھوڑ کر میں نم سی آنکھیں لیے نیچے اترتا چلا گیا۔ پھر اسی چھت، اسی بستی اور اس ملک سے بھی بچھڑ کر میں سات سمندر پار دیار غیر میں جا اُترا۔ وہاں کے مصروف شب و روز نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا مگر اکثر کسی کی یاد مجھے بے قرار کرجاتی۔

☆☆☆

پانچ سال گزر گئے۔ ان پانچ سالوں میں چھپے میرے شب و روز کے ایک ایک لمحے کا حساب گننا بہت مشکل ہے۔ اپنے وطن میں عزت کی زندگی گزارنے کی تمنا میں پردیس کی ذلت بھری زندگی گزارنا کتنا اذیت ناک ہے۔ یہ صرف وہ جان سکتے ہیں جو اپنوں سے دور اجنبی فضاؤں، اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں زندگیاں بسر کرتے ہیں۔

میں بھی جب پانچ برس بعد لوٹ کر وطن واپس آیا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ گاؤں کی فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ عمیر نے بتایا کہ تمہارے جانے کے ایک سال بعد ہی امبر اپنے پیا کے سنگ اپنی نئی دنیا میں جا بسی۔ دل پر ایک گہری چوٹ سی پڑی چھت پہ جانے کو جی ہی نا چاہا۔

تین ماہ کے لیے آیا تھا اچانک میری شادی کا پروگرام طے پا گیا۔ لڑکی کے بھائی انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی کا ان سے پرانا دوستانہ تھا۔ ویسے وہ ہماری غیر برادری تھی۔ بھائی انگلینڈ جانے سے پہلے بہن کا فرض ادا کرکے لوٹنا چاہتے تھے۔ میرے مقدر میں یہ سب کچھ لکھا تھا اسی لیے آنا فانا رشتہ طے پا گیا۔ زور وشور سے تیاری شروع ہوئی اور انیتا میری شریک سفر بن کر میری زندگی میں داخل ہوگئی۔

وہ ایک پڑھی لکھی اور سوجھ بوجھ والی لڑکی تھی۔ دلکش خدوخال اور خوبصورت شخصیت کی مالکہ انیتا سے پہلی ملاقات ہوئی۔ تو میں نے اسے دل و جان سے

پسند کیا۔ وہ امبر سے زیادہ حسین تو نا تھی یا شاید میرے دل میں اس سے زیادہ امبر کی صورت رچ بس گئی تھی یورپ میں بھی کئی لڑکیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ مگر امبر کا بدل کوئی نہ مل سکی۔ شاید میں اس لیے کسی کی طرف مائل نہ ہوا۔ اب انیتا کا قرب ملا تو اسے من میں بسا لینے کو جی چاہا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے گھل مل سی گئی۔ اور بے تکلفانہ انداز میں یہ تک پوچھ ڈالا کہ عرفان! تم نے کسی سے محبت کی۔ میرا مطلب ہے تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی آئی جس سے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟''

''بس دور دور سے کسی کو پسند کی نگاہ سے دیکھا تھا مگر نا تو اس سے بات ہو سکی اور نا ہی پھر وہ کبھی دکھائی دی۔'' میں نے بتایا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''او...... اچھا...... کہیں رستے میں ملی ہوگی۔ جو پھر دوبارہ نہ مل سکی۔ چلو اس سے بات کر لیتے۔ ممکن ہے اس بے چاری کو پتا ہی نہ چلا ہو کہ کوئی اس سے متاثر ہو کر اسے پسند کرنے لگا ہے۔'' انیتا نے شوخ لہجے میں کہا تو میرے اندر سے ایک ہوک سی اٹھی اور اندر ہی اندر کہیں دم توڑ گئی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یورپ میں تو حسن گلیوں بازاروں میں بکھرا ہوتا ہے۔ وہاں بھی کسی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا؟'' جانے انیتا مجھ سے کیا اگلوانا چاہتی تھی۔

''نہیں انیتا! گوریوں کے حسن نے کبھی مجھے متاثر نہیں کیا۔ ان کی بے تکلفی ان کا عریاں پن سرعام گناہ کی دعوت بہت گراں گزرتا تھا۔ مجھے ان کے وجود سے عجیب ہی ناگوار مہک آتی تو مجھے ان سے گھن سی ہونے لگتی۔ اور پھر میں تو دن رات اپنی مشقت میں ہی مست رہتا تھا۔'' میں نے بے زاری سے جواب دیا۔

''ویسے مجھے بھی یورپین زندگی کچھ پسند نہیں۔ سیر سپاٹے کے لیے تو ضرور جانا چاہیے مگر وہاں کی شہریت حاصل کرنا اور دیارِ غیر میں رہ کر زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر چونکہ آپ کے روزگار کا تعلق وہاں سے ہے اور آپ کے بنا تو میں یہاں تنہا نہیں رہ سکوں گی نا۔'' انیتا نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں چونک سا گیا۔ کیونکہ میں نے تو اسے ساتھ لے جانے کا بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

''ابھی فوری تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ کچھ عرصہ تو تمہیں میرے بن گزارنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں وہ تو میں جانتی ہوں۔ میرے بھائی انگلینڈ میں سیٹل ہیں۔ وہاں کی رکنیت حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر تمہیں جلد سے جلد مجھے اپنے پاس بلانا ہوگا۔'' انیتا نے بھرپور محبت بھرے جذبات سے کہا تو میں نے اسے جلد سے جلد اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔

بعض اوقات محبت کا ایک قطرہ انسان کو اتنا حوصلہ دے جاتا ہے کہ وہ پہاڑ سے ٹکرانے پر بھی عزم کر لیتا ہے اور بسا اوقات دل شکن بات تمام حوصلوں کو بھی پست کر کے رکھ دیتی ہے۔ محبت کا اظہار ہو رہا ہے تو ناممکن بھی ممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔ انیتا کی محبت بھری بات کہ تمہیں جلد از جلد مجھے اپنے پاس بلانا ہوگا نے مجھے ایک بہت بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ انیتا سے ایک ماہ کی قربت نے مجھے اس کا دیوانہ سا کر دیا۔ پل بھر کی جدائی کا تصور بھی بے چین کر دیتا۔ یہ ایک ماہ کا عرصہ ہم نے دوستوں عزیزوں سے دعوتیں کھانے اور سیر و تفریح میں گزار دیا۔

پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب لاہور ائیر پورٹ پر انیتا پرنم آنکھوں سے مجھے خدا حافظ کہہ رہی تھی، اور دیوہیکل برٹش ایئر لائنز کا بوئنگ طیارہ میرے وجود کو سمیٹ کر اس سے ہزاروں میل دور لے جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ امیگریشن آفس میں داخل ہوتے وقت انیتا سب کے سامنے مجھ سے لپٹ کر ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ بمشکل اسے خود سے الگ کیا اور سیلابی آنکھوں سے چہرہ جھکائے بوجھل قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔

پھر جرمنی تک کا سفر بڑی اذیت سے گزرا۔ وہاں خود کو کام میں مصروف کر دیا۔ مگر خیالوں میں اسی کا تصور، اسی کا حسین سراپا، اسی کے قہقہے اور آخری لمحوں میں ائیر پورٹ کا منظر لمحے بھر کو بھی مجھے کچھ اور نہ سوچنے دیتا۔ میرے بعد وہ اپنے میکے میں رہ رہی تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار میرے اہل خانہ کو ملنے

چلی آتی۔ پھر اسی روز لوٹ جاتی ہر روز مجھے کال کرتی۔ میرے امی ابو بھائیوں اور بھابی نے دبے لفظوں میں مجھے فون پہ کہا ہم انیتا کو یہاں اپنے گھر رہنے کو کیوں نہیں کہتے۔ وہ غیروں کی طرح آتی ہے سب سے رسمی سا ملتی ہے اور اسی روز لوٹ جاتی ہے۔ امی اور بھابی جان اسے رکنے کا کہتی ہیں تو اس نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا۔ پھر صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ عرفان کے بغیر میں ایک دن بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ جب وہ لوٹ آئے گا تو میں بھی آ جاؤں گی۔ اس لیے پلیز آپ مجھے مجبور نا کریں۔'' انیتا کی اس بات پر مجھے قلق سا پہنچا۔

''انیتا! تمھیں امی جان اور بھابی سے اس طرح بے رخی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ آخر وہ ہمارا گھر ہے۔ اس گھرانے کے سبھی لوگ ہمارے اپنے ہیں۔ چلو ہفتے بعد آ کر اپنے والدین سے مل جایا کرو۔ ایک دو دن یہاں گزارا لیا کرو۔ تمھیں تو سب کا دل جیتنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا کرنے سے سب کے دل میں تمہارے لیے کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہو رہا۔'' میں نے فون پر انیتا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''عرفان میں کیا کروں۔ پورا گھر مجھے تمہارے بنا سونا سونا لگتا ہے۔ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لیے میں وہاں نہیں ٹھہر سکتی باقی میں سب سے محبت سے پیش آتی ہوں۔ میرے دل میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ سب لوگ میرے لیے قابل احترام ہیں۔ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ میں بھی ہمیشہ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہارا وہاں رہنا تمہارے لیے زیادہ باعث عزت ہے۔ ایک دو دن تمھیں ایسا لگے گا پھر تم مانوس ہو جاؤ گی۔ میرے پاس آنے میں تو تمھیں ابھی کئی ماہ لگ سکتے ہیں۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ تمھیں فوری اپنے پاس بلاؤں مگر میرے کچھ اختیار میں نہیں ہے نا! پلیز انیتا! تم آج ہی گھر چلی جاؤ اور خود کو وہاں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اسے قائل کرنا چاہا۔

''ٹھیک ہے عرفان! میں کل تک چلی جاؤں گی اور کوشش کروں گی کہ تمہاری اس خواہش کو پورے طور پر نبھا سکوں۔'' انیتا نے کچھ سنجیدگی سے کہا اور کال ڈراپ ہو گئی۔ پھر اگلے روز انیتا کو اس کا بھائی چھوڑ آیا۔ سب گھر والے اس کے اس فیصلے پر خوش ہو گئے۔

☆☆☆

دن میں ایک آدھ بار انیتا سے فون پر بات ہو جاتی اس نے خود کو یہاں کے ماحول میں ڈھالنے کی یا تو کوشش نہ کی یا شاید اس کا ارادہ ہی یہاں رہنے کا نہ تھا۔ دن بھر کمرے میں بند رہتی میوزک سنتی رہتی۔ گھر کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہ دکھاتی۔ خاموش اور سنجیدہ رہنا۔ اپنے کمرے میں تنہا ہی پڑے رہنا۔ جلد ہی گھر والے اس سے کچھ بددل سے ہو گئے۔ مجھے بھی کچھ نہ بتاتے کہ میں پردیس میں رہ کر پریشان نہ رہوں۔ انیتا بھی کوئی بات نہ کرتی۔ فون پر بس یہی کہتی سب خیریت ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وقت گزر رہا۔

میری چھٹی حس مجھے بار بار اشارہ دیتی کہ گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ کوئی فرد بھی مجھ سے کھل کر بات نہ کرتا۔ آخر میں نے امی جان سے پوچھ لیا۔

''امی جان خدا کے لیے مجھے سچ سچ بتائیے۔ انیتا کا آپ سے کیسا رویہ ہے۔ وہ گھر میں کسی پریشانی کا باعث تو نہیں بن رہی۔ آپ لوگ اس سے خوش تو ہیں؟ اگر ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے تو پھر آپ لوگ پہلے کی طرح مجھ سے کھل کر ساری باتیں کیوں نہیں کرتے۔''

''بیٹا اب ہم تم کو کیا بتائیں۔ تمہارے جانے کے بعد انیتا نے یہاں نہ رہنے کی قسم کھائی تھی پھر تمہارے کہنے پر وہ یہاں رہنے پر رضامند ہوئی۔ پہلے دن آتے ہی اس نے فل ساؤنڈ میوزک کھول دیا۔ جو ہم سب کو ناگوار گزرا۔ میں نے کہا بیٹا۔ آواز کم رکھو۔ پورے محلے میں میوزک کی آواز جا رہی ہے۔ یہ قطعی بےہودہ حرکت ہے تم اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے مدھم آواز میں سن لیا کرو۔ بس میری یہ نصیحت

اس پر گراں گزر گئی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ صبح وشام کچن میں آتی ہے۔ اپنی پسند کا کھانا خود تیار کرتی ہے۔ اپنے کمرے میں ہی کھانا لے جا کر کھاتی ہے۔ دن بھر رسائل پڑھنا، ڈی وی ڈی آن رکھنا۔ فون پر لمبی کالیں کرنا۔ اس کے مشاغل ہیں۔ ہر چوتھے روز میکے جاتی ہے۔ دو، دو تین، تین دن رہ کر آتی ہے۔ نا اس کے جانے میں ہماری اجازت شامل ہے اور نہ اس کے چلے آنے میں ہمیں کوئی دخل ہوتا ہے۔ اپنی من مانیاں کر رہی ہے۔ تمہیں اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ انیتا تمہارے بغیر خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ چند دن یہاں رہے گی ہم سے گھل مل جائے گی۔ چلو وہ چار دن اپنی مرضی برت رہی ہے تو کیا ہوا۔ مگر اس نے ہم سے قطع تعلق کر رکھا ہے۔ بیگانوں کی طرح رہ رہی ہے۔ تمہارے بھتیجے بھتیجیوں کو بھی کوئی اتنی محبت نہیں دی کہ وہ اس سے مانوس ہو جائیں۔ یہ بڑی عجیب صورت حال ہے بیٹا! اس سے تو بہتر ہے کہ تم اسے اپنے پاس ہی بلالو۔''

امی جان نے انتہائی مایوس کن انداز میں کہا تو جیسے میرا سارا بدن برف کی مانند سرد سا ہو گیا ہو۔ بلڈ پریشر لو ہو گیا۔ چند لمحوں بعد میں انیتا سے مخاطب تھا۔

''انیتا! تم جب سے میرے کہنے پر گھر آئی ہو تم کچھ زیادہ ہی سنجیدہ سی ہو گئی ہو۔ نا تمہاری کال میں وہ پہلے سے جذبات ہیں نہ تم مجھ سے کوئی حالِ دل کہتی ہو۔ مجھے گھر کا ماحول کچھ گھمبیر سا لگ رہا ہے۔ بخدا! مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ تو جواب میں انیتا دھاڑیں مار کر رو دی۔

''انیتا پلیز...... مجھے کچھ بتاؤ...... بات کیا ہے...... میں بہت ڈپریشن میں ہوں۔ عرفان...... مجھے لگتا ہے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' وہ پھر رو دی۔

''پلیز انیتا! خدا کے لیے کچھ بتاؤ۔'' میں تلملا کر رہ گیا۔

''میں نے تمہارے بغیر اس گھر میں نا رہنے کا فیصلہ درست ہی کیا تھا۔ مگر تم نا جانے تمہارے کہنے پر میں چلی آئی۔ مگر پہلے دن ہی مجھ پر کاری ضرب اس وقت لگا دی گئی۔ جب کمرے میں تمہاری یادوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ تو میں نے میوزک کی آواز بلند کر کے اس کے شور میں اپنے غم کا آنسوؤں اور ہچکیوں میں غبار نکالا۔ آواز کوئی اتنی زیادہ بھی نا تھی کہ پورے محلے کو سنائی دے گئی ہو۔ مگر امی جان نے طنز بھرے لہجے میں میری جھاڑ کر دی۔ سسرال میں تمہارے بغیر پہلا دن تھا۔ اور پہلے ہی دن ساس نے مجھے احساس دلا دیا کہ تم میری بہو اور میں تمہاری ساس ہوں۔ اپنی مرضی سے تم یہاں نہیں رہ سکوگی۔ میں بہت نروس ہوگئی۔ ویسے بھی میں کچھ جذباتی سی لڑکی ہوں۔ اپنے میکے میں، میں نے شہزادیوں جیسی زندگی بسر کی ہے۔ کسی نے آج تک مجھے اف تک نہیں کہی...... مگر یہاں۔'' وہ ایک بار پھر بلک پڑی۔

''انیتا...... انیتا...... پلیز سمجھی وہ میری ماں ہے۔ انھوں نے تمہیں نصیحت بھری بات کہی کہ گھر سے میوزک کی آواز باہر گلی میں سنائی دے رہی ہو کہ وہ سننے والے کانوں پر کیا تاثر چھوڑتی ہے۔ تم نے اس ذرا سی بات کا اس قدر اثر لے لیا کہ سب سے قطع تعلق کر کے خود کو اپنے کمرے میں قید کر لیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ سب گھر والے پریشان ہیں۔ نا کسی سے بات کرتی ہو، خود ہی اپنا کھانا تیار کر کے کمرے میں جا کر کھا لیتی ہو۔ گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بھی تمہیں گوارا نہیں۔''

''اچھا...... اس کا مطلب ہے تمہیں یہاں سے لمحے لمحے کی رپورٹ دی جارہی ہے۔ اور میرے خلاف نا جانے کیا کیا تمہارے کانوں میں زہر بھرا جارہا ہے۔ اسی لیے آج تمہارا مجھ سے بات کرنے کا لہجہ بھی بدل چکا ہے۔'' انیتا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ تو مجھے اس کا یہ لہجہ کچھ اچھا نہ لگا۔

انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے خود ان سے پوچھا ہے۔ میں اس گھر کا فرد ہوں کیا مجھے کوئی حق نہیں کہ میں گھر کے حالات جان سکوں۔ یا وہ مجھے کچھ بھی نہ بتائیں۔ میں بیٹا ہوں ان کا۔ اور ابھی ان کی سرپرستی میں ہوں۔ گھر کے سبھی اختیارات میرے والدین کو ہیں۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں ہمیں ماننا پڑے گا۔ اور میں اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی

سوچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ تم بھی اپنے اس رویے کی امی جان سے معذرت کرو۔ اور ان کے ساتھ گھل مل کے رہنے کی ڈگر اختیار کرو۔ گھر میں محاذ آرائی کا میدان نا سجاؤ۔ بس تھوڑے عرصے کی بات ہے پھر تم یہاں آ جاؤ گی۔ سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔'' میں نے آخر میں نرم لہجہ اپنا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ پھر جی بھر کے فون پر رو رہی تھی۔

''میں یہاں نہیں رہوں گی۔ تمہارے آنے تک میکے رہوں گی۔ بس میں نے کہہ دیا تم سے۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنایا اور فون رکھ دیا۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی کٹھور بھی ہوسکتی ہے۔ اگر اسے مجھ سے کچھ رغبت ہوتی تو وہ میری خاطر میرے گھر والوں سے گھل مل کر رہ رہی ہوتی۔ بس اسے مجھ سے محبت ہے ہی نہیں۔ میں یہ سوچ کر اس کی بے اعتنائی پر رو سا دیا۔

رات گھر والوں کی کال آئی کہ انیتا اپنے بہت سارے کپڑے زیور اور ذاتی استعمال کی چیزیں سمیٹ کر میکے چلی گئی ہے۔ اور جاتے ہوئے اماں جان سے کہہ گئی ہے کہ اب میں عرفان کے آنے تک ادھر ہی رہوں گی۔ کیونکہ اس نے مجھے ادھر رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ بیٹا! اسے اس طرح کھلی چھٹی دے کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ ایک ماہ کے عرصے میں تم نے کچھ زیادہ ہی اسے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اس کے تمام چونچلے پورے کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے تمہارے جاتے ہی ہم سے آنکھیں پھیر لیں۔ اور پھر تم سے یہ بات بھی منوالی کہ میں اپنے میکے میں رہوں گی۔ آئندہ وہ اپنی جائز ناجائز بات تم سے منوانے کی عادی ہو جائے گی۔ اب جس طرح وہ گئی ہے ہمارا دل تو نہیں چاہے گا کہ اسے دوبارہ اس گھر میں لایا جائے۔ آگے بیٹا تمہاری مرضی ہے۔'' امی جان نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''مگر امی جان یہ رشتہ آپ لوگ میرے لیے پسند کر کے اسے یہاں لائے ہیں۔ اب آپ اسے گھر میں لانے پر بھی انکار کر رہی ہیں۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ کیا میں اسے طلاق دے دوں۔'' میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر بات بھی کہہ دی۔

''بیٹا ہم نے کب کہا تم سے کہ تم اسے فارغ کر دو۔ جب وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو ہم زبردستی تو اس پر نہیں کر سکتے نا۔ بلکہ وہ اب کوئی زبردستی کی بات تمہاری بھی نہیں مانے گی۔ وہ حکمرانی کرنے کا مزاج رکھتی ہے۔ کسی کی بات ماننا اسے پسند ہی نہیں۔ وہ ایک خودغرض لڑکی ہے۔ یہ رشتہ تمہارے بھائی نے کیا تھا۔ اب وہ ہی پچھتا رہا ہے کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا۔ اب عرفان ہی ہے جو انیتا کو راہ راست پر لے آئے ورنہ اسے سنبھالنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔''

''گویا بھائی جان نے ہی ہتھیار ڈال دیے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی بات ہے اور آپ لوگوں نے یہاں تک سوچ لیا۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ خیر میں انیتا سے بات کرتا ہوں اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ مل کر نہیں رہنا چاہتی تو پھر مجھے بھی اختیار ہے کہ اپنی مرضی برت سکوں۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو بیٹا! کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھانا۔ ہم ان لوگوں کے مزاج سے واقف نہیں۔ غیر برادری ہے۔ ممکن ہے اس کے گھر والے اسے ہمارے ساتھ رہنے پر مجبور کریں۔ لہٰذا ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ تم انیتا سے ابھی کوئی رابطہ نہ رکھو۔ بھلا وہ تم سے کیا کہتی ہے۔ تب تک اس کے میکے والوں کا بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کیا قدم اٹھاتے ہیں۔''

میں نے امی جان کی بات مان لی۔ بڑوں کی بات مان لینا بہت سودمند ہوتا ہے۔ اگر امی جان مجھے ادھر رابطہ سے نا روک دیتیں تو میں اسی لمحے انیتا کو کال کرتا اور غصے میں اسے نا جانے کیا کچھ کہہ جاتا۔ میں عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا۔ نہ رات کو نیند نہ دن کو قرار۔ تیسرے دن انیتا کی کال آئی۔

''کیسے ہو عرفان؟''

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''ناراض ہو مجھ سے......؟''

''میرے ناراض ہونے یا نا ہونے سے تمہیں کیا

فرق پڑتا ہے۔"

"اوہ...... طنز کر رہے ہو مجھ پر...... ظاہر ہے تمہارے گھر والوں نے بتایا ہوگا۔ کہ انیتا اپنا سارا سامان سمیٹ کر میکے چلی گئی ہے۔ وہ بڑی خود غرض ہے۔ منہ پھٹ اور کٹھور سی لڑکی ہے۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔تم نے شادی کے بعد اسے بہت سر پر چڑھایا۔ اب وہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔"

"اگر انھوں نے یہ سب کچھ مجھے نہیں بھی بتایا تو آپ خود جو بتا رہی ہیں۔اس کا مطلب ہے یہ سب باتیں درست ہیں۔ میں نے تمھیں منع کیا تھا کہ تم میکے نہیں جاؤ گی۔ بلکہ میرے اہل خانہ سے گھل مل کر رہنے کی کوشش کرو گی۔ مگر تم نے مجھے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ آپ میری بیوی ہیں۔ میری فرمابرداری کرنا آپ کا فرض ہے۔ مگر تمھیں تو میری آبرو کا بھی احساس نہیں۔ میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تمہاری نظر میں۔ دیکھو انیتا! تمہارے اس ناروا سلوک نے نا صرف میرے گھر والوں کو دکھی کیا ہے بلکہ مجھے بھی ذہنی اذیت دی ہے اور میں یہ سب کچھ نہیں برداشت کرسکتا۔" میرے لہجے میں تلخی سی اتر آئی۔

"عرفان صاحب! میں آپ کی بیوی ہوں آپ کی زرخرید غلام نہیں کہ آپ کے گھر والوں کی کنیز بن کر رہوں۔ آپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ مجھے ذاتی طور پر قبول نہیں کر رہے۔ کوئی زبردستی نہیں ہے آپ پر۔ اگر آپ کا ارادہ مجھے چھوڑنے کا ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بے شک ڈائیوورس دے دو مجھے۔" انیتا نے انتہائی بدتمیزی دکھاتے ہوئے نہایت کرخت انداز میں کہا۔ اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کی اس گھٹیا حرکت نے مجھے فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ ابھی کال کر کے اسے آزاد کر دوں۔ مگر کئی بار کوشش سے کال نا مل سکی۔

میں نے گھر امی سے بات کی اور انیتا سے ہونے والی بات کو بیان کیا۔ اور ساتھ ہی اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ کہ اب کسی صورت بھی انیتا کو قبول نہیں کر سکتا۔

مگر امی نے مجھے ضبط اور صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ ایسے فیصلے جذبات میں آ کر نہیں کیے جاتے۔ پہلے ہمیں ان لوگوں سے بات کر لینے دو۔ اگر وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تو پھر انیتا کو گھر لانے کا سوچا جا سکتا ہے۔ اور اگر انھوں نے بھی اپنی بیٹی کی طرفداری کی تو پھر ہم تمھیں نہیں روکیں گے۔ میں تمہارے بھائی اور بھابی کو ان کے گھر بھیجتی ہوں۔ سب پتا چل جائے گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ہم یک طرفہ فیصلہ کر کے ان کے سامنے کسی بات کا جواب دہ نہیں ہونا چاہتے۔"

امی نے بڑے پیار سے اور شفقت سے مجھے سمجھایا تو میں نے امی کو زور دے کر کہا کہ فوری بھائی اور بھابی کو ادھر بھیجو۔ میں زیادہ دیر تک خود کو اذیت میں نہیں رکھ سکتا۔

☆☆☆

اسی ہفتے کے دوران ہی بھیا اور بھابی انیتا کے میکے گئے۔ ساری باتیں تفصیل سے ہوئیں۔ انیتا کے بھائیوں کو کال کر کے اس میٹنگ میں شامل کیا گیا۔ اس عرصے میں نا تو انیتا نے مجھ سے کوئی رابطہ کیا۔ اور نا ہی میں نے اسے کال کرنا پسند کیا۔ اپنے گھر والوں سے روز بات ہو جاتی تھی۔

اس روز امی نے بتایا کہ آج تمہارے بھیا! تمہاری بھابی کے ہمراہ ادھر جا رہے ہیں۔ میں بہت بے چین تھا کہ نا جانے انیتا اور اس کے گھر والے میرے بھیا سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ کئی بار جی چاہا کہ کال کر کے اپنے بھیا سے بات کرلوں۔ مگر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے میرا فون انیتا اٹینڈ کر لے اور ہماری تکرار نہ شروع ہو جائے۔ پاکستان میں رات کا وقت تھا اور میرے ہاں سورج ڈھل رہا تھا۔ شام چھ بجے میں اپنی رہائش گاہ پہنچا۔ کچھ کھانے کو بھی دل نا چاہ رہا تھا۔ طبیعت بڑی بوجھل اور من میں حد درجے کی بے چینی تھی۔ ایسے میں کال کی گھنٹی بجی تو میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ فون پر انیتا کا بھائی شرجیل بات کر رہا تھا۔

"عرفان صاحب! میں شرجیل بات کر رہا ہوں

انگلینڈ سے۔

''جی فرمایئے؟'' میرا لہجہ کچھ خفگی بھرا تھا۔

''عرفان آپ کے بھائی سے صرف ہماری دوستی تھی ہم نے آپ لوگوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور دوستی کو رشتہ داری میں بدل ڈالا۔ مگر شادی کے بعد ان چھ سات مہینوں میں آپ کے گھر والوں نے جو سلوک ہماری بہن سے روا رکھا ہوا ہے۔ وہ نہایت شرمناک اور قابل تذلیل ہے۔ وہی دیہاتی رسم ورواج اور انا کے خول میں جکڑے ہوئے سوچ کے لوگ۔ ہم نے اپنی بہن کو بہت مجبور کیے رکھا کہ وہ آپ کے گھر والوں کی ناقص سوچ اور جاہلیت کو برداشت کرے اور اس نے کیا بھی..... مگر؟''

''شرجیل! زبان سنبھال کر بات کریں۔ آپ میرے گھر والوں کی شان میں نہایت بے ہودہ لفظوں کا استعمال کر رہے ہیں جو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ صاف لفظوں میں بات کریں۔ آپ نے مجھے کال کیوں کی؟ اور آپ چاہتے کیا ہیں؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر نہایت ترش لہجے میں اسے ڈانٹ کر کہا۔

''اوہ! آپ بھی اپنی اوقات میں رہ کر ہم سے بات کریں۔ فوراً ہماری بہن کو طلاق دو۔ ابھی اور اسی وقت۔ بس..... بہت ہوگئی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ کن گھٹیا اور کمینے لوگوں سے رشتہ جوڑنے جا رہے ہیں۔''

''بکواس بند کرو بے غیرت..... میں ابھی اس آزاد خیال اور بے شرم کو طلاق دیتا ہوں۔ جس کے گھرانے میں شرافت کے نام سے بھی کوئی آشنائی نہیں۔'' میں نے نہایت غصے میں دانت پیس کر کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

میرا دماغ پھٹ رہا تھا۔ اور آنکھوں میں سرخی چھا رہی تھی۔ پھر میں نے بکس سے البم نکال کر انیتا کی تصویریں، اس کے محبت نامے نکال کر پرزہ پرزہ کر کے کچن میں جلتے آگ کے شعلوں کی نذر کر دیے۔ اپنے گھر کال کی۔ گھنٹی بجتی رہی۔ مگر کسی نے کال اٹینڈ نہ کی۔ رات بھر کانٹوں پہ لوٹتا رہا۔ شب کے آخری پہر میں جا کر آنکھ لگی۔

فون کی گھنٹی نے جھنجوڑ کر جگایا۔ ہڑبڑا کر اٹھا۔

فون بھیا کا تھا۔

''ہیلو عرفان! کیسے ہو.....؟'' بھیا پوچھ رہے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں بھیا! آپ سنائیں کیا ماجرا ہے۔ میں رات سے بڑا پریشان ہوں۔''

''بس یار اب تمھیں کیا بتاؤں۔ ان لوگوں نے تو طوطے کی طرح آنکھیں ہی پھیر لی ہیں۔ بہت تکرار کی ہے ہم سے۔ اور انیتا نے تو انتہا کر دی کہ میں اب اس گھر میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بس مجھے طلاق دے دو۔''

''میں بھی اسی کمینی کو نہیں رکھنا چاہتا۔ بلکہ میں اسے طلاق دے چکا ہوں بھیا!'' میں بھیا کی بات کاٹ کر چیخ سا پڑا۔

''اس کے بھائی بھی فون پر اس گفتگو میں شامل رہے۔ انھوں نے بھی طلاق کا مطالبہ کیا ہے۔''

''ہاں بھیا! شرجیل نے رات ہی مجھے کال کی تھی۔ اور بڑی بے ہودہ گفتگو مجھ سے کرتا رہا اور آخر میں طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ لہٰذا میں انیتا کو اپنی یونین کونسل کو طلاق نامہ پوسٹ کرنے لگا ہوں۔''

''اوہ..... بہت برا ہوا عرفان۔ بس مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کر دینا یار..... میں دوستی کی لاج پالتے پالتے آپ کا مستقبل تباہ کر بیٹھا۔''

''نہیں بھیا۔ ایسا نہ کہو۔ بس یہ میرا مقدر تھا آپ نے تو میرے لیے بہتر ہی سوچا تھا نا؟'' آج وہ لوگ سامان اٹھانے آ رہے ہیں۔ اب پتا نہیں یہاں کیا مطالبہ کرتے ہیں۔'' بھیا نے پریشانی سے کہا۔

''کیا مطالبہ کریں گے۔ اگر وہ کسی جہیز کی کمی کا مطالبہ کریں تو آپ بھی ان سے اپنے دیے ہوئے تمام زیور کا مطالبہ کر دینا۔ بلکہ یہ مطالبہ میں ان سے کروں گا۔'' میں نے نہایت غصے کی حالت میں کہا تو بھیا مجھے دلاسہ دینے لگے۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔''

''پھر بھی اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو مجھے بروقت

اطلاع ضرور دینا۔'' میں نے بھیا کو تاکید کی اور بات مکمل ہوگئی۔

میں نے اسی روز ڈائیورس کے کاغذات مکمل کر کے پاکستان روانہ کر دیے اور اگلے دن بھیا نے تفصیل سے بتایا کہ وہ شام کے بعد ٹرک اور دو مزدور ساتھ لے کر سامان کی لسٹ کے مطابق پورا کر کے ہم نے انہیں اپنی زیرِ نگرانی لوڈ کرایا۔ اب وہ زیورات کی عجیب سی بات کر کے گئے ہیں کہ انیتا کا سارا زیور ادھر ہی تھا۔ جبکہ ہمیں تو زیور کا بکس ملا ہی نہیں۔ میری بیوی اور امی نے بتایا کہ آخری بار سارا زیور انیتا خود لے کر گئی تھی۔''

''بالکل لے کر گئی تھی مجھے سب معلوم ہے بکواس کرتے ہیں وہ۔ میں ابھی انیتا سے پوچھتا ہوں۔'' میں نے بھیا کی بات کاٹ کر کہا۔

''نرم لہجے میں یار! تم بڑے جذباتی ہو رہے ہو۔ اور ایسے موقعے پر بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جب ایسے رشتے ٹوٹ رہے ہوں تو جائز و ناجائز باتوں کا تبادلہ۔ اشیاء کا مطالبہ مقدمات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آپ نے طلاق بھیج دی۔ سامان جا چکا ہے۔ اب دیکھتے ہیں وہ کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ تم آج کا دن انیتا کو کال نا کرو اگر وہ سچے ہیں تو کل تک خود مطالبہ کرنے یہاں آ جائیں گے۔ یا وہ تم سے خود ہی رابطہ کرے گی۔'' بھیا نے میرے بھڑکتے جذبات کو محسوس کر کے مجھے کال کرنے سے روک دیا۔

مگر اگلے دن میں نے انیتا کو کال پر بلالیا۔ اور خود نہایت صبر کر کے اس سے بات کا آغاز کیا۔

''دیکھو انیتا! میں زیادہ آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اور نا ہی آپ مجھ سے کوئی تکرار کریں۔ دو ٹوک سی بات ہے کہ آپ کے گھر والوں نے اپنا سامان پورا کر لیا۔ تمام زیورات آپ خود پہلے ہی لے چکی ہیں۔ ڈائیورس میں آپ کو پوسٹ کر چکا ہوں۔ اب ہمارا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہا۔ برائے مہربانی آپ میری تصاویر جلا دیں...... کیونکہ میں اپنا البم خاکستر کر چکا ہوں۔''

''کیا؟'' وہ چیخ پڑی۔

''تمہاری کوئی چیز میں نے اپنے پاس نہیں رہنے دی جو تمہاری یاد بھی دلائے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میری بھی کوئی ایسی چیز تمہارے پاس باقی نہ رہے...... جو تمہیں میری یاد دلا سکے۔ ہمارے نکاح نامے میں جو زیور درج کیا گیا تھا وہ آپ کی ملکیت ہے۔ البتہ جو بعد میں نے تمہیں گفٹ کی صورت پیش کیے وہ تمام قیمتی اشیاء اب آپ کی نہیں ہیں۔ وہ میں آپ سے واپس بھی نہیں لینا چاہتا۔ وہ آپ کسی غریب اور ضرورت مند کو دیں گی۔ وہ میرے کسی کام کی نہیں کیونکہ وہ آپ کے استعمال میں آ چکی ہیں۔''

''اوہ...... نو...... نو نو نو...... میری انسلٹ کر رہے ہیں آپ...... آپ نے میری تصویریں بھی جلا دیں او مائی گوڈ...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے کمینے انسان بھی ہو سکتے ہو۔''

''انیتا! بکواس کی ضرورت نہیں ہے...... تم تصویروں کی بات کرتی ہو...... میرا بس چلے تو میں تمہیں زندہ جلا کر تمہاری راکھ بھی بکھیر دوں۔'' میں نے نہایت گرجتے ہوئے کہا۔ اور ریسیور مکا مارنے کے انداز میں نیچے پھینک دیا۔ وہ برابر چیخ رہی تھی مجھے گالیاں دے رہی تھی۔ ریسیور بیڈ سے نیچے لٹک کر اس کی چیخیں کمرے میں بکھیر رہا تھا۔

☆☆☆

اس اذیت ناک سانحہ کے بعد پورا ایک ہفتہ میں ڈپریشن اور ذہنی دباؤ کا شکار رہا۔ گھر والوں کو میں نے مطمئن کر دیا کہ وہ لوگ آپ سے زیور کا کوئی مطالبہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ تمام زیور انیتا لے جا چکی ہے۔ میری اس سے بات بھی ہو چکی ہے۔ میری بات پر گھر والوں کو اطمینان ہوگیا۔ ورنہ وہ بہت پریشان تھے۔

انیتا کی بے پناہ محبت میرے دل میں بھری تھی۔ اس کے لیے پیار کا ایک سمندر میرے اندر موجزن تھا۔ مگر اس کی گھٹیا سوچ اور منفی کردار نے سب کچھ میرے من سے کھرچ کر صاف کر دیا۔ بلکہ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کا ایک لاوا سا بھر گیا تھا۔ جو بسا اوقات مجھے بے چین کر دیتا اور میں بمشکل خود کو سنبھال پاتا۔ میرا گھر اجڑنے پر اپنی جان نے گھر

اثر لیا۔ وہ مسلسل بیمار رہنے لگیں۔ بلکہ بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا۔ پھیپھڑوں میں پانی بھر جاتا۔ اور سانس میں دقت ہونے لگتی۔ بھیا ان کا بھرپور طریقے سے علاج کروا رہے تھے۔ امی جان مجھ سے فون پر صحیح بات بھی نہیں کرپاتیں۔ میں ان کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگا۔ ایک دو بار تو انھیں بلڈ پریشر کا شدید اٹیک بھی ہوا۔ میرے بے حد اصرار پر بھیا انھیں لاہور کے اسپیشلسٹ کے پاس لے گئے اس نے تمام ٹیسٹ رپورٹوں کے بعد جو انکشاف کیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ امی جان کے پھیپھڑے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے سانس میں دشواری ہے اور بسا اوقات گیس لگوانا پڑتی ہے۔ امی جان ایک ہی مطالبہ کر رہی تھیں کہ مجھے اپنی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے میں اپنے عرفان بیٹے کا گھر آباد دیکھ لوں۔"

ان کی ممتا بے چین تھی۔ ادھر امی جان میری وجہ سے اذیت میں تھیں۔ اور ادھر میں ان کے غم میں نڈھال ہوا جا رہا تھا۔

بالآخر بھیا نے مجھے کال کی کہ کسی طرح فوراً چھٹی لے کر گھر آؤ۔ امی کی طبیعت بہت کمزور ہے اور لاغر بھی۔ ہم گھر والوں نے ان کے بے حد اصرار پر تمہارا گاؤں میں ہی رشتہ طے کر رکھا ہے۔ بس تم آؤ تو تمہارا نکاح کرکے امی جان کی خواہش کو پورا کیا جائے۔" بھیا کی بات سن کر میں سر ہی تو گیا۔ میں تو ابھی اگلے اپنے کاری زخموں پر مرہم سجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نئے ہم سفر کا انتخاب اور وہ بھی اتنا ایمرجنسی کی صورت میں کرنے کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔ مگر اس وقت مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز میری ماں کی زندگی تھی۔ اگر ماں کو کچھ ہو گیا۔ ان کی خواہش ادھوری رہی تو یہ زخم سہارنا شاید موت سے بھی بڑھ کر وزنی تھا۔ اسی لیے میں نے ماں کی خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا..... اور۔ اگلے پندرہ دن کے اندر اندر بھرپور جد! جہد کے بعد ایک ماہ کی رخصت پر پاکستان کے لیے عازم سفر ہوا۔

☆☆☆

امی شہر کے ہسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ بھیا نے یہ میرے نکاح کا مکمل بندوبست کر دیا تھا۔ میں سیدھا اسپتال پہنچا۔ امی جان کا کمزور اور نحیف سا جسم دیکھ کر میرے سارے بدن کی سکت جیسے کسی نے صلب کر لی۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میری آنکھوں میں غبار سا چھا گیا۔ اس کے بیڈ پر پہنچ کر میں ان پر جھکا۔ امی پلکیں موندے لیٹی تھیں۔ ڈرپ کے قطرے ایک ایک کرکے ان کی کلائی میں جذب ہو رہے تھے۔

"دیکھو تو امی کون آیا ہے۔" بھیا کے ساتھ ساتھ بھابی نے بھی انھیں جگا کر کہا۔ امی نے یکایک جھپاک سے آنکھیں کھولیں۔

"ہاں..... میرا مانو آ گیا۔" اور میں چیخ کر ان پر گر گیا۔ انھوں نے لیٹے لیٹے مجھے اپنی بانہوں میں بھرا۔ اور چومتی چلی گئیں۔ اور ممتا کا بھرپور لمس میرے رگ و پے میں اترتا چلا گیا۔ بھابی اور بھیا نے بمشکل مجھے سنبھالا۔ ان کی آنکھیں بھی غمناک تھیں۔ امی جان کو کھانسی آنے لگی۔ بھابی نے بڑھ کر اماں کا سر اپنی بانہوں میں بھرا۔ اور امی کی بھیگی پلکوں کو اپنے دوپٹے سے پونچھنے لگی۔ بھیا امی کے پاؤں دبانے لگے۔ اور میں امی کے قدموں میں جھک کر پاؤں کے تلوے چومتا چلا گیا۔ پھر اماں نے مجھے پاس بلایا وہ مجھے پیار سے خانو کہتی تھیں۔ میرا چہرہ ہتھیلی میں لے کر میری ٹھوڑی میرے گال اور میرا سر بھی چومتی رہیں اور مجھ سے باتیں بھی کرتی رہیں۔

"بیٹا! تیرا گھر نہیں بسا۔ انیتا نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس کے گھر والوں نے بھی بیٹی کی پاسداری کی اور اصل بات جاننے کی کوشش ہی نا کی۔"

"چھوڑیں امی جان! ان لوگوں کا نام بھی نہ لیں میرے سامنے۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اور امی کا بازو اپنے چہرے سے لگائے عقیدت سے چومنے لگا۔

"نہیں بیٹا! تم یہ بات دل کو نا لگانا۔ اب جس جگہ تمہارا رشتہ طے کیا ہے اسے تو جانتا تو ہے نا۔ چوہدری ولی محمد۔ اس کی بیٹی نادیہ، بڑی سگھڑ سیانی اور تم کو بچی ہے۔ پانچ جماعتیں بھی پڑھی ہوئی ہے۔

قرآن پاک بھی پڑھ رکھا ہے۔ گھر کا سارا کام کاج وہی کرتی ہے۔ اور پھر ان لوگوں نے غیر برادری ہو کر ہم سے کوئی شرط نہیں رکھی۔ ہم نے انھیں فوری نکاح کر کے رخصتی کا کہا تو وہ یہ بھی شرط مان گئے۔ تم دیکھ لینا نادیہ بیٹی تمہارے سارے غم بھلا دے گی۔ اور ہماری خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔'' اماں بتا رہی تھیں اور میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ان کی خوشی کے لیے میں خاموش تھا۔ ورنہ میرا دل تو ابھی ایسے کسی نئے جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

نادیہ کو میں زیادہ قریب سے تو نہیں جانتا تھا۔ مگر اس کی شکل وصورت سے میں آشنا تھا۔

ڈرپ ختم ہوئی تو ہمیں امی جان کو گھر لے جانے کی اجازت مل گئی۔ شام گئے ہم گاؤں پہنچے۔ اگلے دن میرے نکاح کی رسم ادا ہونا تھی۔ عزیز رشتہ دار اور دوست ملنے آ رہے تھے۔ نادیہ کا گھر اسی گلی میں تھا جہاں امبر رہتی تھی۔ وہی امبر جس کے ساتھ چھت پر کھڑے کھڑے آشنائی ہوئی تھی۔ اور کئی روز یہ سلسلہ چلتا رہا تھا۔

دن بھر گھر میں چہل پہل رہی۔ سبھی لوگ امی کی مزاج پرسی کرنے اور مجھ سے ملنے آ رہے تھے۔ شام کو مجھے چاچا ولی محمد کے گھر لایا گیا۔ گلی میں چھوٹا سا شامیانہ لگا تھا۔ جہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ میرے ساتھ آنے والوں کو لڈو ڈرنک کے ساتھ برگر پیش کیے گئے۔ میرا نکاح پڑھایا گیا۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے انیتا کی یاد نے بھی بے قرار کیا۔ مگر میں نے جلد ہی اس کا خیال دل سے جھٹک دیا۔

☆☆☆

حجلۂ عروسی میں بس رسمی طور پر میں نے نادیہ سے تعارفی ملاقات کی۔ بے شک وہ بے حد حسین، خوش شکل معصوم سی اور متاثر کرنے والی شخصیت تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ امی جان کی بیماری کے باعث میں ذہنی طور پر شدید دباؤ اور اعصابی طور پر تناؤ کا شکار ہوں۔ ایک ماہ بعد ہی مجھے واپس لوٹ جانا ہے۔ انیتا نے میری زندگی میں بہت بڑا گھاؤ چھوڑا ہے۔ میرے گھر والوں نے بڑے اعتماد سے تمھیں میرا جیون ساتھی منتخب کیا ہے۔ میں تم سے امید رکھوں گا کہ آپ ان کی عزت، ادب واحترام اور خدمت کر کے ان کے اعتماد کا مان رکھو گی۔ اور میرے زخم خوردہ دل پر اپنی بے لوث محبت کا مرہم سجاؤ گی۔''

''میں پوری کوشش کروں گی عرفان۔ کہ آپ کی اور آپ کے گھر والوں کی خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہ برتوں۔ بس مجھے آپ کی محبت اور گھر والوں کا حسنِ سلوک درکار ہوگا۔ انیتا اور اس کے میکے والوں نے جو ناروا سلوک آپ کے گھرانے سے کیا ہے پوری بستی کے لوگوں نے اسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ میرے گھر والوں نے اس واقعہ کا بڑا گہرا اثر لیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی آپ کے گھر والوں نے میرے رشتے کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ میرے تمام اہل خانہ نے کسی پس وپیش کے بغیر مجھے آپ کے نام کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ میرا نصیب بنیں گے۔'' نادیہ نے حیرت سے کہا۔

''تم کسی اور کے سپنے کو تو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ کہیں تمہاری مرضی کے بغیر تو نہیں تم کو میرے پلّے باندھ دیا۔ اگر ذرا بھی ایسا کچھ ہے تو ابھی وقت ہے۔ میں تمھیں تمہاری خوشیاں واپس دلا سکتا ہوں۔'' میں نے خلوصِ نیت سے کہا۔

''نہیں عرفان! ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر میں رضامند نہ ہوتی تو ماں کو انکار بھی کر سکتی تھی۔ میں دل وجان سے آپ کی ہوں۔ اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔ مجھے اپنے مقدر پر ناز بھی ہے کہ میں کسی تنگ نظر اور چھوٹی سوچ رکھنے والے مرد کی شریکِ حیات نہیں بلکہ ایک فراخ دل اور اعلیٰ ظرف انسان کی ہم سفر بنی ہوں۔ آپ نے ایک ہی بات کر کے مجھے جیت لیا ہے۔''

نادیہ نے فرطِ جذبات سے کہا اور میرے قدموں میں سر جھکا دیا۔ مجھے بھی اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ اس کے خیالات بھی قابلِ رشک تھے۔ میں نے اپنی والدہ کے اپنے لیے کیے جانے والے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ اور نادیہ کو دل میں بسانے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

نادیہ صرف ایک دن کے لیے اپنے میکے گئی اور شام کو میرے ساتھ چلی آئی۔ چند دنوں میں ہی وہ سب سے گھل مل گئی۔ کچن اس نے سنبھال لیا۔ امی جان کی خدمت کا مجھ سے زیادہ حق ادا کرنے لگی۔ میں بھی دن رات امی جان کی نگہداشت میں گھر ہی رہتا۔

ایک دن میں کسی دوست کے ساتھ شہر گیا ہوا تھا۔ لوٹ کر آیا تو گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ نادیہ نے بتایا کہ میری ایک دوست ہے اس کے میاں آرمی میں ہیں اور آج کل یہ ان کے ساتھ ہی کوئٹہ میں رہتی ہے۔ اپنے میکے ملنے آئی ہے تو میری شادی کا سن کر دونوں میاں بیوی مبارک باد دینے چلے آئے۔ آؤ تمہیں ان سے ملواتی ہوں وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔'' نادیہ نے بتایا اور مجھے اندر لے کر چل دی۔

کمرے میں پہلا قدم رکھا..... دونوں میاں بیوی صوفے پر دراز تھے۔ سامنے ٹیبل پر کھانے کی اشیاء سجی تھیں۔ خوش پوش نوجوان نے اُٹھ کر میرا استقبال کیا اور بڑے تپاک سے گلے ملا۔ تین سال کا بچہ اس کے ساتھ موجود تھا۔ جبکہ اس کی شریک سفر جو گہرے نیلے ستاروں والے پیراہن میں سجی ننھے منے بے بی کو بسکٹ کھلانے میں مگن تھی۔ بھابی اور باجی اُس سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا اس نے پورا چہرہ گھما کر مجھے دیکھا تو چونک سی گئی۔ وہ امبر تھی۔ میرے پورے بدن کی رگوں میں طلاطم سا آ گیا۔

''السلام علیکم!'' میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر دھیرے سے اسے کہا۔ اس نے بھی سر کو خم دے کر ہونٹوں میں ہی سلام کیا۔ اس کے سارے بدن میں بھی اضطرابیت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ٹشو سے بچے کا منہ صاف کر کے جھکے جھکے چہرے سے مجھے بھی جھانک رہی تھی اور بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بچے کو بھی سنبھال رہی تھی۔ تب تک نادیہ نے میرے کیسے ان کے مقابل کرسی ڈال دی۔ اب ہم روبرو تھے۔ آج پہلی بار ہم ایک دوسرے کو اتنا قریب سے دیکھ رہے تھے۔ باجی اور بھابی بھی اُٹھ کر چل دیں اب ہم تینوں کمرے میں موجود تھے۔

''آپ نے لوٹ کر گاؤں ہی میں شادی کرنی تھی تو پہلے ہی کر لیتے۔'' اس نے خود کو سنبھال کر مجھ سے ایک چبھتا ہوا سوال کیا اور ساتھ ہی اپنے ہم سفر جاوید صاحب کے چہرے کو جھانکا۔

''چاہا تو میں نے بھی بہت تھا۔ مگر میرے مقدر میں کسی اور کا نام لکھا تھا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''ہاں انیتا نے بہت بے وفائی کا ثبوت دیا۔ بہت دکھ ہوا ہمیں سن کر۔'' اس نے چائے بنائی اور مجھے بڑے خلوص سے کپ پیش کیا۔ جاوید نے بھی اپنے حصے کا کپ سنبھالا اور ہماری گفتگو میں متوجہ رہا۔

''وہاں جرمنی میں تو شادی کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہوتا۔'' امبر نے پھر سے مجھے ٹھوکر دی۔

''اگر مشکل نہیں تو اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ ان کے کچھ اپنے اصول اور ضابطے ہیں۔''

''وہاں رہ کر آپ کو گاؤں کی یاد آتی تھی۔'' نا جانے وہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو بھول چکے ہوں۔ اور مجھے تو گاؤں اور اس میں رہنے والے ایک دن کے لیے بھی نہیں بھولے۔''

''آ...... اچھا......'' وہ جیسے چونک سی گئی پھر کچھ سٹپٹا کر پوچھا۔ ''آپ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ پتنگ بازی بڑی کیا کرتے تھے۔ اب بھی شوق ہے یا ختم ہو گیا؟'' اس نے پوچھا تو مجھے لگا کہ وہ آج میرے برسوں کے ضبط کو توڑ کر رہے گی۔

''اب وہ شوق کہاں...... ایک بار پتنگ کو بڑی بلندی پر لے گیا تھا۔ اس کی ڈور ہاتھ سے نکل گئی۔ بس اس کے بعد کبھی پتنگ نہیں اڑائی۔'' میرے لہجے میں زمانے بھر کی اداسی سمٹ آئی۔

''اوہ! کسی نے بوکاٹا کر لیا ہوگا اور اس کھیل میں ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ کبھی پتنگ باز دوسروں کی پتنگ لوٹتا ہے تو کبھی اس کی اپنی پتنگ کٹ جاتی ہے۔ اور یہ چیز ہی اس کھیل کا حسن ہے۔'' جاوید صاحب نے ہماری گفتگو میں شامل ہو کر ہنس کر کہا۔

''جو پتنگ آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضاؤں میں کھوگئی۔ آپ نے اس کی ڈور کو مضبوطی سے پکڑا ہی نہیں ہوگا۔ نہیں تو بھلا وہ کیونکر چھوٹ جاتی۔'' امبر کے لہجے میں درد تھا۔

''مضبوط پکڑنے کی تو بہت کوشش کی تھی مگر پتا ہی اس وقت چلا جب پتنگ بھی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور ڈور بھی ہاتھ میں نہ رہی۔'' میں نے کہا تو جیسے ہماری ایک وقت میں، ایک ساتھ سکی نکل گئی۔ اس عرصے میں جاوید صاحب سگریٹ سلگانے میں مصروف تھے۔ میں نے چاہنے کی چسکی سے اپنے اندر سے امنڈتے جذبات کی راہ روکی اور امبر نے دوپٹے سے ناک کو مسل کر صوفے کی پشت سے سر ٹکایا۔ اپنے پاؤں کو دوسرے پاؤں پر بٹھایا۔ اور جیسے اپنے اندر سے اٹھتے سیلاب کو لمحہ بھر کے لیے چہرے پر دوپٹہ پھیلا کر روک لیا ہو۔ بڑی اذیت ناک گھڑی آپڑی تھی ہم دونوں پہ۔ ادھر جاوید صاحب کے ہاتھ میں سلگتے سگریٹ کا دہکتا حصہ پاس کھیلتے بچے کے ہاتھ کو چھو گیا۔ وہ یکا یک زور سے چیخا تو ہماری توجہ ادھر ہوگئی۔

''اوہو..... ہوہو۔'' جاوید صاحب نے ہڑبڑا کر اسے سنبھالا اور کھڑا ہوکر اسے چھاتی سے لگا کر تھپتھپانے لگا۔

''ارے کیا ہوا؟'' امبر نے خود کو سنبھال کر چونک کر پوچھا۔ اور تیزی سے کھڑی ہوگئی۔

''سگریٹ سے ہاتھ جل گیا اس کا۔'' جاوید نے اسے بتایا اور چیختے بچے کا زخمی ہاتھ سہلاتے ہوئے کمرے سے باہر چل دیا۔

''اوہو جاوید کیا ہوگیا ہے تمھیں۔ لاؤ میں سنبھالتی ہوں اسے۔'' اس نے اپنے چھوٹے منے کو کندھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''بہت برا کیا تم نے عرفان۔ اپنے ساتھ بھی اور میرے ساتھ بھی۔'' امبر نے میز اور صوفے کے درمیانی حصے کو ترچھے رخ پر پار کرتے ہوئے سرگوشی سے مجھے کہا اور وہ بھی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر زور سے سر کو جھٹکے دیے اور اپنے ذہن کو گزرے دنوں کی یادوں کے یک لخت جاگ جانے پر سنبھالا دیا۔ بمشکل بچے کو سنبھالا گیا پھر نادیہ بھی ہماری محفل میں آبیٹھی۔

''عرفان! یہ میری بہت پیاری دوست ہے امبر۔ بچپن سے جوانی تک اور خاص کر اسکول کے زمانے میں تو ہماری دوستی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔''

''ہاں! اسی لیے تو ملنے یہاں چلی آئی۔'' امبر نے جواب میں کہا۔

''پھر کیسا لگا آپ کو میرا سنجوگ۔'' نادیہ نے مسکرا کر امبر سے پوچھا۔

''بہت اچھا بھئی! مبارک ہو آپ کو۔ مقدر سے ایسے سنجوگ بنتے ہیں اور مقدر کے معاملے میں تم بڑی خوش نصیب ہو۔'' امبر کے بظاہر لبوں پر مچلتی ایک سسکتی آہ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

پھر نادیہ نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ اور اپنے کمرے میں پہنچ کر بتایا کہ امبر میرے اور تمہارے لیے قیمتی سوٹ لے کر آئی ہے۔ مٹھائی کا ڈبہ اور پانچ ہزار نقد مجھے بطور سلامی دیے ہیں۔ میں روکتی رہی مگر وہ نہیں مانی۔ اب ہم انھیں کیا دے کر رخصت کریں۔'' نادیہ نے تفصیل سے بتا کر مجھ سے پوچھا۔

''نقدی کی صورت میں بچوں کو دے دو اور کوئی گفٹ بھی دے دو۔'' میں نے رائے دی۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا گولڈ لاکٹ امبر کو دے دوں۔'' نادیہ نے کچھ رک کر بات مکمل کی۔

''جیسے آپ کی خوشی۔ جو آپ کا دل چاہے۔'' میں نے کہا۔ میری بات پہ وہ پھول کی طرح کھل گئی۔

پھر جب امبر اپنے ہم سفر کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی تو نادیہ سے گلے مل کر وہ رو سی دی۔ غم نم سی آنکھوں سے مجھے جھانک کر خدا حافظ کہا پھر نادیہ سے اصرار کر ڈالا کہ کب آ رہے ہو ہمارے گھر......؟

''آئیں گے بابا آئیں گے۔ اماں بیمار ہے نا اسی لیے۔ پھر کبھی۔'' نادیہ نے معذرت میں آہستہ سے کہا۔ پھر جاوید صاحب نے حویلی کا دروازہ پہلے سے پار کیا۔

امبر اس کے تعاقب میں آہستہ سے چل رہی تھی پلٹ کر دیکھا تو اس کی پیاس بھری نظریں بہت کچھ کہہ کر دروازے کے پار اتر گئیں۔

☆☆☆

اس سے اگلے روز شام کو پھر امی جان کو سانس لینے میں رکاوٹ اور بلڈ پریشر میں شدت کا اضافہ ہوا۔ شہر ڈاکٹر کے کلینک لے گئے۔ آکسیجن دی گئی۔ بلڈ پریشر کی مخصوص گولیاں دی گئیں۔ امی جان نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں۔ ڈاکٹر منصور بار بار یقین دہانی ولا رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں ہی طبیعت سنبھل جائے گی۔ مگر گیارہ بجے شب اس نے مایوسی کا اظہار کر دیا کہ اگر آپ کا دل چاہے تو کسی بڑے شہر کے ہسپتال جا سکتے ہو۔ مگر ایسا کرنا فضول ہوگا۔ بس اماں جی کے لیے دعا کریں۔ اور پھر شب کے آخری پہر میں اماں جان ہماری دنیا اندھیر کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے فضا میں اچھال دیا ہے۔ نا اب میرے سر پہ آسمان ہے اور نا قدموں کے نیچے زمین۔ اور میں سر کے بل غموں اور دکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہوں۔

امی جان پوری حویلی کو سونا کر کے اپنے دیس کیا سدھاریں۔ مجھے پورا گھر قبرستان لگنے لگا۔ ساری خوشیاں روٹھ گئیں۔ ہر سو غموں نے ڈھیرے ڈال دیے۔ نادیہ نے اماں کی موت کا سوگ ایسے منایا جیسے اس کی سگی ماں کا انتقال ہوا ہو۔ ایک ہفتے بعد ہی میری روانگی کا وقت آ پہنچا۔ سب کا اصرار تھا کہ میں ایک ماہ اور چھٹی لے کر یہاں گزار دوں اور امی جان کے چہلم کے بعد چلا جاؤں مگر مجھے تو پورا گھر کاٹ کھانے کو آ رہا تھا۔

نادیہ نے بڑی ہمت اور ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ائیر پورٹ پر سی آف کیا۔ وہاں کی مصروف زندگی نے مجھے اپنے اندر جذب تو کر لیا۔ مگر ذرا سی تنہائی یا کام کرتے ہوئے۔ اماں جان کا خیال بھی آتا تو پلکیں لرز کر نم ناک ہو جاتیں۔

نادیہ قدم قدم پر مجھے ڈھارس دیتی مگر گھر کا سارا نظام اس نے سنبھال لیا تھا۔ امی جان نے اس کے متعلق جو سوچا تھا۔ وہ اس پر پورا اتر رہی تھی اور سب گھر والوں کے ساتھ یوں گھل مل رہی تھی۔ جیسے وہ برسوں سے اس گھر میں رہنے کی عادی ہو۔ سب گھر والے اسی کی تعریفیں کر رہے تھے۔ نادیہ نے بتایا تھا کہ امی کے رسم سوئم اور رسم چہلم پر امبر آئی تھی اور چھم چھم روتی رہتی تھی۔

دو سال بعد میں لوٹ آیا۔ نادیہ نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ جرمنی جانا چاہتی ہوں۔ بلکہ وہ میرے باہر جانے پر بھی کچھ خوش نا تھی۔ میرا ابھی اپنی کمپنی سے ایگریمنٹ باقی تھا۔ نادیہ کے دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی اس عرصے میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ میں پھر لوٹ گیا۔ نادیہ اور گھر والوں نے کہہ دیا تھا کہ جو عرصہ باقی ہے وہ گزار لو اور پھر یہاں لوٹ آؤ۔''

مگر ہماری کمپنی نے برلن کے مضافات میں ایک بہت بڑے پراجیکٹ پر کام کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ جو کئی سالوں پر محیط تھا۔ مجھے بھی کمپنی نے تجربے کی بنیاد پر میرے اسکیل میں اضافہ کر کے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تو مجھے قبول کرنا پڑا۔ ہر سال چھٹی پر پاکستان چلا آتا۔

وقت کے لمحات ماہ و سال کی مسافتیں طے کرتے رہے اور میں تین بچوں کا باپ بن گیا جو اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔

☆☆☆

جانے کیوں پچھلے تین چار دنوں سے میری طبیعت پر مضمحل اور بے چین تھی اس روز میں بہت مضطرب اور پریشان تھا۔ ڈیوٹی سے اپنی رہائش گاہ پہنچا۔ ڈریس چینج کیا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر ایک میگزین کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ٹی وی پر بھی کوئی دلچسپی نظر نہیں آ رہی تھی۔ نادیہ سے بات کرنے کے لیے فون اٹھایا تو اس سے پہلے کہ میں نمبر ڈائل کرتا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ جانے کیوں گھنٹی کی آواز سن کر میرا دل دھک سا رہ گیا۔ میں نے رسیور اٹھایا اور بے تابی کی سی حالت میں بولا۔

''ہیلو...... کون؟'' فون

ابھر رہی تھیں۔ جیسے کوئی عورت چیخیں مار رہی ہے۔ بھپ بھپ کی آواز سے جیسے دروازہ پیٹا جاتا ہے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں بھی عقب سے ابھر رہی تھیں۔ میں متواتر ہیلو...... ہیلو پکار رہا تھا۔ پھر ایک غمزدہ سی عورت مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''بیٹا آپ عرفان! ہیں نا؟ غلام حیات خان کے بیٹے؟''

''جی...... جی ہاں...... مگر آپ کون؟'' میں نے جیسے درد سے بلبلا کر پوچھا۔

''آہ...... میں بدنصیب بیگم فیروز علی ہوں بیٹا۔ بیگم فیروز۔ انیتا کی ماں ہوں۔'' ساتھ ہی ضبط کے سارے بندھن اس سے چھوٹ گئے اور وہ بین کرکے رونے لگی۔

''خالہ...... خالہ جان...... پلیز خود کو سنبھالیے پلیز۔ مجھے کچھ بتایئے۔ آپ نے مجھے کال کیوں کی۔ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' میں حیرت زدہ سا متواتر انھیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر انھوں نے جی بھر کر اپنا غبار نکالا۔ اس عرصے میں کسی عورت کے چلانے اور دروازہ پیٹنے کی آوازیں مجھے صاف سنائی دیتی رہیں۔

''ہم برباد ہو گئے بیٹا۔ ان دس بارہ برسوں میں ہمارے گھرانے پر قیامتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ شاید آپ لوگوں کی بددعاؤں نے ہمیں تباہ و برباد کردیا۔ جب انیتا کو آپ نے طلاق دے کر فارغ کردیا تو اس کے لیے نئے سرے سے ایک جگہ رشتہ تلاش کیا گیا۔ لڑکا عمان میں کام کرتا تھا۔ شادی کے بعد انیتا اس کے ساتھ عمان چلی گئی۔ مگر شادی کے چھ ماہ بعد انکشاف ہوا کہ امجد نے گھر والوں سے جو اس شادی کر رکھی ہے۔ اور وہ دو بچوں کا باپ بھی ہے۔'' انیتا یہ سن کر آگ بگولہ ہوگئی اور غصے میں امجد کا گریبان پکڑ لیا۔ جس پر امجد نے اسے بہت مارا پیٹا۔ بے پناہ تشدد کیا اور گھر میں ایک قیدی کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ مگر انیتا نے اپنے بھائیوں کو ساری صورتِ حال بتا کر اس مصیبت سے رہائی پر مجبور کیا۔ اس کے بعد دونوں بھائی اپنی بہن کی زبانی

یہ صورت حال جان کر غم و غصے سے بھر گئے اور انگلینڈ سے ہی عمان جا پہنچے۔ امجد کو کمرے میں ڈال کر مار پیٹ سے اسے لب گور پہنچا دیا۔ چند روز اسے گھر میں رکھ کر اس کی ٹریٹ منٹ کرائی اور پھر امجد اور انیتا کا ٹکٹ کرا کر انھیں پاکستان بھیج دیا۔ راحیل وہاں سے انگلینڈ لوٹ گیا اور شرجیل ان کے ہمراہ ہی اسلام آباد پہنچ گیا۔ ٹیکسی میں امجد اور انیتا کو لیے وہ گھر آئے۔ رات کو امجد کا جسم گولیوں سے اڑا دیا گیا اور شب کے آخری پہر میں اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے دریا میں بند بوری کی صورت میں بہادی گئی۔ ایک ہفتے بعد شرجیل انگلینڈ لوٹ گیا۔ بدنصیب امجد گمنامی میں موت کے منہ چلا گیا یہ سب کچھ راز داری سے ہوا۔ مگر دلوں کا بھید جاننے والا اللہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ امجد کی پراسرار گمشدگی پر وہاں کے ایئرپورٹ سے تصدیق کردی گئی کہ پاسپورٹ اور کارڈ کا فرد فلاں تاریخ کو اپنی بیوی کے ہمراہ پاکستان جا چکا ہے۔ انیتا کو کچھ عرصے کے لیے کراچی بھیج دیا گیا تھا۔ امجد کے ورثا نے امجد اور انیتا کی گمشدگی کا کیس دائر کروادیا۔ تفتیش شروع ہوئی مخبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ انیتا اپنے میکے میں دیکھی گئی تھی۔ امجد کے اغوا کا کیس انیتا کے ابو پر کردیا گیا۔

تب میرے بیٹوں نے رشوت اور سفارش سے کام لے کر مقدمہ ختم کروانے کی بھرپور کوشش کی مگر فیروز علی نے امجد کے قتل کا اعتراف جرم کرلیا۔ شرجیل پر قتل کا کیس درج کرلیا گیا۔ انیتا کو پوچھ گچھ اور شامل تفتیش کر کے کچھ روز جیل جانا پڑا۔ مگر پھر اسے ضمانت پر رہا کروالیا گیا۔ اس حادثے سے اسے ذہنی جھٹکا لگا۔ اور وہ نیم پاگل سی ہوگئی۔ فیروز علی بیمار ہو گئے ان کی میڈیکل رپورٹ لے کر انھیں جیل سے ہسپتال منتقل کیا گیا جہاں زیر حراست اس کا علاج کیا جاتا رہا۔ وہیں انھیں فالج ہوگیا اور لگاتار دو سال وہ بستر مرگ پہ رہ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اس کی بیماری اور قتل کے مقدمے نے ہمیں کنگال کرنا شروع کردیا۔ شرجیل نے سیاسی پناہ لے کر خود کو انگلینڈ میں

محفوظ کرلیا۔ راحیل نے پاکستان آکر باپ کی موت کے تمام مراحل طے کرائے۔ شرجیل کی بیوی بچوں کو لے کر اپنے میکے جاچکی تھی۔ گھر کا سارا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ امجد کے بھائیوں کو پتا چلا کہ شرجیل کا بھائی راحیل ان دنوں گھر آیا ہوا ہے۔ وہ رات کو مسلح ہو کر آئے۔ راحیل کو آواز دے کر دروازہ کھلوایا اور گولیوں سے اس کا وجود چھلنی کر کے اپنی گاڑی میں فرار ہو گئے۔

اس سانحے نے ہماری کمر توڑ دی۔ انیتا پاگل ہو گئی۔ میرا آدھا جسم ناکارہ ہو چکا ہے۔ میں وہیل چیئر پر ہوں۔ شرجیل نے اپنی ساری پونجی ان مقدمات اور آنے جانے پر ختم کر دی جو پراپرٹی خریدی تھی وہ بھی بک گئی۔

گھر میں رکھی سہولت کی تمام چیزیں ایک ایک کر کے بک گئیں راحیل کی بیوی اپنا زیور اور نقدی لے کر میکے جاچکی ہے۔ شرجیل کی بیوی اپنے میکے میں ہے گھر میں انیتا اور میں ہوں۔

یہ جو چیخوں کا شور آپ کو سنائی دے رہا ہے یہ انیتا ہے جو حواس کھو چکی ہے۔ اسے علیحدہ ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ دروازہ پیٹ رہی ہے۔ کبھی اپنے ابو کو پکارتی ہے کبھی بھائیوں کو صدائیں دیتی ہیں۔ اور آج تو صبح سے عرفان، عرفان پکارے چلی جارہی ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ بیٹا! ہمیں معاف کر دو خدا کے واسطے ہمیں اور ہماری بیٹی کو معاف کر دو ہم نے آپ لوگوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ میری اولاد متکبر تھی اور تکبر کرنے والوں کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ آپ معاف کر دیں تو شاید میری بچی کو اللہ میاں بھی معاف کر دیں۔

بیٹا! اللہ کے نام پر ہمیں معاف کر دو۔''

خالہ پھر سے یوں دھاڑیں مار مار کر رو دیں۔ جیسے اس کی رگ رگ میں کانٹے چبھ رہے ہوں۔

میرا سارا وجود برف کی طرح سرد ہو چکا تھا۔ فون پر خالہ کے بین اور اس کے عقب میں ابھرتی انیتا کی چیخیں میری قوت سماعت میں تیر بن کر اترتی رہی تھیں۔

''مجھے نہیں جینا...... نہیں جینا مجھے پاپا۔ بھیا کہاں ہو سارے۔ دروازہ کھولو پاپا۔ مجھے جانا ہے۔ عرفان آرہا ہے۔ شرجیل بھائی ان کو لا رہے ہیں۔ وہ آنے والے ہیں۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو''

وہ چیخ رہی تھی اور...... اور میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رہ گیا۔ پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

تیسری طویل سچ بیانی

اناڑی

اقبال چشتی

اُس واردات کی سچ بیتی، جسے چند اناڑی انجام دے رہے تھے

میں ایک بینکر ہوں۔ اور ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوا ہوں۔ جب بھی فرصت کے لحات نصیب ہوں تو میں اکثر ان حسین یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ جو میں نے بینک میں سروس کے دوران اپنے ساتھیوں (مرد وخواتین) کے ساتھ ہنستے بولتے گزاری تھیں۔

آئے دن فلمیں دیکھنا۔ اچھے ہوٹلوں میں لنچ کرنا اور ہر ویک اینڈ پر آؤٹنگ کا پروگرام ہمارے معمولات میں شامل ہوا کرتا تھا۔ ہم سب ہنسی مذاق کرتے ہوئے بسا اوقات سنجیدگی بھی اختیار کر لیتے تھے۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب ہر روز بینکوں میں پڑنے والے ڈاکوں کی رُوداد بڑی تفصیل سے اخبارات میں شائع کی جاتی تھی۔

ڈاکوؤں سے کیسے نمٹا جائے۔ بینک کے پیسے کو لٹنے سے کیونکر بچایا جائے۔ عملے کی پروٹیکشن (حفاظت) کے لیے کون سے اقدامات کرنا ضروری ہے۔ یہ سب سوچنا تو حکومتی اور بینکوں کے اعلیٰ دماغوں کا کام تھا۔ ہماری سنجیدہ بحث تو خود ہی اپنی جانوں کی حفاظت پر دیر تک جاری رہتی تھی۔

یوں ہمارے دوستوں (مرد، خواتین) کے پاس موبائل موجود تھے۔ تاہم میرے پاس موجود موبائل ایک تحفہ تھا۔ جو میری سالگرہ پر لندن میں مقیم میرے دوست مشہود حسن نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ کیا کمال کی شے تھا وہ موبائل۔ بیسیوں فنکشنز کو سمجھنے اور انہیں آپریٹ کرنے کی غرض سے ایک کیٹلاگ (کتابچہ) بھی موجود تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی بھی ان فنکشنز کو سمجھنے اور آپریٹ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں دوستوں سے رابطے کی حد تک موبائل کو استعمال کرنے کا قائل تھا۔ البتہ موبائل کی جو خوبی مجھے پسند تھی۔ وہ تھی آوازوں کو فاصلے سے صاف وشفاف طریقے سے ریسیو کرنے کی صلاحیت۔ میں موبائل کا اسپیکر آن کر کے کال ریسو کرتا پھر بیس فٹ دور بیٹھ کر اپنا کام کرتا رہتا اور گفتگو بھی جاری رہتی تھی۔

موبائل کی اس خوبی کے بارے میں یوں بھی بتلانا ضروری سمجھا ہے کہ اسے زیادہ تر ایک مہلک زہر سے تشبیہ دی جاتی ہے جو نوجوان نسل کے جسمانی، اخلاقی اور قومی کردار کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے۔

آگ کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ اس کا غلط استعمال اکثر و بیشتر جسموں کے ساتھ ساتھ گردوں کو بھی جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ جبکہ صحیح استعمال ہمارے لیے راحت وسکون کا ضامن ہے۔ یہی مثال موبائل پر

بھی صادق آتی ہے۔ غلط استعمال کیے ذہنوں کی ہے۔ اخلاقی تباہی، خاندانوں کی بے عزتی اور بعض اوقات دو خاندانوں میں ہاتھا پائی، جگ ہنسائی کے ساتھ بات کورٹ کچہری تک بھی جا پہنچتی ہے۔ اس کے برعکس اب جو کچھ بھی بیان کروں گا اسے پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے آپ بھی موبائل جیسی اہم ایجاد اور اس کی ضرورت کے قائل ہو جائیں۔

میں مقامی بینک کے ریجنل آفس میں عرصہ پانچ

☆......☆......☆

صبح کے نو بجتے ہی بینک کا داخلی گیٹ کھول دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بینک کے بزنس آورز شروع ہوگئے۔ میں نے اپنی چیک پاسنگ آفیسر کی سیٹ سنبھالی اور چھوٹی بڑی رقموں کے چیک پاس کرنے لگا۔ میرے بائیں طرف قریب ہی سگنیچر کارڈز کیبنٹ رکھی ہوئی تھی۔ مجھے ایئرپورٹ برانچ میں ایک سال



سال سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اچانک میرا ٹرانسفر (تبادلہ) ایئرپورٹ برانچ میں کر دیا گیا۔ سب کولیگز نے مجھے فیرویل (الوداعی پارٹی) دی اور رخصت کرتے وقت بچشم نم یہ تاکید بھی کی کہ جب بھی حیدرآباد آؤں سب دوستوں سے ملنے ضرور آؤں۔

آہ...... آج بھی وہ خوشگوار یادیں دل و دماغ میں ہجوم کرلیتی ہیں تو دل عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگتا

ہو چکا تھا۔ اکثر بینک کسٹمر میرے جانے پہچانے تھے۔ تاہم نئے گاہک یا جن کے دستخطوں پر مجھے شبہ ہوتا میں ان کے ناموں کے سگنیچر کارڈز کیبنٹ سے نکال کر چیک پر محیط کیے گئے دستخط سے ٹیلی کرلیا کرتا تھا۔

ایئرپورٹ کی مصروفیت کے پیش نظر پولیس اسٹیشن بھی قائم تھا، اور بینک قریب ہی تھا۔ تھانہ انچارج مسٹر سکندر گوندل سے میری اچھی خاصی علیک

سلیکٹ ہو چکی تھی جو بعد ازاں گہری اور بے تکلف دوستی میں بدل گئی تھی۔

بینک کا دروازہ تقریباً پچاس فٹ دور تھا اور بالکل میری کرسی کی سیدھ میں تھا۔ دروازے پر ایک گارڈ تعینات تھا جو بینک کی حفاظت کے لیے تھا۔ ملک کے بگڑتے ہوئے حالات اور آئے دن بینکوں میں ہونے والی رہزنی کی وارداتوں نے ہم سب کو بہت محتاط کر رکھا تھا۔

میرا موبائل میز کی دراز میں بنے خفیہ خانے میں بحفاظت رکھا رہتا تھا۔ مجھے اگر اپنے دوستوں سے بات کرنی ہوتی تو میں ان کے نمبر موبائل پر ملاتا تھا۔ ورنہ میں ہمیشہ مسٹر گوندل (تھانہ انچارج) کا نمبر لائن پر رکھتا تھا۔

دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ لوگ کیش جمع کروا کر یا لینے کے بعد جا چکے تھے۔ اور بینک گاہکوں سے مکمل خالی ہو چکا تھا۔ میں نے تھکے اعصاب کو سکون دینے کے لیے کوفی منگوائی۔ اور وقفے وقفے سے سپ لیتا رہا۔ میں اس دوران کبھی کبھار بینک کے گیٹ پر بھی نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ مگ میں اب صرف دو تین سپ کوفی رہ گئی تھی۔ میں نے مگ ایک طرف سرکایا اور ٹشو پیپر سے ہونٹ خشک کرتے ہوئے ایک بار پھر گیٹ کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظریں گیٹ پر جم کر رہ گئیں۔

گارڈ نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اور ایک بہت اسمارٹ سی محترمہ نیلی ساڑی میں ملبوس کندھے پر ایک خوب صورت پرس لٹکائے بینک میں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ آٹھ دس قدم اندر آنے کے بعد اچانک رُکیں اور اطراف پر گہری نظریں ڈالتے ہوئے ہال کا جائزہ لیتی رہیں۔ تب وہ پلٹیں گارڈ کو اشارے سے قریب بلایا اور اس سے سرگوشیوں میں کچھ باتیں کرتی رہیں۔ انھوں نے رُخ بدلا اور منیجر چیمبر کی طرف چل دیں۔ میں نے یہ سوچ کر زیادہ توجہ نہ دی کہ ہوسکتا ہے وہ منیجر صاحب کی ملنے والی ہوں۔

دریں اثناء بینک کے ایک بہت معزز کسٹمر جناب بیگ صاحب بینک میں داخل ہوئے۔ وہ جونہی منیجر چیمبر کی جانب بڑھتے گارڈ نے ان کو روک دیا۔ وہ چند لمحے بیگ صاحب سے باتیں کرتا رہا پھر گارڈ نے بیگ صاحب کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔

''آئیے بیگ صاحب تشریف لائیے۔'' میں نے سیٹ سے اُٹھ کر بیگ صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے انھیں کرسی پیش کی۔

''فرمایئے کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' بیگ صاحب کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

''بس علی میاں۔ کچھ رقم نکلوانی تھی۔ یہ پہلا اتفاق ہے کہ سیکورٹی گارڈ نے منیجر صاحب کے پاس جانے سے روک دیا ہے۔'' بیگ صاحب کے جواب میں شکایت کا عنصر بہت نمایاں تھا۔

''میں گارڈ کی اس حرکت پر معذرت خواں ہوں۔ البتہ اس آپ کو کیا کہہ کر روکا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کہہ رہا تھا کہ کوئی محترمہ منیجر صاحب کے پاس پانچ ہزار کا کھلا لینے گئی ہیں۔'' بیگ صاحب نے جو جواب دیا اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ اوّل تو محترمہ بینک کی کسٹمر نہیں تھیں۔ دوسرے انھیں اپنے بڑے نوٹوں کی عوض چھوٹی کرنسی درکار تھی تو انھیں سیدھا ہال میں بنے ہوئے کیش کاؤنٹر پر جانا چاہیے تھا۔ جہاں ان کی ضرورت پوری کردی جاتی۔ منیجر صاحب کا نوٹوں کے کھلا کرانے سے کیا واسطہ۔ بہر حال میں نے بیگ صاحب کی تھنڈے سے تواضع کروا کر ان کی مطلوبہ رقم دلوا دی اور بیگ صاحب میرا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی سیکیورٹی گارڈ بھی باہر نکلا تھا اور میں نے اسے کسی کو اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد تین خوش پوش نوجوان بینک میں داخل ہوئے۔ انھوں نے کیش کاؤنٹر سے ہزار والے نوٹ کے بدلے چھوٹے نوٹ لیے اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ کر بظاہر جسے کچھ کرنے میں مصروف نظر آنے لگے۔ اس دوران وہ نظریں اُٹھا کر ہال میں ہر طرف کا جائزہ بھی لے لیتے تھے۔

کچھ دیر بعد ان میں سے ایک جوان اٹھا اور منیجر صاحب کے چیمبر کی سمت چلا آیا۔ میں ایک [illegible]

چونک پڑا۔ بات ہی ایسی تھی۔ بیگ صاحب کا شمار بینک کے بہت معزز گاہک میں ہوتا تھا۔ ان کا بہت ہیوی بیلنس ہر وقت برانچ میں موجود رہتا تھا۔ تاہم گارڈ نے انھیں منیجر صاحب سے ملنے نہیں دیا تھا۔ جبکہ اس نوجوان کو گارڈ نے نہیں روکا تھا جو منیجر چیمبر میں داخل ہو چکا تھا، اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے کسی نامعلوم خطرے کا بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے دراز کا خفیہ خانہ کھولا اور موبائل آن کر کے آواز قدرے دھیمی کر دی۔ دوسرے ہی لمحے موبائل کی اسکرین پر روشن ہوئی اور اس میں مسٹر گوندل کے نمبر چمکنے لگے۔

''ہیلو۔'' دوسری بیل پر مسٹر گوندل کی آواز سنائی دی تھی۔

''خطرہ! مسٹر گوندل مجھے کسی نامعلوم خطرے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔''

''گھبراؤ مت علی۔ خطرے کی نوعیت بتلاؤ۔'' مسٹر گوندل فوراً ہی الرٹ ہو گئے۔

میں نے شروع سے آخر تک پوری تفصیل سے مسٹر گوندل کو آگاہ کیا۔ اس دوران وہ میری سرگوشیاں بہت غور اور توجہ سے سنتے رہے تھے۔

''علی! یہ مجھے کوئی اناڑی ڈاکو لگتے ہیں۔ ورنہ پیشہ ور ڈاکو تو آتے ہی کھٹیا کھڑی کر دیتے ہیں۔'' مسٹر گوندل تھوڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد بولے۔

کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے دونوں جوان میرا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ میں ہاتھ کے انگوٹھے کے جوڑوں پر حرکت دیتے ہوئے ظاہر کر رہا تھا جیسے حساب کتاب چیک کر رہا ہوں۔ وہ میرے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر یہی سمجھے تھے کہ میں حساب ہی چیک کر رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد میں نے مسٹر گوندل کو مخاطب کیا۔

''مسٹر گوندل! میری ایک تجویز ہے۔ آپ اپنا موبائل آف مت کرنا بلکہ کان سے لگائے یہاں پر ہونے والی کارروائی نوٹ کرتے رہنا۔ میں بھی اپنا موبائل آن رکھے ہوئے ہوں تاکہ آپ کو اپنا لائحہ عمل تیار کرنے میں دشواری نہ ہو۔

''ان کی صحیح تعداد بتلا سکتے ہو اور ان کے پاس

کون سا اسلحہ ہے؟'' مسٹر گوندل کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''نہ تعداد اور نہ اسلحہ فی الحال میں خود اندھیرے میں ہوں۔ البتہ میں گفتگو اس ڈھنگ سے کروں گا جس سے ان کی تعداد، اسلحہ اور وہ کس انداز میں رہزنی کرنا چاہتے ہیں۔ تمھیں سب معلوم ہو جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تھانے میں مکمل خاموشی رہے۔''

اسی اثناء میں میری میز پر رکھا ہوا انٹرکام بج اٹھا۔

''مسٹر گوندل منیجر صاحب کی کال ہے۔ اب تم خاموشی سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے رہو۔'' میں نے انٹرکام کا ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''یس سر۔''

مسٹر علی آپ ذرا میرے پاس تشریف لائیں۔'' منیجر صاحب کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

''بہت بہتر ہے میں ابھی حاضر ہوا۔'' میں نے ریسیور رکھ کر انتہائی صفائی سے موبائل نکال کر موزے میں رکھا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے ہی کرسی پر وہ محترمہ تشریف فرما تھیں البتہ وہ جوان جسے میں منیجر چیمبر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ نظر نہیں آیا تھا۔ میں جونہی چیمبر میں داخل ہوا۔ میری توقع کے عین مطابق میرے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور کوئی سخت سی شے میری کمر میں چبھنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ سخت شے ریوالور کی نال تھی۔

''چپ چاپ کرسی پر بیٹھ جاؤ چالاکی دکھانے کا انجام کوئی اندر دم باہر۔ سمجھ گئے؟'' یہ وہی جوان تھا جو میری آمد سے پہلے دروازے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ میں نے ایک نظر میں منیجر صاحب اور محترمہ کا جائزہ لیا۔ منیجر صاحب کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ جبکہ منیجر نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے خبردار بھی کیا تھا۔ محترمہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میرے موبائل سے دوسری جانب پولیس اسٹیشن پر تمام گفتگو بہت خاموشی سے سنی جا رہی تھی۔ مجھے اب اس انداز میں گفتگو کرنی تھی جس کی مدد سے مسٹر گوندل کو ڈاکوؤں کی تعداد اور اسلحے کا اندازہ ہو جائے۔ لہٰذا میں نے ان پوائنٹس کو ذہن میں رکھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں اور ہمیں گن پوائنٹ پر بے بس کرنے کا مطلب؟'' میں نے سوال کیا۔

''مطلب بھی سمجھائے دیتے ہیں چیک پاسنگ آفیسر صاحب۔'' محترمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں آپ دو بندے اتنی آسانی سے لوٹ مار کر کے فرار ہو جائیں گے۔''

''ہم دو نہیں چار بندے ہیں۔ دو باہر صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ہم سب ریوالوروں سے مسلح ہیں۔''

''تو تم سب آتے ہی کیش کاؤنٹر میں ہلہ بول دیتے۔ منیجر صاحب کے پاس آنے کی کیا تک تھی؟'' میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

''ہم بے وقوف نہیں ہیں اور نہ ہی عام ڈاکوؤں کی طرح ڈاکہ ڈالیں گے۔ ہم بڑی پلاننگ سے آئے ہیں اور چیک کے ذریعے رقم نکلوا کر رفو چکر ہو جائیں گے۔'' میرے سب سوالوں کے جوابات محترمہ ہی دے رہی تھیں۔

چیک کا سن کر میں چونکا اور سوال کر بیٹھا۔ ''مگر آپ تو ہماری کسٹمر نہیں ہیں؟''

''میں نہ سہی! تاہم وہ سرکاری ادارہ تو آپ کا گاہک ہے جس کا چیک میں لے کر آئی ہوں۔'' اتنا کہہ کر محترمہ نے میز پر رکھا ہوا بیگ اپنی طرف سرکا کر اس کی زپ کھولی اور چیک نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''چیک کو پاس کریں۔''

میں نے چیک لے کر ایک نظر اس پر ڈالی پھر چیک کے بارے میں منیجر صاحب کو بتلایا تھا۔ تاکہ مسٹر گوندل بھی چیک کی حقیقت سے آشنا ہو جائیں۔

''سر! یہ چیک تو اسی سرکاری محکمے کا ہے جس کا

بند سم اماؤنٹ ہماری برانچ میں ہے۔ اس چیک کی گمشدگی کی رپورٹ مع چیک نمبروں کے ابھی گزشتہ روز ہی موصول ہوگئی تھی، اور لیجر پر کاشن بھی مارک کیا جاچکا ہے۔'' یہ سن کر محترمہ کا ساتھی جھنجھلا گیا اس نے ریوالور کا رخ منیجر صاحب کی سمت کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

''اپنے آفیسر سے کہو چیک پاس کرے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں صرف تین تک گنوں گا اگر تم لوگوں نے ہدایت پر عمل نہیں کیا تو دونوں کو بے دریغ گولی مار دوں گا۔'' اس نے سیفٹی کیچ ہٹایا۔

منیجر صاحب نے مجھے پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے چیک پاس کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے چیک پر نظر ڈالی رقم مبلغ بیس لاکھ روپے تھی۔ تاریخ بھی آج ہی کی تھی اور محکمے کے A.O (اکاؤنٹ آفیسر) کے دستخط بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے چیک پاس کر کے خاموشی سے منیجر صاحب کے دستخط کے لیے ان کے سامنے رکھ دیا۔ (اگر چیک کی رقم دس ہزار سے اوپر ہو تو پاسنگ آفیسر اور منیجر دونوں کے دستخط ہوتے ہیں) منیجر صاحب نے دستخط کر کے چیک ڈاکو کی طرف بڑھا دیا۔

''نازنین تم چیک لے جا کر کاؤنٹر سے کیش کروالو میں اس دوران ان دونوں کو روکے رکھتا ہوں۔ محترمہ کے جانے کے بعد ڈاکو نے دوسری ہدایت اب منیجر کو دی۔

''انٹر کام اٹھاؤ اور کیشئر کو ہدایت دو کہ وہ بڑے نوٹوں کی شکل میں رقم جلد از جلد محترمہ کو دے دے۔'' منیجر صاحب نے مجبوراً کیشئر کو ہدایت جاری کر دی۔ میں دل ہی دل میں ان لوگوں کی جامع منصوبہ بندی کی داد دیے بغیر نہ رہا تھا۔

بیس منٹ گزر چکے تھے ہم دونوں موت کی سولی لٹکے ہوئے اپنے اپنے انجام کا سوچ رہے تھے۔ گوندل صاحب ابھی تک ایکشن میں نہیں آئے تھے۔ باہر سے کسی شور شرابے کی آوازیں بھی سنائی دینی ناممکن تھیں کیونکہ منیجر چیمبر مکمل ساؤنڈ پروف تھا۔

اچانک میز پر رکھا ہوا انٹر کام بج اٹھا۔ منیجر صاحب نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور پھر ڈاکو کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری جانب غالباً محترمہ تھیں جو کامیابی کی نوید سنا رہی تھیں۔ ڈاکو کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ تیزی سے کھڑا ہوا اور جیب سے ڈوری نکال کے مجھے منیجر صاحب کو کرسی سے باندھنے کا حکم دیا۔ بعد ازاں اس نے ٹیپ بھی دی کہ منیجر صاحب کے منہ پر چپکا دوں۔ تب اس نے یہی عمل مجھ پر بھی آزمایا تھا۔

ہم دونوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھتا ہوا وہ ہمیں گڈ بائے کہہ کر جونہی چیمبر کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ دروازے کے ڈور کے عقب پہ چھپے ہوئے تربیت یافتہ پولیس اہلکاروں نے بڑی پھرتی سے بندوقوں کے بٹ اس ڈاکو کے سر پہ مارے تھے۔ ڈاکو اس اچانک پڑنے والی افتاد سے لہراتا ہوا فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ پولیس اہلکاروں نے اس کی تلاشی لی اور ریوالور برآمد کر لیا۔ تب وہ اسے گھسیٹتے ہوئے اس کے دوسرے ساتھیوں کے پاس لے گئے۔ جو محترمہ سمیت پہلے ہی پولیس کی حراست میں آ چکے تھے۔

چند لمحات مزید گزرنے کے بعد مسٹر گوندل مسکراتے ہوئے چیمبر میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے اہلکاروں کی مدد سے ہم کو بندشوں سے آزاد کرایا اور ہمیں لینے باہر آ گئے۔ ہم حیرت میں ڈوبے ہوئے ڈاکوؤں کو دیکھنے لگے جو ہال میں مرغا بنے ہوئے تھے۔

''ہوں! اب بتاؤ چوری کی یہ واردات کیوں اور کس کے کہنے پر کی تھی؟'' مسٹر گوندل نے ایک ڈاکو کے بال پکڑ کر زبردست جھٹکے دیتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ..... وہ جناب ہم لوگ روزانہ اخبارات میں بینک ڈکیتی کی کامیاب وارداتوں کے بارے میں پڑھتے تھے تو ہم لوگوں نے بھی مل کر یہ پلان بنایا تھا۔''

''اور یہ سرکاری چیک تم نے کیسے حاصل کیا؟''

''جس محکمے کا یہ چیک ہے اس کے چپراسی بنے اکاؤنٹ آفیسر صاحب کی دراز سے اڑایا تھا۔''

''تم لوگ کرتے کیا ہو۔شکلوں سے تو ڈاکو نہیں لگتے ؟'' اس مرتبہ منیجر صاحب نے سوال کیا تھا۔

''سر! ہم مقامی کالج میں بی اے فائنل کے اسٹوڈنٹ ہیں۔''

''کم بختوں کاش تم نے تعلیم کا اصل مفہوم سمجھ کر اسے کسی تعمیری کام میں استعمال کیا ہوتا۔'' مسٹر گوندل تاسف بھرے لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''ہم پر رحم کریں سر! ہمارا کیریئر تباہ برباد ہو جائے گا۔'' ڈاکو ہاتھ جوڑنے لگے۔

''یہ ڈاکہ ڈالنے سے قبل سوچنا چاہیے تھا۔ اب لمبی مدت کے لیے جیل میں چکی پیسنے کو تیار ہو جاؤ۔ جمال ان سب کو لے کر لاک اپ میں ڈال دو۔'' سکندر گوندل صاحب نے اپنے اے ایس آئی کو حکم دیا۔ اور وہ یس سر کہہ کر پولیس کی تحویل میں ان چاروں کو تھانے لے کر چلا گیا۔

''مسٹر گوندل! میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آپ کو اس ڈکیتی کی اطلاع کیسے ملی؟'' منیجر صاحب نے مسٹر گوندل سے سوال کیا۔

''بھئی خطرے کی اطلاع تو مسٹر علی نے دی تھی باقی سارا کام اس موبائل کا تھا جس نے پولیس کارروائی کی راہ ہموار کی۔'' مسٹر گوندل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

منیجر صاحب نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے موبائل نکال کر اسے آف کر کے منیجر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔

منیجر صاحب کیڈلک اور موبائل کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیتے رہے۔

''مسٹر علی یہ وہی موبائل ہے نا جو آپ کے کسی عزیز یا دوست نے باہر کے ملک سے آپ کو گفٹ کیا ہے۔ اتنے زیادہ قیمتی موبائل سیٹ فی الحال یہاں دستیاب نہیں ہیں۔'' منیجر صاحب نے جو موبائل مسٹر گوندل کو دیتے ہوئے کہا۔

''آپ درست فرما رہے ہیں سر۔'' میں نے جواب دیا۔

''واقعی کیا کمال کی شے ہے۔ یہ آلہ اتنا حساس ہے کہ میں نے بیگ کی زپ کھلنے کی آواز صاف سنی تھی۔ اور سیفٹی کیچ ہٹنے کی آواز پر تو میں فوراً ہی ایکشن میں آ گیا تھا۔ مسٹر علی آپ کے اس موبائل کا شکریہ جس نے میرے کندھے پر مزید ایک پھول کھلانے کی راہ ہموار کر دی۔''

اور مسٹر علی کی پروموشن کے چانسز بھی برائٹ ہو چکے ہیں۔ میں آج ہی ساری رپورٹ اور سیکورٹی گارڈ کی حرکتوں پر دفتری کارروائی کے لیے بنا کر ہیڈ آفس روانہ کر رہا ہوں۔'' منیجر صاحب نے میری پشت تھپکتے ہوئے کہا۔

''مسٹر علی میں نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ یہ واقعی اناڑی ڈاکو تھے۔ ورنہ اتنا وقت نہ برباد کرتے۔'' گوندل صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''مسٹر گوندل آپ کا اندازہ کسی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن بینک کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھا جائے تو یہ بہت بہترین پلاننگ تھی۔''

''وہ کیسے؟'' مسٹر گوندل چونک کر بولے۔

''وہ ایسے کہ ڈاکو چیک کے ذریعے رقم نکلوا کر لے جا رہے تھے اور ہم مجبور تھے۔ تاہم وہ دو جگہوں پر دھوکہ کھا گئے تھے ان کی پہلی غلطی تو یہ تھی کہ سرکاری پیسہ چاہے پانچ ہزار روپے ہی کیوں نہ ہو۔ محکمے کی گاڑی کے ہم راہ باقاعدہ باوردی گارڈ آتا ہے۔ دوسری غلطی ۔بیس لاکھ روپے کی رقم معمولی رقم نہیں ہوتی ۔ چیک پر سائن کرنے سے پہلے منیجر متعلقہ محکمے سے کنفرم کرتا ہے کہ چیک آفر کر دیا جائے یا نہیں۔ یا محکمے کا سربراہ فون پر خود تصدیق کرتا ہے کہ رقم چیک لانے والے شخص کو ادا کر دی جائے۔''

بھئی ہم دونوں کو تو ایڈوانس پروموشن مبارک ہو۔ ابھی تو لمبی کارروائی کرنی ہیں ہمیں متعلقہ محکمے کے چپراسی اور بینک گارڈ کی گرفتاری عمل میں لانی ہے۔ تاہم ان سب سے پہلے پیٹ پوجا۔'' کہہ کر گوندل صاحب اور ہم ان لوازمات کی جانب متوجہ ہو گئے جو چپڑاسی میز پر سجا چکا تھا اور جس کا آرڈر منیجر صاحب پہلے ہی دے چکے تھے۔

☆☆☆

وہ سات دن

نوشابہ نوش

معاشرے کے چہرے کو بے نقاب کرتا ایک روح فرسا سچ

اس دن کراچی میں شدید گرمی کی وجہ سے دفتر آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ صرف میں، میرے علاوہ چار اور لوگ اور ایک ریسیپشنسٹ۔ عادتاً کم گو ہونے کی وجہ سے میرا زیادہ تر وقت اپنے کمرے ہی میں گزرتا تھا۔ میں اس وقت اپنے لیپ ٹاپ پر کام کر رہی تھی۔ جب دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔



”جی“ میں نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

آنے والی ریسیپشنسٹ تھی۔ ”میں یہاں نماز پڑھ لوں؟“ اس نے بہت شائستگی سے پوچھا۔ ”نیچے کا فیز اڑ گیا ہے۔ آپ کے روم میں اے سی کی وجہ سے تھوڑی سی ٹھنڈک ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر لیپ ٹاپ پر نگاہیں جما دیں۔

پھر میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ میں شائد اسے پہلی بار اتنی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس نے دوپٹے کو سر پر جمایا نماز کے لیے تو میں اس کے سراپے کو دیکھتی رہ گئی۔ سڈول تراشا ہوا جسم، صراحی دار گردن، ایسی گوری رنگت کہ وضو کے پانی سے تر گالوں پر موتیوں کے قطرے محسوس ہو رہے تھے۔ جیسے بارش ابھی ابھی تھمی ہو۔ گلابی قمیص، سفید شلوار، دو کالی سوئی پٹی والی چپل، جنہیں اس نے اتار کر جا نماز سے

کچھ فاصلے پر رکھ دیا تھا۔ اتنا سادہ لباس اور ایسی خوبصورتی! میں لیپ ٹاپ کو بھول کر اسی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ جب تک وہ نماز سے فارغ نہیں ہوئی۔ میں اس کو دیکھتی رہی تھی۔ اس نے ساری چیزیں سلیقے سے سمیٹیں اور میرا شکریہ ادا کر کے جب جانے لگی تو میں نے اس سے کہا۔

''اگر نیچے جگہ نہ ہو۔ لائٹ کا مسئلہ ہو۔ یا کسی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکو۔ تو میرے کمرے میں آ کر نماز پڑھ لیا کرو۔ اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جی ٹھیک۔'' اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ دروازے تک پہنچی تو میں نے آواز دے کر روک لیا۔ ''راعش ادھر آؤ۔''

وہ میرے پاس آ گئی۔

میں نے ایک چٹ پر ایک نمبر ملا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو۔ یہ ایک نمبر ہے۔ ملا کر میرے کمرے میں ٹرانسفر کر دو...... اور یہ دو پیپرز ہیں۔ ان کو فیکس کر دینا۔ اسی نمبر پر۔''

جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اس نے میری بات سنی اور میز سے پیپرز اور چٹ اٹھا کر بولی۔

''جی ٹھیک میم۔ میں یہ ابھی کر دیتی ہوں۔''

پھر وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

راعش پچھلے چھ مہینوں سے ہمارے آفس میں کام کر رہی تھی۔ ایک سادہ مزاج کی لڑکی تھی۔

میں نے اس سے پہلے اس کو اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ جتنا آج دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

زندگی کی مصروفیات کچھ اس طرح الجھا دیتی ہیں کہ اپنے آس پاس دیکھنے کا وقت ہی نہیں دیتیں۔ دفتر کی مصروفیات، الجھنیں، کام اور صرف کام۔ زندگی کے بہت سے خوش گوار مناظر نگاہوں سے اوجھل کر دیتے ہیں۔

اس دن چونکہ کام بہت کم تھا۔ اسی لیے میں نے ڈرائیور کو جلدی بلا لیا تھا۔ نیچے سیڑھیاں اترتے ہوئے عثمان صاحب کی زوردار آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے شیشے سے دیکھا۔ وہ راعش کو کسی بات پر ڈانٹ رہے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن گرمی کافی کم تھی۔ دفتر میں بھی معمول کے مطابق لوگ آئے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے کاموں میں مصروف رہی۔ میٹنگز، فائلیں۔ وغیرہ۔

لنچ پر میں نے اور روبیسا نے کچھ زیادہ ہی آرڈر کر دیا۔ روبیسا میرے ساتھ ہی ہوا کرتی تھی۔

لنچ آ جانے کے بعد خیال آیا کیوں نہ راعش کو بھی بلا لیا جائے۔ تاکہ کھانا ضائع نہ ہو۔

بلانے پر اس نے انکار کر دیا تھا کہ باس ناراض ہوں گے کہ اپنی سیٹ سے کیوں اٹھی۔ اس پر میں خود جا کر اسے بلا کر لے آئی۔ ہم کھانا کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ اس نے بہت کم اپنی پلیٹ میں لیا تھا۔ اور ہر نوالے کو اس طرح چبا چبا کر آہستہ آہستہ کھا رہی تھی جیسے چیونگم چبا رہی ہو۔

اس کی خوبصورت گھنی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ سامنے خلا میں دیکھنے لگتی۔ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

ہلکے رنگ کا فیروزی کرتا، وہی سفید شلوار، شیفون کا دوپٹہ اور اس کا اداس چہرہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔

اسے گم صم دیکھ کر میں نے کیک کا پیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ لو۔ اسے جلدی سے ختم کرو۔''

میں نے اسی لئے بلایا تھا کہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکے۔

''بس۔ مجھ سے اور نہیں کھایا جائے گا۔'' اس نے معذرت کی۔ ''شکریہ میم۔''

اس نے ایک بار اور معذرت کی اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ میں نے اسے نہیں روکا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عثمان صاحب کی ناراضگی کے ڈر سے چلی گئی ہے۔ اسی لئے میں نے برا نہیں مانا۔

اس کے جانے کے بعد روبیسا نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ بہت روڈ ہے۔ اس سے کوئی زیادہ بات نہیں کرتا۔ کچھ زیادہ ہی سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ اس

کوغلط فہمی ہے کہ بہت خوبصورت ہے۔ ہونہہ۔''
''خوبصورت تو وہ ہے۔ اور دلکش بھی۔'' میں نے رومیسا کو چھیڑا۔
''پتا نہیں کیوں تمہیں اس پر پیار آ گیا ہے۔ خیال رکھنا ایسے لوگ بہت گھنے ہوتے ہیں۔ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔''
اس وقت مجھے ایک اور بات کا اندازہ ہوا کہ لوگ کسی کے بارے میں بغیر جانے ہوئے۔ کچھ بھی بول سکتے ہیں۔ کوئی بھی رائے دے سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ورنہ وہ گلے پڑ جاتی کہ میں اس لڑکی کی طرف داری کیوں کر رہی ہوں۔
اس نے سیون اپ کی بوتل میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پیون کو بھیج رہی ہوں کہ تمہاری ٹیبل صاف کر دے۔''
وہ بوتل اٹھا کر کمرے سے چلی گئی۔
رومیسا کا گھر میرے گھر سے آگے تھا۔ جب بھی میرے یہاں گاڑی کی ضرورت ہو جاتی تو میں رومیسا کے ساتھ ہی اپنے گھر ڈراپ ہو جایا کرتی۔ کبھی کبھی ہم راستے کے کسی ریستوران میں بیٹھ بھی جایا کرتے۔ عام طور پر دوپہر لنچ اور شام کی چائے میرے کمرے میں ہی آ کر پیا کرتی تھی۔
اس سہ پہر جب ہم چائے کے لئے اپنے مخصوص ریستوران میں بیٹھے۔ تو چائے کے دوران حالات پر باتیں کرنے لگے تو میں نے کہا۔ ''رومیسا۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے راعش کے لئے جو سمجھا ہو۔ وہ ایسی نہ ہو۔ تمہارا اندازہ اس کے بارے میں غلط ہو۔
''تم اس کے تیور بھی تو دیکھو۔'' رومیسا نے کہا۔ وہ صرف ایک ریسپشنسٹ ہے۔ لیکن دور دور اس طرح رہتی ہے۔ جیسے ہم اسے کوئی نقصان پہنچا دیں گے۔ یا وہ کوئی ایسی کروڑ پتی لڑکی ہو جو صرف ٹائم پاس کرنے کو جاب کر رہی ہو۔''
''رومیسا۔ تم اس بے چاری کی مجبوری بھی تو دیکھو۔ اس کی جاب بھی ایسی ہے کہ وہ کسی سے گپ شپ نہیں کر سکتی۔ اور یہ اچھی بات ہے نا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔''
''تب ہی عثمان صاحب کے دفتر میں روزانہ اس کی پیشی ہوتی ہے۔ رومیسا اس وقت بہت غصے میں تھی۔ اسے شائد اس لئے غصہ آ رہا ہو گا کہ میں کیوں اس لڑکی کی فیور کر رہی ہوں۔ اس نے اسی عالم میں ویٹر کو بلا کر پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو چائے کے پیسے۔''
''باجی۔ ساٹھ روپے بنتے ہیں۔''
''ساٹھ کیوں؟ ہم تو پچاس میں پیتے ہیں۔''
''باجی ایک کپ میں کا کر دیا ہے۔'' ویٹر نے کہا۔ ''مہنگائی جو بڑھ گئی ہے۔''
میں نے فوراً باقی کے دس روپے دے کر جان چھڑائی۔ تا کہ رومیسا کا پارہ اور نہ چڑھ جائے۔ ہوٹل سے آگے بڑھے تو اچانک ایک سگنل پر میری نظر ایک رکشہ پر گئی۔ جس میں راعش بیٹھی تھی۔ میں تو خاموش رہی۔ لیکن رومیسا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً تبصرہ کیا۔
''یار بڑی عمر ہے تمہاری ریسپشنسٹ کی۔ لیکن یہ کیا ایک کروڑ پتی رکشہ میں جا رہی ہے۔''
''ایسا نہیں کہتے یار۔'' اب مجھے اس کی باتوں پر غصہ آنے لگا تھا۔
''بات کیا ہے۔ اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی ہے اس سے؟ رومیسا نے طنز کیا۔
''کیوں کہ میں کسی کے بارے میں پہلے سے کوئی رائے قائم نہیں کرتی۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

اس دن ہیڈ آفس سے میٹنگ ختم کر کے جب میں اپنے کمرے میں واپس آئی تو راعش نے انٹر کام پر مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ میرے کمرے میں آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔
''تمہیں اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم آ جایا کرو۔''
کچھ دیر بعد وہ میرے کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کارڈ تھا۔ اس

نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میم۔ یہ شادی کا کارڈ ہے۔ اور یہ لسٹ ہے۔ اس پر سائن کر دیں۔ تاکہ پتا چلے کہ کارڈ آپ کو مل گیا ہے۔''

''شادی کا کارڈ؟ تمہاری شادی کا ہے؟ میں نے پوچھا۔

نہیں میم۔ یہ سر شاہ زیب کی شادی کا ہے۔ انہوں نے مجھے بانٹنے کو دیے ہیں۔ اور ایک بات اور ہے میم۔

''وہ کیا ہے؟''

''یہ کارڈ رومیسا میم کو آپ دے دیں اور ان کی طرف سے ریسیوڈ لکھ دیں۔''

''تم خود کیوں نہیں دے دیتیں؟

''وہ پتہ نہیں کیوں مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہتی ہیں۔ سلام کا جواب بھی ڈھنگ سے نہیں دیتیں۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوگی۔ اسی لئے وہ کارڈ میں نے لے لیا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ میں اسے دے دوں گی۔''

اس کے ہاتھ میں اور بھی کارڈز تھے۔ ''چلتی ہوں میم۔ اور بھی کارڈز دینے ہیں۔'' وہ چلی گئی۔

☆☆☆

اتوار کے روز میری آنکھ رومیسا کے فون سے کھلی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ گزشتہ رات بھائی اور بھابی کو لینے ائیرپورٹ گئی تھی۔ جو ایک عرصہ بعد آسٹریلیا سے لوٹے تھے۔ ان کو لانے، پھر ان کے ساتھ گپ شپ میں صبح ہی ہو گئی تھی۔

میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''ہیلو؟ کیا سین ہے یار؟'' رومیسا کی گرجدار آواز نے میری نیند اڑا دی۔ تمہارے میرے ساتھ مارکیٹ بھی جانا ہے۔

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے کیا بھول گئیں؟'' شام کو شاہ زیب کے یہاں اس کی شادی میں شریک ہونا ہے۔

''یار وہ تو رات کو ہے نا؟''

''ہے تو رات کو۔ لیکن میرے پاس کوئی نیا ڈریس نہیں ہے۔ بوتیک میں سلیکشن میں دیر ہو جائے گی۔''

☆☆☆

اس رات شادی کے ہنگاموں نے ذرا سی دیر کے لئے غم دنیا سے نجات دلا دی تھی۔

ہر طرف چمکتے دمکتے، خوشیوں سے بھرے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے رائش کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔

صبح دیر سے دفتر پہنچی تھی۔ رائش اپنی سیٹ پر تھی۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے فون کر کے بلا لیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ کیا پرابلم تھی۔ وہ کل کیوں نہیں آئی تھی۔

''میم میں ایک معمولی سی ریسپشنسٹ ہوں نا۔ اسی لیے اس کا لہجہ سرد بھی تھا۔ اور اس میں دکھ بھی چھپا ہوا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیوں نہیں آئی ہوگی۔ اس موضوع کو بدلتے ہوئے میں نے کل کی اپنی ڈریسنگ کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ ایک بے خودی کے عالم میں بولتی جا رہی تھی۔

''میم۔ اگر میں بھی آپ جیسی کسی سیٹ پر ہوتی نا تو مجھے بھی بہت سے دعوت نامے آتے۔ لیکن کیا کروں۔ میں جس جگہ بیٹھی ہوں۔ وہاں اگر کوئی سلام کا جواب دے دے۔ تو میرے لئے بڑی بات ہوتی ہے۔ اس طرح کے رویے ہم جیسوں کے لئے ہوتے ہیں۔ ہمیں کوئی انسان ہی نہیں سمجھتا۔ اور میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے خود کو اس کا عادی بنا لیا ہے۔ اور مجھے کسی سے کوئی امید بھی نہیں ہے۔''

اس کے کمرے سے جانے کے بعد بہت دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ شام کو رومیسا کے ساتھ واپس آتے ہوئے میں نے جب اسے رائش کی باتیں بتائیں۔ تو وہ منہ بنا کر بولی۔

''ارے تم کہاں ان چکروں میں پڑ گئی ہو۔ یہ

احساسِ کمتری کے مارے لوگ ہیں۔ جب ان کو کوئی نہیں پوچھتا تو اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔''

مجھے رومیسا کی بات بُری لگی تھی۔

''رومیسا کسی کی عزت کا دار و مدار اس بات پر نہیں ہے کہ اس کو شادی کا کارڈ ملا یا نہیں۔ اور ایک بات جان لو۔ کہ ہر ایک کی عزت ہوتی ہے۔ چاہے وہ باس کی سیٹ پر بیٹھا ہو۔ یا ریسیپشن پر ہو۔''

☆☆☆

اس دن رومیسا دفتر نہیں آئی تھی۔ میں دفتر سے نکلی۔ میرا ارادہ تھا کہ کوئی ٹیکسی کر لوں گی۔

اتنی دیر میں راعش میرے پاس آ گئی۔

''میم۔ اگر بُرا نہ مانیں تو میرے ساتھ رکشہ میں چلیں۔'' اس نے پیشکش کی۔

''آج تو رومیسا میڈم بھی نہیں آئی ہیں۔''

میں نے اسے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اتنے خلوص سے کہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ آج میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

ہم اس رکشے میں بیٹھ گئے جس پر وہ آیا جایا کرتی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے جب کرایہ دینا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔''

نہیں میم۔ یہ رکشہ میں نے مہینے پر رکھا ہوا ہے۔''

''کتنا دیتی ہو۔ مہینے کا؟'' میں نے پوچھا۔

تین ہزار۔'' اس نے بتایا۔

''اور تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟''

''گیارہ ہزار۔'' اس نے بتایا۔

میں سوچتی رہ گئی۔ بے چاری گیارہ ہزار میں سے تین ہزار تو رکشے کو دیتی ہے۔ اس کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہوں گے۔

دوسرے دن میں اس کے لئے گلابی رنگ کا ایک کرتا لے گئی تھی۔ جو اس پر بہت اچھا لگتا۔

جب میں نے اسے کمرے میں بلایا تو مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے؟ میں نے اسے چھیڑا۔'' آج تو بہت خوش نظر آ رہی ہو۔''

''میم۔ آپ جب بلاتی ہیں نا تو خوشی ہوتی ہے۔ اس دفتر میں کوئی تو ایسا ہے جو مجھے انسان سمجھ کر مجھ سے باتیں کر لیتا ہے۔''

''اچھا۔ چلو یہ لو۔'' میں نے وہ کرتا اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے میڈم؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ میں نے تمہارے لئے خریدا ہے۔ تم پر بہت سوٹ کرے گا۔'' میں نے کہا۔

''لو رکھ لو۔''

اس نے کرتا لینے کے بعد مجھے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

''اب بیٹھ جاؤ۔ سامنے۔'' میں نے کہا۔

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ایک بات بتاؤ۔'' میں نے پوچھا،، تمہاری تنخواہ گیارہ ہزار ہے۔ تین ہزار رکشے والے کو چلے جاتے ہیں۔ تمہارا گھر کیسے چلتا ہوگا؟

''ہو جاتا ہے میم۔ کسی طرح گزارا ہو ہی جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

تمہارے والد ہیں؟''

''جی ہاں۔ لیکن وہ یہاں نہیں ہوتے۔ یو کے میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ کیوں کہ میری ماں نے بیٹے کو نہیں بیٹی کو جنم دیا تھا۔''

''ہاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس قسم کی جہالت تو ابھی تک ہمارے یہاں موجود ہے۔''

وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی۔ اس میں غصے یا ناراضگی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا ہو۔ مجھے اس پر اور بھی ترس آنے لگا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ۔ تمہارے فادر کچھ بھیجتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ تب ہی ملا جلا کر گزارہ ہو جاتا۔

ہے۔اس نے بتایا۔''لیکن میم ۔ میں ایک بات بتاؤں ۔ میں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے ۔اپنی محنت سے گھر کی کفالت کرتی ہوں۔''

اسی دوران روبیسا دروازہ کھول کر اندر آ گئی ۔ اور اس نے آتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

''چار بجے میٹنگ ہے ۔اور عثمان صاحب غصے میں ،،، پھر اس نے راعش کی طرف دیکھا۔''وہ تم پر ناراض ہو رہے تھے کہ تم اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھتیں ۔اپنی جگہ پر بیٹھا کرو۔''

میں نے راعش کو دیکھا۔اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی ۔

''روبیسا۔''راعش کو میں نے بلایا تھا۔کسی کام سے ۔میں عثمان صاحب سے کہہ دوں گی۔''

راعش روم سے جانے ہی لگی تھی کہ روبیسا نے اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں کچھ مختلف تاثر تھا۔تمہاری شادی کب تک ہو رہی ہے؟''

راعش نے ایک نظر میری طرف دیکھا ۔پھر دھیرے سے بولی۔

''اسی سال ہو جائے گی۔''

''اور تمہارا منگیتر کرتا کیا ہے؟''

''ٹائر کی کمپنی میں ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے۔''راعش نے بتایا۔

میں چونک گئی تھی۔اس کی منگنی ہوگئی ہے۔اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔اور روبیسا کو کیسے معلوم ہوا۔

''اچھا بھئی ۔ مجھے تو اپنی پریذنٹیشن تیار کرنی ہے ۔ میں جا رہی ہوں ۔روبیسا کمرے سے باہر چلی گئی ۔

مجھے یہ سن کر دکھ سا ہوا تھا۔راعش کو مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔

راعش کو احساس ہو گیا تھا کہ میں یہ سب سن کر کچھ ناراض ہو گئی ہوں۔ اسی لیے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں میم ۔نہ تو میری منگنی ہوئی ہے اور نہ ہی میرا شادی کا ارادہ ہے۔''

اس کی اس بات نے مجھے چونکا دیا۔

''تو پھر تم نے یہ بات کیوں کی؟''

''اس لیے تاکہ میں اپنی عزت کو محفوظ رکھ کر کام کرنا چاہتی ہوں۔''اس نے کہا۔

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''میم ۔ اس دفتر میں عثمان صاحب اور دیگر اسٹاف آپ کی عزت کرتا ہے نا؟''

''ہاں تو پھر؟''

پھر یہ کہ آپ جانتی ہیں کہ عزت کا مفہوم کیا ہوتا ہے ۔اس کی خوشی کیا ہوتی ہے۔لیکن میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہر کوئی مجھے اس طرح دیکھتا اور سمجھتا ہے جیسے میں اس کے ایک اشارے پر اس کے ساتھ ہو لوں گی۔ ڈنر اور لنچ کی آفرز،ساتھ چلنے کی باتیں۔ اور بھی بہت کچھ۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں یہ ظاہر کروں کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔اور میری شادی ہونے والی ہے ۔اس خبر کے پھیلتے ہی سب مایوس ہو گئے ۔اور میری جان چھوٹ گئی۔''

''اوہ۔''میں نے ایک گہری سانس لی۔''کیا یہاں سے پہلے بھی کہیں جاب کی ہے؟

''جی میم ۔ایک تھری اسٹار ہوٹل میں جاب کی تھی ۔ وہاں کے حالات تو اور بھی خراب تھے۔ میرے کاؤنٹر پر موبائل نمبرز کی پرچیاں رکھی رہتی تھیں ۔ ہر کوئی للچائی نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ اگر دوستی نہ کروں تو یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ لڑکی مردوں سے زیادہ عورتوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ یعنی ہم جنس پرست ہونے کا الزام بھی لگ چکا ہے۔ میں نے وہ جاب اسی لئے چھوڑ دی۔اور یہاں جاب کرنے کے بعد خود کو ایک ایسے خول میں سمیٹ لیا۔جس کے اندر جھانک کر دیکھا نہیں جا سکتا۔مجبوری ہے نا میم ۔گھر بھی تو چلانا ہے نا۔ یہاں سے جانے کے بعد ٹیوشن بھی کرتی ہوں۔''

اس کی تلخ باتوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پورے معاشرے کا رویہ سامنے آ گیا تھا۔اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی ۔ پھر اس نے انٹرکام کیا۔

''سوری میڈم۔'' اس نے کہا۔
''کس بات کی سوری؟'' میں نے پوچھا۔
''یہی کہ میں نے آپ کو اپنی باتوں سے ڈسٹرب کر دیا۔ لیکن کیا کرتی۔ بہت دنوں کے بعد میں نے اپنا دل ہلکا کیا ہے۔ کوئی تو ہے جو مجھے سنجیدگی سے سن رہا ہے۔ ایک غبار تھا دل میں۔ لوگوں پر غصہ تھا۔ اسی لئے آپ سے سب کچھ کہہ دیا۔ کیوں کہ ایک آپ ہی تو ہیں جو مجھے سن لیتی ہیں۔
''کوئی بات نہیں راعش۔ جب بھی تمہارے دل پر بوجھ ہو۔ تم مجھے سنا کر خود کو ہلکا کر سکتی ہو۔''
''شکریہ میم۔ ہاں ایک بات اور۔ آپ نے جو مجھے گلابی کرتا دیا تھا نا وہ میں کل پہن کر دکھاؤں گی۔''
''ہاں ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔''
''اس دن میں نہ صرف راعش کے بارے میں۔ بلکہ اس جیسی ہزاروں لڑکیوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ یہ لڑکیاں نہ جانے کس مجبوری کے تحت اپنے گھروں سے روزگار کے لئے نکلتی ہیں۔ اور ہر قدم پر ان کو بھوکی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے غلیظ ہونٹوں سے رال ٹپکاتے ہوئے لوگ ایسی مجبور لڑکیوں کو صرف ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہوس زدہ نگاہوں سے۔

☆☆☆

دوسری صبح دفتر پہنچی تو راعش اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ خیال آیا کہ وہ کہیں ہوگی۔ اور وہی گلابی کرتا پہن کر آئی ہوگی۔ اور مجھے سرپرائز دے گی۔ البتہ وہ رکشے والا ایک طرف بیٹھا تھا۔ جس کو راعش نے ماہانہ کرائے پر رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بے چاری راعش اس کو اس مہینے پیسے نہ دے پائی ہو۔ اسی لئے وہ یہاں آکر بیٹھ گیا ہے۔
میں نے سوچا کہ میں خود اس کے بقایا اس کو دیدوں۔ میں اس کے پاس چلی گئی۔
''بابا جی خیریت تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔
اس وقت میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
''کیا بات ہے بابا جی۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟''
''بیٹا۔ میری بیٹی حادثے میں انتقال کر گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ وہ پھر رونے لگا تھا۔ میں نے پیون سے کہا کہ بابا کو پانی پلا دے۔ پانی پینے کے دوران میں اس کو دیکھتی رہی۔
پانی پی لینے کے بعد اس نے بتایا۔
''آج جب اسے آفس پہنچانے کے لئے آ رہا تھا۔ تو ایک ٹرک سے رکشے کی ٹکر ہو گئی۔ میں تو اچھل کر ایک طرف جا گرا تھا۔ لیکن وہ لپیٹ میں آگئی۔ اس نے اسی وقت دم توڑ دیا۔ تم نے جو گلابی کرتا دیا تھا۔ وہ کرتا لال ہو گیا ہے بیٹا۔''
''کیا مطلب۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔
''راعش کی۔ وہ میری بیٹی تھی۔'' اس نے بتایا۔
''میں یہاں عثمان صاحب کے پاس آیا ہوں کہ کچھ مدد کر دیں۔''
میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ راعش کا کیسا حسرت ناک انجام ہوا تھا۔ وہ کومل سی لڑکی اس لئے تو نہیں ملی تھی کہ اتنی جلدی اس دنیا سے چلی جائے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ بلکہ وہیں سے واپس گھر چلی آئی۔ کئی دنوں تک میں دفتر نہیں جا سکی۔ جہاں ہر طرف راعش کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔
میں نہیں جانتی کہ میں نے کس طرح کئی دنوں کے بعد اس دفتر میں قدم رکھا ہوگا۔
کاؤنٹر پر ٹائیٹ جینز میں ایک اور لڑکی بیٹھی تھی۔ جس نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔
''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''جی۔ میں اس دفتر کی نئی ریسپشنسٹ ہوں۔ ندا نام ہے میرا۔'' اس نے بتایا۔
اور اس وقت وہ دفتر جیسے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں تھا وہاں۔ صرف راعش تھی۔ اور اس کا پورے دوپٹے میں چھپا ہوا سراپا تھا۔

☆☆......☆☆

پانچویں یادگار سچ بیانی

پرفیکٹ لائف

نسیم سحر

ایک ایسے جوڑے کی سرگزشت جسے قسمت نے شاید ایک دوسرے ہی کے لیے بنایا تھا

دیوار گریہ کیا ہوتی ہے؟ کیسی ہوتی ہے؟ پتا نہیں میرے لیے تو میرے کمرے کی دیواریں ہی دیوار گریہ تھیں جنھوں نے مجھے آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ جن سے لپٹ کر میں رو لیتا ہوں۔ کہتے ہیں دیواروں کے کان ہوتے ہیں شکر تھا کہ زبان نہیں ہوتی ورنہ میرے دکھ تو سب پر عیاں ہو جاتے۔

''اماں تُو نے کیوں مجھے اپنے ساتھ رکھا؟'' یہ سوال تھا جو میں اب اکثر اماں سے کرتا تھا۔ مگر میری ماں نے اس کا جواب ہمیشہ آنسوؤں سے دیا۔

☆☆☆

''ارے چار چار میرے سر پہ بیٹھی ہیں یا اللہ کیا ہوگا۔'' اماں نے حسب عادت اپنا دکھ رشیدہ خالہ کے سامنے با آواز بلند بیان کیا اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ چاروں ہی سن رہی ہیں۔

''ارے فکر مت کر اللہ بہتر کرے گا۔'' رشیدہ خالہ نے اماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی جو رشتہ بتا رہی ہوں اس پر غور کر۔ اکیلا ہے۔ کوئی آگے پیچھے نہیں، اپنی دکان ہے بس ذرا رنگ دبا ہوا ہے۔''

رشیدہ خالہ نے اپنے لائے ہوئے رشتے کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے بتایا۔

''بس اب تُو زیادہ نہ سوچ بس جلدی سے بیاہ۔ ارے ایک نکلے گی تو دوسری کی راہ بنے گی نا۔'' وہ تو آج ہاں کرانے پہ تلی بیٹھی تھیں۔

''اے کاش اللہ ایک بیٹا ہی دے دیتا۔'' اماں نے پھر سے اپنی حسرت بیان کی۔ ''بوڑھا باپ اور میں کمزور جان کب تک ان کی دیکھ بھال کریں گے۔''

''جب ہی تو کہہ رہی ہوں زیادہ نہ سوچ، بس اس جمعے کو لا رہی ہوں۔ ہاں کر دینا سمجھیں۔''

خالہ نے اماں کو تنبیہ کی اور چھپاک سے باہر نکل گئیں۔

''یہ کیسی آزمائش ہے اللہ میاں! میں نے تو اپنا یقین تجھ پر سے کبھی ختم نہ کیا۔ پھر ایسا کیوں۔ مجھ پہ رحم کر دے میرے مالک میں بہت کمزور ہوں میں دنیا کا سامنا نہیں کر سکتی پروردگار میرے حال پر رحم فرما۔''

رات کے اندھیرے گواہ تھے اس کی سسکیوں کے۔ مگر اندھیرا کبھی روشنی تو نہیں بن سکتا نا۔

☆☆☆

حسبِ وعدہ خالہ رشیدہ جملہ کولڑ کے کو لے کر آ گئیں۔ ان کی بیان کردہ تمام باتیں ٹھیک تھیں۔ ماں نے ابا سے صلاح کی اور آخر کار ہاں کر ہی دی۔ ظاہر ہے یہاں کسی شہزادے کی آمد تو ہو نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اس کو غنیمت جان کر سادگی سے آپا کو ان کے ہمراہ رخصت کر دیا گیا۔

اماں نے تھوڑا سکون کا سانس لیا۔ آخر وہ بھی کیا کرتیں بوڑھے شوہر کی معمولی پنشن سے جیسے وہ گزارہ کر رہی تھیں وہی جانتی تھیں۔ چھوٹی آپا اور اماں سلائی بھی کرتی تھیں۔ بڑی دونوں تو نہ پڑھ سکی تھیں لیکن اماں نے تیسری اور چوتھی کو گورنمنٹ اسکول میں ڈال دیا تھا۔ جہاں سے میٹرک کے بعد روبینہ نے گارمنٹ فیکٹری میں جاب کر لی تھی جس سے حالات میں ذرا بہتری آ گئی تھی۔

ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ اولاد کی خواہش کیسے نہیں ہوتی۔ یکے بعد دیگرے 4 بچوں کی پیدائش اور چند دنوں کے اندر ہی ان کا مر جانا زیب النساء کے لیے عجیب امتحان لایا تھا۔ ابا بے چارے تو خاموش طبع تھے۔ مگر زبین کی ساس نے کوکھ اجاڑو! ڈائن اور منحوس کہہ کہہ کر زبین کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔

اماں کی رات دن بس اللہ سے یہی دعا تھی کہ اللہ ان کی اولاد کو زندگی دے۔

''ارے صدر الدین تیرے پیچھے تو تیرا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔'' دادی نے ابا کو دہائی دی۔ ''ارے میری مان دوسری شادی کر لے مجھ غریب کو بھی خوشی دکھا دے تیرا باوا تو پوتوں کی حسرت لیے چلا گیا۔ اب کیا میرے نصیب میں بھی نہیں ہے یہ خوشی۔''

دادی کا رات دن کا یہی رونا تھا۔ ابا بے چارے خاموش رہتے یا پھر اٹھ کر چلے جاتے۔

''ارے کیا گھول کے پلا دیا میرے بچے کو۔ ماں کی تو سنتا ہی نہیں۔'' اب دادی کی توپوں کا رخ اماں کی طرف ہو گیا۔



''ارے جنم جلی تُو ہی سمجھا اس کو۔'' زبین نے کوئی جواب نہ دیا اور کام میں لگی رہی۔

☆☆☆

رونے کے لیے تو ماں کی گود بھی میسر تھی۔ مگر میں ماں کے سامنے رو کر انھیں دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماں اور میری بدنصیب ماں جس کی واحد خواہش اولاد کی تھی یہ کوئی اتنا بڑا جرم بھی نہ تھا جس کی سزا......

''نہیں نہیں'' میری ماں مجھے وہیں روک دیتی۔ ''سزا نہیں بیٹا اللہ اپنے بندوں کو کبھی سزا نہیں دیتا وہ صرف آزماتا ہے۔'' اگر یہ میری ماں کے لیے آزمائش تھی تو میرے لیے سزا۔ ایک بیٹے کے لیے یہ سزا ہی تو ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے لیے آزمائش بن جائے۔ اماں نے تو ایسے آزمائش بھی نہیں سمجھا وہ تو اسے بھی اللہ کی مہربانی سمجھتی تھی۔

''میں نے اور تیرے باپ نے رب سوہنے سے بہت دعا کی تھی۔'' انھوں نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے نہیں کہ اولاد ہو جائے دنیا میں نام کے لیے۔ میرے مولا کا بہت کرم تھا ہم پہ۔ میں تو ماں بن کر اُس محبت کا حق ادا کرنا چاہتی تھی جو اللہ اپنے بندے سے کرتا ہے۔ وہ تو بندے کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی اپنی نعمتیں اس سے واپس نہیں لیتا۔'' یہ سب کہتے ہوئے میری ماں نجانے کہاں کھو جاتی تھی۔

میری ماں بہت عبادت گزار نہیں تھی مگر نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھی اور نماز پڑھتے ہوئے وہ نجانے کہاں پہنچ جاتی تھی۔ ابا بتاتے تھے کہ جب وہ نماز سے فارغ ہوتی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اللہ سے باتیں کر کے آئی ہے۔ اس کے چہرے پہ عجیب سا نور ہوتا۔ میرے ابا نے اماں کو کبھی کسی بات پہ طعنہ نہ دیا۔ یہ تو دادی تھیں جنھوں نے پوتے کے ارمان میں کوئی بابا اور کوئی مزار نہ چھوڑا۔ وہ نجانے کہاں کہاں سے ماں کو تعویذ لا لا کر پہناتی رہتی اور دم درود کرتی رہتیں۔

پھر بالآخر اماں کی دعائیں رنگ لے آئیں۔

اور وہ امید سے ہو گئیں۔ ابا اور دادی اماں کا بے تحاشا خیال رکھنے لگے۔ دادی نے پھر حفاظت کے لیے اماں کو تعویذ پہنا دیے اور وظیفے شروع کر دیے۔ اماں اندیشوں میں مبتلا تھیں کہ اگر یہ بھی چند دن بعد...... اماں اس سے آگے سوچنا نہ چاہتی تھیں۔ جب پیدائش کا دن آیا دادی ساتھ ہی تھیں۔ اماں نے بچے کو جنم دیا۔ نرس نے آ کر دادی کے کان میں نجانے کیا کہا کہ دادی حواس باختہ ہو گئیں۔ سراسیمگی سی کیفیت میں وہ جب نرس کے ہمراہ بچے کو دیکھنے گئیں تو بچے کو دیکھ کر جو دل پکڑا تو پھر اٹھ نہ سکیں۔ ابا بھی سکتے میں تھے مگر اللہ کی رضا کے آگے مجبور تھے اور اماں! شاک تو ان کو ہی لگا تھا مگر انھوں نے خود کو سنبھال لیا کوئی رونا پیٹنا نہیں اور نہ ہی کوئی شکوہ۔ وہ بڑے حوصلے سے بیٹھی تھیں۔ ابا نے بہت سمجھایا۔ مگر زبین اپنے دل کو کیسے سمجھاتی۔ نو ماہ پیٹ میں رکھا۔ اذیت برداشت کر کے پیدا کیا۔ کیسے کسی کو دے دیتی۔ ابا کے پیسوں اور اماں کے ہاتھ جوڑنے کی وجہ سے یہ بات صرف ڈاکٹر اور ایک نرس تک محدود رہی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی اماں کو بہت سمجھایا۔

''زبین تمہارے لیے آگے مشکلات ہو سکتی ہیں۔ ابھی سے اسے دے دو۔'' مگر زبین کے جواب نے سب کو لاجواب کر دیا۔

''اگر اتنی دعاؤں کے بعد اللہ نے مجھے یہ دیا ہے تو میں اس کی نعمت کی ناشکری نہیں کر سکتی۔ اس کی پرورش ہی میرے لیے اللہ کے سامنے سرخرو ہونے کا ذریعہ ہوگا۔ میں اسے ایسے پالوں گی کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا اور عیبوں کو ڈھکنے والی ذات تو اسی کی ہے۔'' اماں کے اطمینان نے ابا کو پھر کچھ بولنے نہ دیا اور وہ انھیں گھر لے آئے۔

زبین کا امتحان تو اب شروع ہوا تھا۔ وہ سلطان کو بالکل باہر نکلنے نہیں دیتی اور گھر میں بھی ہمہ وقت نظروں کے سامنے رکھتی۔

''اے بئے زبین کیا لڑکے کو لڑکی کی طرح پال رہی ہو ذرا باہر نکلنے دیا کرو۔'' یہ زبین کی پڑوسن صفیہ

تھی۔ ''باہر کھیلے گا تو ہوشیار ہوگا اور جان بھی پکڑے گا۔ تم نے اپنے ساتھ چپکا کے رکھا ہے۔ صحت دیکھو کتنی کمزور ہے دو سال ہوگیا ہے مگر سال کا لگتا ہے۔''

''نہیں آپا میں اسے خود سے دور نہیں کرسکتی۔'' زبین نے گھبرا کے کہا۔

''ارے گھبراتی کیوں ہے...... اللہ خیر کرے کچھ نہیں ہوگا۔''

''وہ دو سال کا ہوگیا ہے ورنہ پہلے والے تو تیرے دو تین ماہ سے زیادہ نہ جیے ذرا باہر کھیلنے دیا کر ورنہ بالکل ہی ڈرپوک بن جائے گا۔'' صفیہ نے پھر سمجھایا۔

''ہاں آپ صحیح کہہ رہی ہیں مگر میں اسے خود سے دور نہیں کرسکتی مجھے ڈر لگتا ہے۔'' زبین نے سلطان کو خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

آپا کی شادی کے بعد دو سال تک چھوٹی آپا کا کوئی رشتہ نہیں آیا۔ اماں کی فکریں پھر سوا ہوگئیں۔ رشیدہ خالہ کے چکر بڑھنے لگے بڑی تگ و دو کے بعد اور ایک منگنی ختم ہوکر پھر ایک دوسری جگہ بات بنی اور چھوٹی آپا 35 سال کی عمر میں اپنے گھر سدھار گئیں۔

اماں کے سینے پہ ابھی دو اور سلیں دھری تھیں۔ ابا کی بیماریاں ان کی بیٹی کی عمروں کی طرح بڑھتی جارہی تھیں۔ روبینہ نے جب سے نوکری کی تھی گھر کے حالات تو بہتر ہوگئے تھے مگر روبینہ کا مزاج آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ وہ رشیدہ خالہ کے لائے کسی رشتے کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ روز روز کی تکرار ابا کی جان لینے لگی۔ اماں کے طعنے اور فکریں بڑھ گئی تھیں مگر روبینہ کے مزاج پر کوئی فرق نہ پڑا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بدتمیز تھی یا اُسے اماں کا خیال نہ تھا۔ سو اب وہ اپنے جیسے کسی گھر کے بجائے بنگلے کے خواب دیکھنے لگی تھی اور اماں جو رشیدہ خالہ کے لائے ہر رشتے پہ اسے سمجھاتیں بس اس سے اسے چڑ تھی پہ روبینہ کے رویے نے اماں کو بھی بیمار بنا

ڈالا تھا اور ان سے سلائی بھی نہ ہوتی تھی۔ شکر تھا کہ گھر اپنا تھا ورنہ تو بہت مشکل ہوتی۔

☆☆☆

''ارے زبین تُو نے تو بچے کو بالکل ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا ہے لو بھلا لڑکا ہے مگر اس کو لڑکیوں کی طرح گھر میں بند رکھتی ہے۔'' یہ زبین کی پڑوسنیں تھیں جو آپس میں باتیں کررہی تھیں۔

''نہیں آپا وہ بس ذرا خوف زدہ رہتی ہے پہلے اس کا کوئی بچہ بچا بھی تو نہیں۔'' حمیدہ کی زبین سے ہمدردی تھی۔

''ارے وہ تو پرانی بات ہوگئی، اب تو سلطان چھ سال کا ہوگیا ہے۔'' صفیہ کو خواہ مخواہ فکر تھی۔ ''اسکول بھی خود چھوڑنے جاتی ہے مجھے تو کوئی چکر لگتا ہے۔'' صفیہ نے سرگوشی کی۔ ''چکر۔ کیسا چکر؟'' حمیدہ حیران ہوئی۔

''پتا نہیں مگر سلطان مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' صفیہ نے اپنی الجھن بیان کی۔

''ارے کچھ نہیں وہم ہے تیرا۔ سلطان کے بعد اس کی کوئی اولاد بھی تو نہیں ہوئی نا تو بس اس لیے ڈرتی ہے۔'' حمیدہ نے بات ختم کی۔

☆☆☆

اسے لگتا ہر آنکھ اسے گھور رہی ہے۔ ہر شخص اس پہ انگلیاں اٹھا رہا ہے۔

''بڑی شریف بنتی تھی، توبہ توبہ کیسا زمانہ آگیا۔ چہرے پہ معصومیت اور کرتوت تو دیکھو۔ ارے اسے نکالو یہاں سے یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ اسے لگتا وہ پاگل ہورہی ہے۔ باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ کھانے کا ہوش بھی نہیں تھا۔

یا اللہ اماں مجھے کیوں چھوڑ گئیں کاش اماں مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتیں۔ رو رو کے آنکھیں سوج گئیں۔ یہ دکھ تو کسی کو بتانے والا بھی نہ تھا۔

☆☆☆

زبین کا خوف تو اپنی جگہ بنا تھا۔ وہ تو سلطان کو ہمہ وقت اس لیے ساتھ رکھتی تھی کہ اس کے بیٹے کا راز کھل نہ جائے اس لیے وہ اسے کبھی اکیلا نہ چھوڑتی

ویسے تو وہ نارمل ہی تھا۔ ذرا کم گو تھا۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی دم توڑ گئیں۔

سلطان نے جب میٹرک کیا تو پھر اس کو ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ زبین اور صفدر علی نے سکون کا سانس لیا۔ صفدر علی زبین کی محنت اور محبت کو مان گئے تھے کس طرح زبین نے جو کہا وہ واقعی کر دکھایا۔ کسی بھی لمحے صفدر علی کو اس کے چہرے پہ شکوہ نظر نہ آیا۔ بس ایک خدشہ انھیں سلطان کے مستقبل کی طرف سے تھا۔ لیکن وہ اس کا ذکر زبین سے کر کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے خاموش رہے۔

سلطان خاموش طبع نوجوان تھا کمپنی میں بھی وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

☆☆☆

روبینہ نے بالآخر اماں کی مشکل آسان کر دی اور وہ ایسے کہ اپنے باس سے شادی کر لی۔ اماں نے بہت سمجھایا۔ مگر اس کے سر پہ تو دولت کا بھوت سوار تھا۔ باس سے شادی کر کے وہ دبئی چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ اماں کو اتنے پیسے ضرور دے گئی کہ اماں نے گھر کے دو حصے کر کے کرایہ پر ایک حصہ دے دیا۔ اماں سے تو اب کام ہوتا نہ تھا سب سے چھوٹی کو انھوں نے سلائی سکھائی تھی تو بس اسی طرح گزارہ ہو رہا تھا۔ گھر میں اب صرف دو جی تھے۔ اب اماں کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ چھوٹی یعنی حسن آرا کو بھی اپنے گھر کا کر دیں۔ چھوٹی آپا تو سسرال میں ایسی پھنسی کہ ماں کے گھر کا راستہ بھول گئیں۔ ان کے چار بچے ہو گئے تھے۔ بس سال کے سال خبر مل جاتی تھی۔ صرف بڑی آپا تھیں جو کبھی کبھار آ جاتیں۔ اماں کی کوشش بار آور نہ ہو رہی تھیں۔ حسن آرا، جو صرف نام کی حسن آرا تھی وہ بھی 30 کو پہنچ گئی تھی۔ آزمائش تو زیادہ تر آتی بھی غریبوں پر ہے۔ بڑھاپا اور فکریں وقت سے پہلے ہی انسان کو موت کے قریب کر دیتے ہیں۔ حسن آرا کی زندگی میں ابھی آزمائش آنا تھیں۔ اس لیے اماں اس کو رخصت کرنے کی حسرت لیے خود دنیا سے چلی گئیں۔ حسن آرا کی تو آنکھیں خشک ہو گئی تھیں رو رو کے۔ وہ چپ بیٹھی خلاؤں میں تکتی رہتی، بڑی آپا بھی میاں اسلم بھائی کے ساتھ رہنے آ گئی تھیں۔ وہ اس کی دل جوئی میں لگی رہتی تھیں۔ مگر ماں کی جگہ کون لے سکتا تھا۔

چند دنوں میں ہی اسلم بھائی کی نیت کا پتا چلنے لگا۔ وہ مکان پہ قبضے کے خواہشمند تھے اور اسی لیے وہ کبھی نشئی تو کبھی کسی رنڈوے کا رشتہ حسن آرا کے لیے لانے لگے۔ آپا نے تھوڑی بہت مزاحمت کی مگر پھر لالچ میں آ کر شوہر کا ساتھ دینے لگیں۔ مگر حسن آرا کمزور نہیں تھی۔ وہ ان کے مقابلے پہ اتر آئی۔ اسلم نے جب دیکھا کہ حسن آرا، دال گلنے نہیں دے گی تو اس نے پینترا بدلا اور حسن آرا پہ دوسری طرح سے جال ڈالنے لگا۔

آتے جاتے فضول سے جملے جب حسن آرا کے کانوں میں پڑتے تو اس کا خون کھول جاتا۔ لیکن وہ آپا سے ذکر نہ کرتی کہ ان کا گھر خراب نہ ہو۔

ایک رات وہ عشاء پڑھ کے سونے کے لیے جانے لگی۔ آپا جلدی سو جاتی تھیں۔ ان کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔ حسن آرا اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ ایک ہاتھ اس کے منہ پہ آ گیا اتنی سختی سے کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ پھر وہ ہاتھ اسے لیے کمرے میں آیا۔ اسلم کو دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اتنا کمینہ بھی ہو سکتا ہے۔

''ڈرو مت حسنہ تم تو خوامخواہ مجھ سے خائف رہتی ہو۔ میں تو تمہارا ہمدرد ہوں۔'' وہ خباثت سے مسکرایا۔ ''میری بات مان لو فائدے میں رہو گی۔ ورنہ ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''

اس کا تو حلق خشک تھا منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اچانک دروازے پہ آہٹ سی ہوئی اسلم نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ حسن آرا کے لیے وہی لمحہ کافی تھا اس نے دروازے کی طرف دوڑ لگائی وہ آپا کی جھلک دیکھ چکی تھی مگر کمرے سے باہر نکل کر اس کو دوسرا بڑا صدمہ اور حیرت کا جھٹکا لگا کہ آپا سب دیکھنے کے باوجود اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی تھیں۔

صدمے سے حسنہ گنگ رہ گئی مگر یہ خاموش رہنے کا نہ تھا اگر اس وقت خاموش رہ جاتی تو شاید ہماری زندگی بولنے کے قابل نہ رہتی۔ حسن آراء کی چیخوں نے محلہ سر پر اٹھالیا۔

☆☆☆

زبین کی آزمائش دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ سلطان کے برسرروزگار ہوتے ہی اس کے لیے رشتے آنے لگے، وہ ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ کمارہا تھا، شریف لوگ تھے۔ محلے کے ہی دو تین گھروں سے اس کے لیے سوال آ گیا تھا۔ زبین مختلف بہانوں سے ٹالتی رہی مگر کب تک؟ ایک دو لوگ اس سے ناراض بھی ہو گئے۔

''پتا نہیں کیا سمجھتی ہے۔ آخر ایسا بھی کوئی آسمان سے اترا شہزادہ نہیں ہے۔'' یہ صفیہ تھی جس کی بھانجی کو زبین نے منع کیا تھا۔

''ارے محلے کی بات تھی ہم نے سوچا جانا پہچانا ہے کوئی مسئلہ نہ ہوگا مگر بھئی وہ تو پتا نہیں کیسی مہارانی کا خواب دیکھ رہی ہے۔'' رقیہ نے بھی پھپھولے پھوڑے اس کی پھوہڑ بیٹی کو جو منع کر دیا تھا۔

لوگوں کے خیالات کے برعکس جب کافی عرصے تک ایسا کچھ نہ ہوا تو چہ میگوئیاں دوبارہ شروع ہو گئیں۔ اب لوگ کھسر پھسر کرتے اور زبین کے آنے پہ خاموش ہو جاتے۔ محلے کے لڑکے بھی آتے جاتے سلطان پہ آوازیں کستے۔ یہ سب سلطان کے ساتھ ساتھ اس کے ماں باپ کے لیے بھی بہت تکلیف دہ تھا۔ زبین نے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ مگر سلطان کو تو باہر جانا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ لوگوں کی باتیں جب اس کے لیے بہت بوجھل ہو جاتیں تو وہ اپنے کمرے میں بند دیواروں سے شکوہ کر لیتا یا پھر ماں کے گھٹنے پہ سر رکھ کر یہی ایک سوال کرتا۔

''ماں تُو نے مجھے اپنے ساتھ کیوں رکھا؟ دے دیتی نہ کسی کو تو آج یہ باتیں سننے کو نہیں ملتیں۔'' اور زبین کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

''تُو میرا بیٹا ہے میری اولاد ہے۔ کیسے کسی کو دے دیتی۔'' اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی۔

☆☆☆

سب سے پہلے کرائے داروں نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ''کیا ہوا حسنہ خیریت تو ہے؟'' دونوں میاں بیوی نے باری باری تینوں کو دیکھا۔ تینوں کی خاموشی بتا رہی تھی کہ معاملہ سنگین ہے۔

''اے ہے کیا ہوا میری بچی۔'' پڑوس کی خالہ جی کھلے دروازے سے اندر آتے ہوئے بولیں۔

''ارے کیا ہوا بتاؤ بھی'' انھوں نے حسنہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی لیکن حسن آرا تو ہچکیوں سے رو رہی تھی اور آپا شرمندہ۔ جہاں دیدہ خالہ کو اندازہ ہو گیا اسلم کی نظریں چراتی شکل اور حسنہ کا سر سے اترا دوپٹہ بہت کچھ بتا گیا۔ سب سے پہلے تو انھوں نے کرائے داروں کو واپس بھیجا۔ پھر حسنہ کو تسلی دیتے ہوئے پلنگ پہ بٹھایا اور آپا سے مخاطب ہوئیں۔

''نزہت تجھے ذرا شرم نہیں ہے یہ تیری سگی بہن ہے، بجائے اس کا خیال رکھنے کو'' خالہ چپ ہو گئیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں خالہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''اے جی بس رہنے دو یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔'' خالہ نے تڑخ کر جواب دیا۔

''آپ جائیں یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔'' اسلم نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اے میاں یہ بدمعاشی کہیں اور دکھانا سمجھے۔ گھر کا معاملہ ہوتا تو اس کی چیخیں باہر نہ سنائی دیتیں۔'' خالہ نے اسلم کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے اب تو سگا خون بھی اپنا نہ رہا بندہ کس طرح بھروسہ کرے۔ چلو تم لوگ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کرو۔'' خالہ نے واضح کیا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ اکیلی کیسے رہے گی۔'' نزہت نے ایک دم گھبرا کے کہا۔ مکان ہاتھ سے جو نکلنے لگا تھا۔

''اکیلی نہیں ہم ہیں نا۔ صغرا سے میرے حوالے

کر گئی تھی۔'' خالہ نے اماں کا نام لیا۔'' ہم کر لیں گے اس کی دیکھ بھال۔ تمہارا کیا بھروسہ۔ جوان جہان بچی کو میں اب تم لوگوں پہ نہیں چھوڑوں گی۔'' خالہ نے حسنہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے اثبات میں ہلتے سر نے خالہ کو شہہ دی تھی کیونکہ حسنہ اب ان کو کسی بھی قیمت پہ ساتھ نہیں رکھنا چاہ رہی تھی۔ اسلم نے تھوڑی اڑی دکھائی مگر خالہ اپنے بیٹوں کو لے آئیں تو پھر آپا اور اسلم کو نکلتے ہی بنی۔

☆☆☆

آپا کے جانے کے بعد حسن آرا اکیلی ہوگئی تھی۔ مگر خالہ نے اپنا وعدہ نبھایا اور واقعی اس کا بھرپور خیال رکھا۔ اس کو سودا سلف منگوا دیتیں۔ اکثر رات اس کے ساتھ ہی رہتیں۔ انھوں نے حسنہ کی شادی کے لیے بھی بہت کوششیں کیں۔ مگر ابھی خدا کو منظور نہ تھا۔ ڈیڑھ سال بعد خالہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ حسنہ کو لگا وہ دوبارہ بے سائبان ہوگئی۔ مگر زندگی تو چلتی ہے یہ کسی کے مرنے سے نہیں رکتی۔ جب تک بندے کی خود کی سانس نہ ٹوٹے۔ حسن آرا کے کرائے دار بھی اچھے تھے اور خیال رکھتے تھے۔ حسنہ نے ان سے بنا کر رکھی تھی ورنہ تو آپا نے اپنی پلاننگ کے تحت ان سے بھی تعلقات بگاڑ لیے تھے۔

☆☆☆

اکیلی عورت تو کٹی پتنگ کی طرح ہوتی ہے جسے ہر کوئی لوٹنے کی فکر میں ہوتا ہے۔

''تم نے کیوں زحمت کی فون کر دیا کرو، یہ غلام خود سامان پہنچا دے گا۔'' دکاندار جس کا نام بھی غلام حسین تھا۔ اپنے پان سے پیلے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

گھر میں راشن ختم تھا محلے کی قریبی دکان یہی تھی اس لیے وہ یہیں آگئی تھی۔ پیسے لیتے ہوئے اس نے جان کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا حسنہ نے ہاتھ جھٹکا اور غصے میں سامان لیے بغیر آگئی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ بجا دیکھا تو غلام حسین سودا لیے کھڑا تھا۔

''تم'' وہ غصے میں پھنکاری۔

''ہاں تم یہ سامان چھوڑ آئیں تو میں نے سوچا خود ہی پہنچا دوں۔'' اس نے پھر پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ حسنہ نے تھیلا چھینا اور پیسے اس کی طرف بڑھائے۔

''رہنے دو گھر کی بات ہے۔'' حسنہ نے پیسے اس کے منہ پر پھینکے اور دروازہ زور سے بند کرلیا۔

دو تین دن سے پائپ میں کچھ خرابی ہوگئی تھی پانی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے حنیف بھائی کو بلا بھیجا وہ تھوڑے فاصلے پہ رہتے تھے۔ اماں نے انھیں بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام کر دیتے تھے۔

''ہاں حسن آرا کیا ہوا؟'' لہجہ نہایت اپنائیت لیے ہوئے تھا، اس سے پہلے وہ گڑیا کہا کرتے تھے آج نام لیا تھا۔ خیر اس نے سر جھٹکا۔

''حنیف بھائی یہ پائپ مسئلہ کر رہا ہے۔ سارا پانی بہہ گیا اور ٹینکی خالی پڑی ہے۔'' اس نے انھیں پائپ دکھایا۔ انھوں نے پائپ کا معائنہ کیا۔

''گل گیا ہے۔ دوسرا لانا پڑے گا۔ میں لے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ جملہ سامان کے ساتھ دوبارہ آگئے اور پائپ تبدیل کرنے لگے۔

''چائے نہیں پلاؤ گی حسن آرا؟'' انھوں نے نہایت اپنائیت اور بے تکلفی سے اسے پکارا۔ وہ بادل ناخواستہ چائے بنا کر لائی اتنی دیر میں وہ پائپ وغیرہ لگا چکے تھے۔ ہاتھ دھو کر وہ چارپائی پہ بیٹھ گئے اور مزے سے چائے پینے لگے۔ جیسے انھیں گھر جانے کی کوئی جلدی نہ ہو۔

چائے پی کر وہ جاتے وقت اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولے۔

''تکلف کی ضرورت نہیں آدھی رات کو بھی ضرورت ہو تو بلا لینا۔'' انھوں نے آنکھ ماری اور مسکرا کر باہر نکل گئے۔

یہ وہ لوگ تھے جن کے درمیان وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ اماں کے آنکھ موندتے ہی سب کی نظریں بدل گئیں۔ ہر آنکھ اس کو پیغام دیتی ہوئی ہوتی۔ پڑوس کی خالہ نے اس کے رشتے کے لیے

تھوڑی بہت کوشش کی تھی۔ مگر۔۔۔ بات نہ بنی حسنہ تیس کی حد کراس کر چکی تھی، صورت شکل درمیانہ سی تھی زیادہ تر لوگ مکان کے لالچ میں آتے۔ اس نے خود کو کافی حد تک گھر میں مقید کر لیا۔

☆☆☆

ساری زندگی زبین نے جس ہمت اور بہادری سے سلطان کو پالا اور اس کی کمی کا کسی کو بھی پتا نہ لگنے دیا۔ اب ہمت ہار رہی تھی، جب اس کے جوان جہان بیٹے پہ لوگ آواز کستے تو اس کا دل درد کی شدت سے پھٹنے لگتا۔ سلطان اب 35 کا ہو گیا تھا۔ زبین کی رات دن بس یہی دعا تھی کہ اللہ میرے بیٹے کی لاج رکھ لے تو عیبوں کا ڈھکنے والا ہے پروردگار رحم کر۔''

☆☆☆

گلی میں شور کی آواز سن کر حسنہ نے باہر جھانکا تو دیکھا ایک آدمی تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا اور پیچھے چند شرارتی بچے بھاگ رہے تھے۔

''اوئے انکل'' ایک بچے نے آواز لگائی۔

''ابے آنٹی بول'' یہ دوسرا لڑکا تھا پھر سارے ہنسنے لگے اور وہ آدمی تیز تیز چلتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''خالہ کون تھا یہ؟'' اس نے ساتھ کھڑی حمیدہ سے پوچھا جو شور سن کر نکلی تھی اور اب بچوں کو ڈانٹ رہی تھی۔

''کیا بتاؤں بیٹا یہ سلطان ہے۔ اگلے محلے میں رہتا ہے۔'' حمیدہ خاموش ہو گئی۔

''بچے اسے کیوں چھیڑ رہے تھے؟'' حسن آرا نے پوچھا اسے حیرت تھی کیونکہ وہ تو نارمل لگ رہا تھا۔

''بس بیٹا کہنا نہیں چاہیے مگر لوگ کہتے ہیں کہ......''

حمیدہ کو بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ زبین اس کی اچھی سہیلی تھی۔

''مگر خالہ وہ تو کہیں سے بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا نہ صورت نا انداز۔ پھر لوگ کیوں بکواس کرتے ہیں۔'' حسن آرا کو بھی افسوس ہوا۔

''ارے لوگوں کا کیا ہے باتیں ہی بناتے ہیں بس'' پھر حمیدہ نے حسنہ کو ساری تفصیل بتائی اور حسن آرا افسوس کرتے ہوئے اندر آ گئی۔

☆☆☆

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ ''یا اللہ! میں کہاں جاؤں!'' اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جاتی اور وہ کہیں کی نہ رہ پاتی۔ بہتر ہے ذلت کی زندگی سے تو کسی کا بھی سہارا ملے۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے کرایہ دار مشتاق بہانے بہانے سے اس سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگا ایک مرتبہ سودا کیا منگا لیا فری ہی ہو گیا تھا۔ دروازہ بجا بجا کر پوچھتا۔

''کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔''

''جی نہیں شکریہ جب ضرورت ہو گی کہہ دوں گی۔ آپ بلاوجہ زحمت نہ کیا کریں۔'' حسنہ نے رکھائی سے کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر انھوں نے ہاتھ اٹکا دیا۔

''ارے تم تو خوامخواہ ناراض ہو رہی ہو میں تو بس یونہی۔'' ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ حسن آرا نے کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆

جب دل میں بہت درد ہو تو زبان سے الفاظ ادا ہو ہی نہیں پاتے صرف آنسو بہتے ہیں اور زبین کے بھی اب وقتِ دعا صرف آنسو بہتے تھے لیکن اللہ تو بندے کے بہنے والے آنسو کی وجہ بھی جانتا ہے۔ وہ بھلا زبین کے درد کو کیوں نہیں سمجھتا ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے وقت رکھا ہے ہر چیز کا۔ اب شاید وقت آ گیا تھا کہ زبین کے آنسوؤں کا مداوا ہو جائے۔

☆☆☆

اسے دو تین دن سے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا

تھا۔ اس نے توجہ نہ دی اور گھر میں رکھی گولی کھالی مگر افاقہ نہ ہوا۔ گھر میں دودھ اور چینی بھی ختم تھے۔ طبیعت باہر جانے کی طرف مائل نہ ہوئی تو اس نے سوچا کرایہ دار کے بچے سے منگوا لیتی ہوں۔ دو تین بار دروازہ بجایا۔ یہ دروازہ گھر کے اندر سے ہی تھا۔ کسی وقت ضرورت وہ یہیں سے پڑوسن سے بات کرلیتی تھی اور وہ بھی یہیں سے آجاتی تھی۔ دو تین بار کی دستک کے بعد دروازہ کھلا اور مشتاق آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

''ہاں کیا بات ہے؟''

''وہ...... گڈو نہیں ہے؟'' حسنہ مشتاق کو دیکھ کر سٹپٹا گئی یہ اس وقت گھر میں کیا کر رہا تھا۔ ''آپ بھی اس وقت گھر پہ؟''

''ہاں رات کو گڈو کے نانا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی تو ہم سب رات وہیں تھے ہسپتال میں۔ زیتون تو ابھی وہیں رہے گی۔'' اس نے تفصیل بتائی۔ ''ہاں تمھیں کچھ چاہیے؟'' اس نے حسنہ سے پوچھا۔

''آں ہاں نہیں کچھ نہیں بس ویسے ہی۔'' حسن آرا پلٹنے لگی۔

''ارے بتادو کچھ منگوانا ہے تو ابھی لادیتا ہوں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' انھوں نے فوراً ہی سمجھ لیا۔

''جی وہ یہ دو تین چیزیں لادیں مہربانی ہوگی۔'' حسن آرا نے کوئی چارہ نہ سمجھتے ہوئے پیسے ان کو پکڑا دیے اور واپس آگئی۔

☆☆☆

رات کے کسی پہر اچانک آنکھ کھل گئی اسے لگا کوئی دروازہ بجا رہا ہے ہلکے ہلکے۔ گولی کے زیر اثر اس پہ غنودگی طاری تھی۔ اس لیے وہ دوبارہ پھر نیند کی وادی میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں پھر محسوس ہوا کہ کوئی دروازے پہ ہے اس نے اونگھتی ہوئی آنکھوں اور چکراتے سر کے ساتھ دروازہ کھولا سامنے مشتاق کھڑا تھا۔

''آں آں آپ، تم۔'' حسن آرا کی آنکھیں کھل گئیں۔

''اندر کیسے آئے؟''

''دروازہ تو تم نے خود ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔'' مشتاق مسکراتے ہوئے بولا۔

''رات کو تمھیں نیند ہی اتنی آرہی تھی یا جان بوجھ کر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

''آپ جائیں یہاں سے۔'' حسن آرا نے دروازہ بند کرنا چاہا۔

''ارے رے ایسے کیسے چلا جاؤں اب آ ہی گیا ہوں تو تھوڑی دیر بیٹھنے دو۔'' اس نے دروازہ پہ ہاتھ رکھا۔

''تم یہاں سے جاؤ ورنہ میں شور مچادوں گی۔'' حسنہ نے دھمکی دی جواب میں مشتاق نے زور سے قہقہہ لگایا اور زبردستی کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ پھر حسنہ چیخ بھی نہ سکی کہ مشتاق کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا اور دوسرے سے وہ اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ گم صم جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی اور بھنورا اس کو چوس کر چلا گیا۔ اماں کو شاید اللہ نے اس لیے اٹھا لیا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی کی بے بسی نہ دیکھ سکیں۔ حسنہ کے پاس تو رونے کے لیے کوئی کندھا بھی نہ تھا، وہ کس سے اپنا دکھ کہتی، کس سے شکایت کرتی، اپنے لٹ جانے پہ وہ بند کمرے میں ہی ماتم کرتی رہی، باہر تو کسی کو خبر نہ ہوئی اور وہ اپنے ہی گھر میں اپنا مان گنوا بیٹھی۔

☆☆☆

زبین سن کر حیران بیٹھی تھی۔ وہ اپنا دکھڑا سنا کے جاچکی تھی۔ رو رو کر زبین کے پاؤں پکڑے وہ اپنی مدد کرنے کو کہہ رہی تھی یا زبین کا مسئلہ حل کر رہی تھی۔ وہ ہکا بکا تھی پھر صفدر علی کے ہلانے پہ ہوش میں آگئی۔

''یہ کیا کہہ گئی ہے؟ کون تھی یہ؟''

''یہ اللہ کی مدد ہے زبین سوچ لے۔ ہم کہیں اور چلے جائیں گے جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔''

''اور زبین نے جب ساری بات سمجھی تو وہ بھی

اللہ کی مہربانی پہ سجدہ ریز ہوگئی۔ اللہ نے دوسری بار اس کا مان رکھ لیا تھا۔ اس کے بیٹے کی زندگی سنور نے والی تھی وہ کیوں نہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی۔

☆☆☆

اس منحوس رات کا سایہ اب اس کی زندگی پہ پھیلنے والا تھا۔ دھڑا دھڑ الٹیوں نے اس کا مستقبل تاریک ہونے کا عندیہ دے دیا تھا۔ مشتاق کے سسر کا انتقال ہوگیا تھا۔ ساس اکیلی تھیں اس لیے وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہیں شفٹ ہوگیا تھا۔ جاتے ہوئے وہ ایڈوانس کی رقم اس رات کا نذرانہ سمجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ خالی گھر، اندیشے لوگوں کی ترحم بھری نگاہیں۔ کہیں اٹھتی انگلیاں، دیواروں پہ بنتے بگڑتے سائے حسن آرا کو پاگل کر رہے تھے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ آنکھوں کے سوتے خشک ہوگئے تھے۔ گلا بین کر کر کے بیٹھ چکا تھا۔ مگر کون سننے والا تھا باہر کسی کو نہیں پتا تھا لیکن آخر کتنے دن؟؟

آخر میں کب تک یوں چھپی رہوں گی۔ پھر کیا ہوگا جب لوگوں کو پتا چلے گا۔ اس پہ کتنی باتیں بنیں گی۔ اس کے کردار کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں پڑیں گی۔ ہوسکتا ہے اسے سنگسار کردیا جائے۔

اب وہ بھی ادر جائے نماز دعا مانگتے وہیں سو جاتی پھر آنکھ کھلتی اور پھر اللہ سے فریاد کرتی اب تو آواز ہی نہ نکلتی۔ الفاظ بھی ختم ہوگئے۔

حسنہ کی ابھی آنکھ لگی تھی وہ خواب دیکھ رہی تھی یا سچ مچ جاگ رہی تھی پتا نہیں ایک خیال کوندے کی طرح اس کے ذہن میں آیا۔ نہیں نہیں وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

وہ تو...... میں کیسے اس سے...... اسے تو لوگ......

اس کا سر گھوم گیا یہ کیسا خیال آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی دکھی تھی۔ لوگوں کا ستایا ہوا وہ بھی تھا۔ وہ بھی بے سمت ماری جا رہی تھی۔ مجھے تو سہارے کی ضرورت ہے ورنہ چند دنوں بعد شاید لوگ مجھے بھی اسی طرح پتھر مارتے ہوئے میرے پیچھے بھاگیں گے۔

''نہیں۔ بدستور یہی خیال اسے ہولا دیتا تھا۔ میرے شریف ماں باپ کی عزت کو یوں اچھالا جائے۔ نہیں میں ایسا نہیں کرسکتی۔ وہ مجھے کیا سہارا دے گا وہ تو خود......

دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ دل باغی تھا اور دماغ اس کی مدد کر رہا تھا۔ کس برتے پہ انکاری ہے کون آئے گا یہاں؟ دماغ کا سوال تھا۔ شاید اللہ کو رحم آجائے اور وہ کوئی مسیحا بھیج دیں۔'' دل نے جواب دیا۔ یہ مسیحا ہی ہے۔ کسی کا سہارا مانگنے کے ساتھ کسی کا سہارا بن جائے۔ یہ نیکی تجھے بھی بھاری نہ پڑے گی۔'' دماغ کا جواب تھا۔

''ڈیڑھ ماہ ہونے والا ہے کیا کوئی آیا...... اور جس نے تجھے اس حال پہ پہنچایا ہے وہ تو کب کا جا چکا وہ نہیں پلٹے گا۔ حسن آرا ابھی وقت ہے تو کسی کا بھرم رکھے گی تو تیرا بھرم رہ جائے گا۔ ورنہ صرف چند دنوں کی بات ہے پھر تو شاید......

دماغ نے بات ادھوری چھوڑی۔

''کیا وہ لوگ مان جائیں گے۔ اس کے ماں باپ اور وہ......'' حسنہ نے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو جا تو سہی دکھی لوگ ہی تو سہارا بنتے ہیں۔''

دماغ نے آخر حسن آرا کو زیبنا کے گھر جانے پہ مائل کر ہی دیا۔ حسن آرا اٹھی آنسو پونچھے اور چادر اوڑھ کے زیب النساء کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔

☆☆☆

آج نہ حسن آرا کی پاکدامنی پر کوئی انگلی اٹھانے والا ہے اور نہ میری مردانگی پر کوئی تہمت ہے۔ حادثے ہوتے ہیں۔ گزر جاتے ہیں۔ لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہمارا بیٹا! ہمارا واحد سہارا جس نے مجھے اور حسن آرا کو محفوظ اور مضبوط کر دیا۔ خدا ہمارے بیٹے کی عمر دراز کرے۔ آمین۔ آپ بھی دعا کیجیے گا۔

☆☆☆

چھٹی طویل سچ بیانی

عشق عالی نسب!

طاہرہ اشفاق

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا سفر کرتی ایک یادگار کتھا

بارش بہت زور سے برس رہی تھی اور ماسی جیراں سمیت سبھی گاؤں والوں کی نظریں دعا کی صورت بار بار آسمان کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

ساون کی یہ موسلا دھار بارش ہمیشہ ہی اس بستی پر خدا کی بہت بڑی آزمائش بن کر نازل ہوتی تھیں۔

کچی بستی کے اکثر گھروں کی چھتیں اِن بارشوں کی وجہ سے گر جاتیں۔ اکثر سیلابی پانی یا ریلے میں ڈھور ڈنگر بہہ جاتے۔

اکثر آسمانی بجلی سے کئی زندہ جانیں راکھ ہو جاتیں۔

ہر سال گاؤں والوں کے لیے جون، جولائی اور اگست یہ تین مہینے عذاب بن کر آتے۔

ایسے ہی ایک سال ماسی جیراں کا ہنستا بستا گھرانہ موت کا گھر بن گیا۔

کچھ سال پہلے اگست کے مہینے میں ایسی ہی مسلسل موسلا دھار بارشوں سے ماسی جیراں کے گھر کی چھت گر گئی تھی جس میں اُس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا سوئے ہوئے چھت کے نیچے دب کر مر گئے تھے۔

اب اس خاندان میں صرف ماسی جیراں اور اُس کا بیٹا نور دین عرف نورا تنہا ہی رہ گئے تھے۔

ماسی جیراں آج بھی پرانے دکھ کو یاد کر کے گھنٹوں رویا کرتی تھی۔

اس وقت بھی چھت دیکھ کر ماسی جیراں کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

کچی چھت مسلسل ٹپکنے سے کسی بھی وقت گر سکتی تھی، مگر بارش کا زور تو ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اُدھر ماں کے پاس اُداس، فکر مند، ماں کے ساتھ چمٹا نورا بھی ماضی کے حادثات بھری یادوں میں کھویا تھا کتنا تنہا رہ گیا تھا وہ بہن بھائیوں کے بعد، کتنی رونق تھی اُن کے دم سے، کتنی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔

ابا تو دمے کا مریض تھا وہ تو بہت پہلے ہی دنیا سے چلا گیا۔

اب تو نورے کا بھی کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ بکریاں بھوک پیاس سے نڈھال رہتیں مگر اُسے کوئی احساس نہیں تھا حالانکہ جب اُس کے بہن بھائی زندہ تھے وہ سب بکریوں کے بچوں کو گود میں اٹھائے پھرتے، اُن کے مختلف نام رکھتے، انہیں اُٹھائے اُٹھائے کھیتوں میں لے جاتے۔

وہ ذات کے 'کمہار' تھے سو مٹی کے برتن بنانا اُن کا پیشہ تھا۔ وہ بڑے بھائی 'جورے' کے ساتھ مل کر برتن



بنایا کرتا تھا۔ اُس کی چھوٹی بہن 'صغراں' تو باقاعدہ اپنے کھیلنے کے لیے اُس سے فرمائش کر کے برتن بنوایا کرتی تھی جبکہ صغراں سے بڑی 'رانو' اماں کے ساتھ مل کراتنی صفائی اور مہارت سے برتن بناتی کہ خود اماں داد دیے بغیر نہ رہ سکتی۔ رانو کے ہاتھوں میں صفائی کے ساتھ ساتھ بہت تیزی بھی تھی۔ اماں کے مٹی گوندھنے تک وہ برتن کوئی شکل دے چکی ہوتی۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف علاقوں کی کڑھائیوں میں بھی بہت مہارت رکھتی تھی۔ ماسی جیراں کے کمرے میں تو ہر طرف اُس کے ہاتھوں سے کڑھے غلاف، چادریں اور مختلف چیزوں کے کور بنے رکھے تھے۔ رانو کے ہاتھ کے بنے برتنوں میں مٹی کے تباک، ہانڈیاں پیالے زیرِ استعمال تھے جبکہ صغراں کی گڑیا اُس کے کھلونے اب تک ماسی جیراں اور نورے نے سنبھال رکھے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر روتے رہتے۔

نورا اکثر رات کو دیر تک روتا اور جاگتا رہتا۔ رات بھر جاگنے سے سویرے دیر سے آنکھ کھلتی۔ اماں سرہانے کھڑی شور مچا رہی ہوتی اور مسلسل بول رہی ہوتی۔

''نورے اب تو اُٹھ جا کب کا دن چڑھ آیا ہے اب تک نامرادوں کی طرح سو رہا ہے۔ وہ تیری دیبا اور لالی باہر جانے کے لیے رسیاں تڑوا رہی ہیں۔ گائے الگ چارے کے لیے ترس رہی ہے۔ دھوپ سے مٹی بھی خشک ہوگئی ہے ابھی دوپہر کے لیے لسی بھی بلونی ہے۔''

''ارے اُٹھ جا نامراد...... کل مکی کا آٹا چھوڑ آیا تھا چکی پہ جا کے دیکھ کم بخت نے پیسا کہ نہیں۔'' ماسی جیراں دن بھر کے کاموں کی فہرست نورے کے سرہانے کھڑے ہو کر گنوا جاتی مگر نورا سُن کر اَن سُنی کر جاتا اور کروٹ بدل کر پھر سوتا بن جاتا۔

ماسی جیراں بھی نام کی ایک تھیں ایسے حربے آزماتیں کہ مردے بھی جاگ پڑتے وہ تو پھر نورا تھا۔ یا تو پانی کا پورا ڈول نورے کے اوپر یا اکثر گوبر سے بھرے ہاتھ عین نورے کی ناک کے سامنے کر دیے جاتے اگر ایسے بھی نہ جاگتا تو دھواں دیتا اُپلا اُس کی ناک کے سامنے کر دیتی اور وہ کھانستا فوراً اُٹھ کے بیٹھ جاتا۔

یہ ماسی جیراں کے خاص حربے تھے جو اکثر کارگر ثابت ہوتے کبھی کبھار سوتے میں اکثر نورے کی چارپائی کو بہت زور کا جھٹکا لگتا پہلے جھٹکے کے بعد جھٹکوں میں تیزی آجاتی تو وہ زلزلے کا گمان کرتا خوفزدہ، ہراساں اُچھل کر بیٹھ جاتا۔ مگر جب سامنے اماں کی مسکراتی 'مذاق اڑاتی' فاتحانہ صورت دیکھتا تو اپنے بیوقوف بن جانے پر خود ہی ہنس پڑتا۔

پھر آہستہ آہستہ اُسے خود ہی بوڑھی ماں کا احساس ہونے لگا اور اب، اب تو اُس نے ماں کی تقریباً ساری ذمہ داری سنبھال لی تھی۔

''اماں پتا نہیں یہ بارش کب ختم ہوگی، ختم ہوگی کہ نہیں۔'' وہ ازحد مایوس لہجے میں ماں سے پوچھنے لگا جس کے چہرے پر شاید اُس سے بھی زیادہ مایوسی تھی۔

''پتا نہیں نورے' مجھے تو لگتا ہے یہ چھت ہم پر گر کر ہی رہے گی۔'' اماں کی نگاہ مسلسل ٹپکتی چھت پر جمی ہوئی تھی۔

''اماں دعا کر یہ بارش رُک جائے میں چوہدری صاحب سے درخواست کروں گا کہ کچھ پیسے اُدھار دے دیں کم از کم اس چھت کو ہی ٹھیک کروالوں۔ مجھے یقین ہے چوہدری صاحب کبھی انکار نہیں کریں گے۔''

''دعا ہی تو کر رہی ہوں نورے۔'' اماں کھوئی کھوئی سی کیفیت میں بولیں۔

☆☆☆

سترہویں روز بارش کا سلسلہ کچھ کم ہوا اور ہلکی ہلکی سی دھوپ گویا رحمت بن کر اُتری ہر طرف انسانوں اور ڈھور ڈنگروں کی چہکار سنائی دینے لگی۔

اماں اور نورے کے چہرے پر بھی تشکر کے ساتھ ساتھ خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔

''چل جا نورے تو حویلی ہو آ...... اتنے دن ہوئے حویلی نہیں جاسکا کیا پتا کتنے کام پڑے ہوں تیرے واسطے۔''

''اماں چلتا ہوں ذرا لالی، دیبا کی گھریوں کی صفائی کرلوں۔'' نورے نے جھاڑو لیا اور بکریوں کے چارے کی جگہ کو صاف کرنے لگا۔

ابا کے بعد نورا بھی حویلی میں ماں کے ساتھ جانے لگا وہ حویلی کے اندر اور باہر کے چھوٹے موٹے کام نبٹا دیتا اماں ہفتے میں ایک دو مرتبہ حویلی والوں کے کپڑے وغیرہ دھوکر دے دیتی تھیں اور کبھی کبھار کوئی بستر وغیرہ سلوانا ہوتا یا زیادہ مہمانوں کی آمد پر کھانا وغیرہ بنوانا ہوتا تو ماسی کے ذائقے دار ہاتھوں ہی سے مہمان لطف اندوز ہوتے۔

ماسی جیراں کی خوددار طبیعت اور حد درجہ شرافت کی بنا پر ماسی جیراں اور نورے دونوں کو نوکروں کی فہرست میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔

چوہدری شجاعت ماسی جیراں کا خاص احترام کرتے تھے۔ اس لیے نورے کو بھی زنان خانے میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ مگر نورا خود ہی اپنی ازلی شرمیلی طبیعت کی وجہ سے کم ہی حویلی کے زنان خانے میں جاتا۔

اب تو حویلی کی چھوٹی دونوں بیبیاں بھی جوان ہوگئی تھیں اور عنقریب دونوں بہنوں کی شادی بھی متوقع تھی۔ وہ گھر کے کاموں سے فرصت کے بعد حویلی آیا تو معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ ایک تو اتنے دنوں بعد دھوپ نکلی تھی اور دوسرے شہر سے چھوٹی بی بی ماہ جبیں نے آج حویلی آنا تھا۔

چوہدری شجاعت کو چھوٹی بی بی ماہ جبیں سے بہت پیار تھا وہ اُسے لاڈ سے 'مینا' کہتے تھے اور وہ سچ مچ مینا ہی کی طرح چہکتی رہتی تھی۔

ماہ جبیں عرف 'مینا' شہر میں پڑھنے گئی ہوئی تھی اور شاید امتحانوں سے فراغت کے بعد گاؤں بہنوں کی شادی میں شریک ہونے آرہی تھی۔

اُسے یاد تھا تین سال پہلے مینا گاؤں آئی تھی سفید یونیفارم میں دو پونیاں آگے کی طرف ڈالے

چیونگم چباتی وہ کیسے چوہدری صاحب کے آگے پیچھے مینا کی طرح چہچہاتی رہتی تھی گو کہ اُس وقت بھی وہ دسویں جماعت کے پیپر دے کر آئی تھی مگر معصوم بچیوں کی طرح اچھل کود کرتی معصوم تتلی ہی لگ رہی تھی۔

''پتا نہیں بی بی صاحبہ ویسی ہی ہوں گی کہ بدل گئی ہوں گی۔ مگر اِن لوگوں کا کیا ہے انہیں ہماری طرح احساسِ ذمہ داری تھوڑا ہی ہوتا ہے نہ کوئی فکر' نہ پریشانی خوشیاں ہی خوشیاں راحت ہی راحت اِن لوگوں نے سنجیدہ ہو کر کیا کرنا بھلا۔'' نورا خود ہی ذہن میں سوال جواب کر رہا تھا۔

نورے کو واپسی میں کافی دیر ہو گئی تھی کیونکہ واقعی اُس کے لیے وہاں بہت کام پڑے تھے مگر مینا بی بی کو دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہی کہ بی بی اُس وقت تشریف لائیں جب وہ حویلی کے کسی کام سے گاؤں سے کافی دور حکیم جی کے پاس دوا لینے کے لیے چلا گیا تھا۔ اُس کی واپسی تک اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا اس لیے وہ دوا منشی جی کو پکڑا کر بوجھل دل کے ساتھ گھر واپس آ گیا تھا جہاں اماں بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے کئی دن تک نورے کی حسرت حسرت ہی رہی۔ مینا بی بی شاید اب بڑی اور سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ جبھی اتنے دن گزرنے کے باوجود کھیتوں کھلیانوں کی سیر کے لیے نہیں نکلی ورنہ تو آتے ہی انہیں کھیتوں میں سیر کی جلدی ہوتی تھی مگر اب......

''کہیں مینا بی بی کی طبیعت خراب نہ ہو؟ پہلا خیال اُسے یہی آیا مگر اماں نے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔ اُسے خود ہی اپنا خیال جھٹلانا پڑا۔ پھر کیا بات ہو سکتی ہے۔ نورے کو کچھ زیادہ ہی فکر ہو رہی تھی۔''

''نورے اٹھو تمہیں چوہدری صاحب یاد فرما رہے ہیں۔'' وہ برتنوں کی دکان میں کافی دیر سے فارغ بیٹھا سوچ رہا تھا جب کمالے کی آواز سے یکدم چونک اٹھا۔

''اچھا تو جا میں آتا ہوں۔''

''جلدی آنا۔ فرحین بی بی کو کوئی ضروری کام ہے۔'' کمالا ہدایت دینا نہیں بھولا تھا۔

حویلی...... فرحین بی بی...... اور جیسے اپنی خوش بختی پر اُسے یقین نہیں آیا۔''مینا بی بی بھی تو وہیں کہیں ہوں گی آج تو ضرور نظر آئے گی۔ اور با تیرا کیسے شکر کروں۔ چل بھئی جلدی کر......'' وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

پتا نہیں وہ کیوں بھول رہا تھا مینا بی بی چوہدرانی ہے اور وہ کمی کمین کمہار۔

اُسے تو شاید تین سال پہلے والی مینا کی خود سے پر خار کھاتی عادتیں بھی بھول گئی تھیں۔

وہ حویلی پہنچا تو فرحین اور نازنین اُسی کے انتظار میں کھڑی تھیں جبکہ مینا بی بی اُسے کہیں نظر نہیں آئی وہ بے دل سا حکم کا منتظر تھا۔

فری اور نازی بی بی کو تو دھیان نہیں رہا کہ نورے کے حلیے کی طرف توجہ دے دیں انہیں تو اپنے کام کی جلدی پڑی تھی انہوں نے شہر سے کچھ چیزیں خریدنا تھیں اور بابا سائیں کا حکم تھا کہ وہ نورے کو بھی ساتھ لے کر جائیں۔ گو کہ باقی نوکر بھی اعتبار کے تھے مگر نورے پر انہیں کوئی زیادہ ہی بھروسا تھا۔ وہ ایک باڈی گارڈ کی حیثیت سے اُن کے ساتھ ہوتا۔

''میں پرس تو بھول ہی گئی تھی۔'' کہتے ہوئے جب وہ اُن کے پاس آ کر رُکی تو نورا تو گویا ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہ اُٹھی اور پھر پلٹنا بھول چکی تھی۔ تین سال پہلے اور تین سال بعد کی مینا میں کتنا فرق تھا یہ تو کوئی دیوی تھی جو رستہ بھول کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ کالے لباس میں چاند کو ماند کرتا حسن اُس نے پہلے کب دیکھا تھا۔

وہ وہیں پتھر ہو جاتا اگر اُسی دیوی کی رعونت بھری آواز اُسے حقیقی دنیا میں واپس نہ لاتی۔

''یہ کیا نگاہیں اُٹھائے مجھے گھورے جا رہے ہو۔ تم میں سینس نہیں ہے کیسے جاہل گنوار حلیے میں کیچڑ سے بھرے جوتوں کے ساتھ اتنے مہنگے کارپٹ پر آ کھڑے ہوئے ہو، اب یہ تمہارا باپ صاف کرے گا۔ اُونٹ کے اُونٹ ہو گئے ہو مینرز نہیں آئے۔ خود تو گوبر اور کیچڑ میں لتھڑے رہتے ہو اس لیے کسی

دوسرے کی قیمتی اشیاء کا کچھ احساس نہیں۔ اب دفع ہو یہاں سے۔ بابا جان کا بھی کوئی حال نہیں ہر ایرے غیرے کو یہاں کا رستہ دکھا دیتے ہیں۔'' غصہ تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

نورے نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ اور بھڑک گئی۔

''اب دفع بھی ہو جاؤ کیا گنواروں کی طرح منہ کھولے کھڑے ہو۔'' اُس نے نازی اور فری کی بھی کوئی بات نہیں سنی اور دھم دھم کرتی واپس کمرے میں چلی گئی۔

اِسے کیا ہوا دونوں ہی حیران پریشان کھڑی تھیں۔ جبکہ مینا کے ایسے سرد اور طنزیہ رویے پر نورا بھی نوٹ کر رہ گیا۔ کتنی خوشی اور ارمان سے وہاں گیا تھا کہ دل کی مراد بھر کر لوٹے گا مگر وہ تو ایسا نامراد لوٹا کہ ہر چیز سے دل اُچاٹ ہو گیا۔

اُسے حیرت تھی کہ آخر مینا بی بی اُس کے ساتھ ہی کیوں ایسا برتاؤ کرتی تھیں۔

بے شک وہ شہر کے اسکول میں پڑھتی تھیں خوبصورت تھی اور اُسے اپنی چوہدراہٹ کا بھی زعم تھا اور نورا تو ہر حیثیت میں اُس سے کم تھا مگر بڑی دونوں بی بیوں نے تو کبھی نورے کو ایسے بے عزت نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ فری اور نازی بی بی دونوں شہر جانے کے باوجود اپنے جامے میں رہیں جبکہ مینا بی بی اب کافی ماڈرن دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید شہر کی پڑھائی نے مینا بی بی کو بدل دیا ہو۔

''مگر شہر کی پڑھائی احساسات کو کیوں بدل دیتی ہے۔ ایسا منجمد کر دیتی ہے کہ کسی کی آنکھ میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بھی نظر نہ آئے۔'' وہ جھیل میں کنکر پھینکتے ہوئے مسلسل اُسی دشمن جاں کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ احساس ذلت اور اہانت سے اُس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔

''محبت میں ذات کی قید کون دیکھتا ہے۔ یہ تجارت تو نہیں ہے مگر تم ٹھیک کہتی ہو مینا بی بی! میں اپنی اوقات کیوں بھول جاتا ہوں۔ تم چوہدرانی ہو اور میں کمہار۔ یہ تفرقے تو ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے تو پھر...... اُٹھ نورے...... اماں انتظار کر رہی ہوگی۔'' وہ خود سے کہتا انتہائی بوجھل دل کے ساتھ گھر کی طرف چل پڑا۔ رات بہت ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ماسی جیراں مطمئن تھی کہ نورا حویلی کام سے گیا ہے مگر شام کے بعد رات کے اندھیرے نے اُسے پریشان کر دیا تو وہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو کر نورے کا انتظار کرنے لگی۔ اُن کے گاؤں سے حویلی کافی دور تھی اس لیے دن بھر کی تھکی ہاری ماسی جیراں کو نورے کا انتظار کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

مگر جلد ہی اُسے گھر کی طرف آتا دیکھ کر ماسی مطمئن ہی اندر پلٹ گئی۔

نورا کچھ بھی کھائے پیے بغیر تھکن کا بہانہ کر کے جلدی چارپائی پر کروٹ بدل کر سو گیا۔

اکثر رات کو دیر سے واپسی پر وہ ایسے ہی بغیر کھائے پیے سو جاتا تھا اس لیے ماسی جیراں بغیر کچھ کہے خود بھی دوسری چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔

☆......☆......☆

صبح کا سورج معمول کے مطابق طلوع ہوا۔ وہ ماں کی خاطر خود کو کمپوز کر رہا تھا ورنہ تو دل چاہ رہا تھا کہ پڑا لیٹا رہے مگر بوڑھی ماں کی خاطر اُسے کام دھندہ تو کرنا ہی تھا۔ باقی کاموں سے فراغت کے بعد وہ اپنی برتنوں کی دکان پر چلا گیا کل بھی اُس ظالم لڑکی کی وجہ سے سارا دن خود سے لڑتا جھگڑتا رہا اور کام یونہی پڑا رہا۔

چوہدری شجاعت جو خود بھی چھوٹے بڑے ہر ایک کی عزت کے قائل تھے وہ اپنی بیٹیوں کو بھی اکثر نصیحت کرتے رہتے تھے کہ انسان چاہے امیر ہو یا غریب سب کا مقام یکساں ہے سب کو ایک ہی نظر اور حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔''

اُن کی باتوں پر بڑی دونوں بیٹیاں تو دل و جان سے ایمان رکھتی تھیں مگر اکثر اب مینا بگڑنے لگی تھی خاص کر نورے کے معاملے میں وہ بہت مخالفت پر اتر آئی۔ وہ صاف کہہ دیتی۔

''بابا جانی یہ بیک ورڈ لوگ ہیں اُن کی سوچ بدلنا بہت مشکل ہے آپ چاہے جتنا اِن کے بارے میں

روشن خیالات رکھیں یہ وہی لکیر کے فقیر ہیں زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے مگر یہ اپنی پرانی مالاؤں کو جپنا نہیں بھولتے بس اس لیے مجھے اِن سے نفرت ہے۔''

اور جب کل کے واقعے پر اُسے بابا جان نے سمجھانا چاہا تو وہ جھٹ سے اکھڑ گئی کہ اُس نیچ ذات کے انسان کی وجہ سے آپ مجھے جلیم کریں گے۔'' سو اُس کی ناراضگی کے ڈر سے چوہدری شجاعت نے اُسے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔ اُس کا تنفر انداز چوہدری شجاعت کو کسی گہری سوچ میں گم کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

نورا کچھ دنوں سے بہت چپ چپ سا تھا۔ نہ بولتا نہ ہنسی مذاق نہ حویلی کی کوئی بات۔ وہ بدلتا جا رہا تھا۔ کام کرنا، خدمت کرنا، عجیب سے حلیے میں عجیب سی چپ...... ماسی جیراں گھبرو جوان بیٹے کی اس عجیب حالت سے پریشان ہوگئی۔ جبھی ایک دن اُس سے پوچھ لیا۔

''پتر کیا بات ہے! تُو بڑا اُدکھا لگ رہا ہے۔''

پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا مگر اماں کہاں ہار ماننے والوں سے تھیں آخر نورے کو ماں کے آگے جھکنا ہی پڑا جبھی وہ کسی ناوان کمسن بچے کی طرح روتا تڑپتا ماں کے قدموں سے لپٹ کر وہ خواہش کر بیٹھا جسے پورا کرنا آخری سانس تک ماسی جیراں کے بس سے باہر کی بات تھی۔

اُس نے مانگا بھی تو کیا اُس نے کہا بھی تو کیا۔

''اماں مجھے چندا لادے مجھے مینا لادے ورنہ تیرا نورا مرجائے گا اماں۔ صرف ایک بار چوہدری صاحب سے بات کر صرف ایک بار۔ مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔'' وہ کہہ رہا تھا اتنے یقین سے اتنے مان سے کہ ماسی جیراں گنگ سی اُسے تکے گئی۔

''اماں تُو جائے گی ناں تو دیکھ لینا چوہدری صاحب تجھے کبھی انکار نہیں کریں گے وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''اماں خدا کے واسطے صرف ایک بار صرف ایک بار تُو میری خاطر چوہدری سے سوال کر پھر جو فیصلہ ہوا مجھے قبول ہوگا اور سن وہ مجھے انکار کیوں کریں گے؟ کیا کمی ہے مجھ میں، خوبصورت ہوں۔ جوان ہوں صحت مند ہوں اور کماتا بھی ہوں اور مسلمان ہوں۔''

''مگر کمہار بھی تو ہے۔'' اماں نے اُس کی بات وہیں سے اُچک لی۔

''یہ بات کیوں بھول جاتا ہے تُو......'' اماں نے تلخ سے لہجے میں یاد کرایا۔

''ہاں کمہار ہوں تو کیا ہوا! اماں انسان تو ہوں یہ ذات پات انسان کی پہچان کے لیے ہے دولت پیسہ ذات برادری کوئی ساتھ لے کر نہیں جاتا وہاں اعمال دیکھے جاتے ہیں خدا تو کسی سے بھی سید، قریشی، قادری، چشتی، چوہدری، یا کمہار ہونے کی وجہ سے محبت یا نفرت نہیں کرتا پھر لوگ کیوں ان چیزوں پر فخر کرتے ہیں۔ مگر تو یہ سب نہیں سمجھے گی اماں...... کیونکہ تُو سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔ تجھے بیٹے کی خوشی عزیز نہیں ہے ناں بلکہ تجھے تو بیٹا ہی عزیز نہیں ہے۔'' وہ اتنا کچھ سُنا کر بغیر ماں کا جواب سنے روٹھ کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ بوڑھی ماں آوازیں دے دے کر تھک گئی مگر اُس نے ایک نہیں سنی۔

صبح سے شام شام سے رات وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ ماسی جیراں راہ تکتے تکتے تھک گئی۔ دو تین دن بعد منت سماجت سے وہ گھر آیا تو وہ حیرت سے منت بنی ماں کو جھنجھوڑ کر بولا تو ماسی جیراں ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ وہ تو ابھی سے اپنے انجام کا تصور کر کے کانپ رہی تھی۔

''خدا کا خوف کر نورے! کچھ ہوش کے ناخن لے۔ کہاں نوردین! کہاں چوہدری کی بیٹی، کتوں کے آگے ڈلوانے کا ارادہ ہے کیا، یہ بات زبان پر بھول کر بھی نہ لانا چوہدری کو ذرا اس بات کی بھنک پڑی تیری تو کھال اُدھیڑے گا اور میرے بھی ٹوٹے ٹوٹے کروا دے گا۔'' ماسی جیراں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر کہتے ہیں محبت جب انتہا پر ہو تو کوئی عذر قبول نہیں کرتی جبھی نورا بھی اس وقت ہر انجام سے نڈر اپنی ضد پر اڑا تھا۔

ماسی جیراں صرف اُس کی ضد کے آگے مجبور ہو کر

ڈرتے ڈرتے چوہدری کی حویلی جا پہنچی مگر اُس کا انجام اُس کی سوچ کے برعکس ہوا وہ بغیر کسی ذلت کے خیرو عافیت گھر واپس آ گئی جہاں نورا بے چینی سے اُس کی آمد کا منتظر تھا ماں پر نظر پڑتے ہی نورا بے چینی سے بھاگتا ہوا ماں سے لپٹ کر سوال کرنے لگا۔

☆......☆......☆

''باجی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' ایک نوجوان خادمہ چوہدری شجاعت کی تیسری اور لاڈلی بیٹی مینا بی بی کے پاؤں دباتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ مینا بی بی نے کبھی اُسے خادمہ نہیں سمجھا ہزاروں غلطیوں کے باوجود اُسے کبھی ڈانٹا نہیں زبان سے کوئی کام کہنے کے بجائے آنکھوں کے اشارے سے سمجھا دیا۔

حاجرہ کو اپنی اس بی بی سے بہت لگاؤ تھا۔ اُس سے بی بی کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی کیسی سونی شہزادی تھی کیسی ہنستی مسکراتی اور باتونی ہوا کرتی تھی مگر جانے کس کی نظر کھا گئی کہ بے چین بھٹکی روح کی طرح حویلی کی لمبی راہداریوں میں اِدھر سے اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مگر پھر بھی بے سکون رہتی تھی۔

اُس کی یہ حالت پچھلے دس سال سے تھی حالانکہ اُسے کوئی بیماری بھی نہیں چوہدری شجاعت نے ان دس سالوں میں کوئی ڈاکٹر، کوئی حکیم، کوئی پیر فقیر نہیں چھوڑا مگر کوئی مینا بی بی کو ٹھیک نہ کر سکا۔ ڈاکٹر کہتے تھے مینا بی بی کو صدمہ ہے پیر فقیر سایہ اور تعویذ بتاتے ہیں جبکہ نفسیات والے دماغ کی خرابی بتاتے ہیں اب تو گھر والے بھی مینا بی بی سے تھک گئے ہیں ایک میں ہی ہوں جسے مینا بی بی کا دکھ تڑپائے رکھتا ہے خود ہی سوال کرتی ہوں۔ خود ہی جواب دیتی ہوں۔ مینا بی بی تو گویا گونگی ہو گئی۔ ہیں پتا نہیں بی بی کو کیا ہوا مگر گاؤں والے تو کہتے ہیں ایک رات اچانک وہ اُٹھ کر چیخنے چلانے لگیں۔ کمرے میں موجود ہر چیز کو تہہ و بالا کر دیا اور عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں ایسے جیسے کوئی اپنے محبوب سے اظہارِ عشق کرے مگر وہ کون ہو سکتا ہے مینا بی بی بھلا کس سے محبت کر سکتی تھیں۔ یہ ضرور کسی جن دیو کا چکر ہے۔

حاجرہ مینا بی بی کے چہرے پر نظریں جمائے خود سے مخاطب تھی۔

وہ آج پھر کسی پیر صاحب کا پتا لے کر آئی تھی۔ اُس کی سہیلی ساجدہ بھی کئی مرتبہ اُس پیر کے پاس جا چکی تھی۔ اُس کا لاعلاج مرض دو مرتبہ دم ڈلوانے سے ہی بالکل غائب ہو گیا تھا۔ اب ساجدہ تو اُس پیر کی پکی مریدنی ہو گئی تھی۔

ساجدہ کے بتائے گئے پتے کے مطابق وہ پیر صاحب ساتھ والے گاؤں کے ویران کھنڈر قبرستان کے پاس اُس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا اُس کی دعا میں بہت تاثیر تھی وہ دنیا کی لالچ سے پاک صرف خدا کی خوشنودی کا طلب گار تھا۔

وہ تو خود کو پیر کہنے والوں پر بھی سخت خفا ہوتا تھا کہتا تھا کہ ''صرف اللہ سے مانگو اور یہاں مت آیا کرو۔ میں خود کو گنہگار سمجھتا ہوں تم لوگوں کی دعا کے قابل نہیں سمجھتا۔''

''بی بی آپ فکر نہ کریں میں خود آپ کو لے کر جاؤں گی۔ مجھے پکا یقین ہے کہ وہ آپ کا علاج کریں گے۔ اور جب آپ بھلی چنگی ہو جائیں گی نہ تو میں میٹھے چاول درگاہ پر چڑھاؤں گی اور گاؤں کے بچوں میں چنے اور گڑ بانٹوں گی۔''

وہ بہت خوش تھی اُس کی بی بی جو اس کے ساتھ پیر صاحب کے پاس جانے کو تیار تھیں۔

☆......☆......☆

یہ پرانا سا ایک قبرستان ہے۔ یہاں بہت پرانی پرانی سی قبریں ہیں۔ امیروں کی، غریبوں کی، چوہدریوں کی، کمینوں کی اونچے شملے والوں کی جو بڑی پگڑیوں پر فخر کرتے ہوئے اکڑ اکڑ کر چلتے تھے اور اپنے سے کم ذات والوں کو منٹوں میں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے تھے۔ ٹھڈوں پر رکھنے والے حقارت سے نفرت سے منہ پھیر دینے والے آج انہی کم ذات لوگوں کے برابر اسی زمین میں اُسی کفن میں اِن کچی زمین کی ڈونگی قبروں میں تمام مال و جائیداد فخر و غرور جاہ و حشمت چھوڑ چھاڑ کر یہاں بے یار و مددگار پڑے ہیں۔

اور وہ غریب بھی جنہیں حویلیوں والے نائی، لوہار، کمہار اور ڈوم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

☆......☆......☆

آج رات ہی سے شاہ جی کی حالت عجیب ہے۔ ایک بے چینی اور گھٹن تھی۔ لگتا تھا کوئی طوفان آنے والا ہے۔ کوئی شبیہہ ہے جو بار بار دھند بن کر آنکھوں اور ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتی تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود یہ دھند صاف نہیں ہوتی۔ ہر طرف عجیب پُرسوزی آوازیں بکھری ہوئی تھیں۔ دور کونے والی قبر کے پاس ایسے دھواں اُٹھ رہا تھا جیسے کوئی سوگ میں ڈھیر ساری اگر بتیاں ایک ساتھ جلا دے، اور پاس ہی کہیں ایک سفید ملبوس میں نسوانی روح دونوں بازو پھیلائے انہیں خود میں جذب کرنے کی منتظر نظر آ رہی تھی۔

مارے خوف اور دہشت کے شاہ جی کا پورا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ وہ اُس منظر سے نگاہیں چرانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر نظروں کا زاویہ ہے کہ اُس نقطے پر جم سا گیا تھا۔ اب وہ نسوانی روح خود ہی آہستہ آہستہ اُن کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے ہجر کے آنسو خون بن کر نکل رہے تھے۔ اِس سے پہلے کہ وہ شاہ جی کو اپنے بازوؤں کی آغوش میں سمیٹ کر ہجر کے ہر دکھ سے آزاد ہو کر نہال ہو جاتی حقیقت کے سیاہ ناگ نے خواب کو ڈس کر شاہ جی کو دنیا کی سفاک زمین پر واپس لا پٹخا۔ آہ کے ساتھ شاہ جی کی آنکھ کھل گئی۔

دیکھا تو سورج سر پر کھڑا تھا۔ کئی سالوں بعد آج پھر شاہ جی کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ مگر قضا نماز کو ادا کرنے کی نیت سے وضو کے لیے جونہی کوزے کی طرف ہاتھ بڑھایا یکدم زور کی تیز آندھی نے کوزے سمیت ہر چیز کو اِدھر اُدھر اڑا دیا۔ ہر طرف ریت ہی ریت پھیل گئی تھی۔ کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر وہ رات والی شبیہہ قریب آتے آتے حقیقت کا روپ دھار گئی۔

دل کی بستی میں اک طوفان سا آ گیا تھا۔ عشق حقیقی کا جام پی لینے کے بعد عشق مجازی بھی اُن کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا تھا۔ مگر وہ تو اب اس پیاس کو بہت دور چھوڑ آئے تھے۔

خدا جنہیں اپنا بنانا چاہے تو انہیں دنیا کی مفلس محبتوں کی قید سے آزاد کر دیتا ہے اور جنہیں دنیا کی لالچ بخش دے انہیں اپنی محبت کی لطافت سے محروم

کر دیتا ہے۔

کنواں چل کر آپ آیا بھی تو کب جب ساری پیاس ہی بجھ چکی۔ جامِ محبت چھلکا بھی تو کب جب طلب ہی نہیں رہی۔

سائیں میں صرف ایک دفعہ اُس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اُسے بتانا چاہتی ہوں محبت کی جو جوت اُس نے اپنے دل میں جلائی تھی وہ پوری کی پوری میرے اندر بھی جل گئی تھی مگر میں اقرار کیسے کرتی۔ میں اُسے دکھ نہیں دے سکتی تھی کیونکہ میں جانتی تھی میرے بابا لاکھ رحمدل سہی مگر طبقات کا فرق امرا اور غربا کے درمیان ہمیشہ مسئلہ رہا ہے اور پھر میری منگنی بلکہ میری بات بچپن ہی سے میرے خالہ زاد کزن سے طے تھی۔ اگرچہ ہم دونوں کے درمیان کوئی قلبی تعلق نہیں تھا مگر شاہ جی! شریف لڑکیاں ماں باپ کی عزت کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہیں۔ پھر میں کیسے نورے کو بڑھاوا دیتی۔''

وہ بول رہی تھی اور شاہ جی دور خلاؤں میں کسی نکتے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے جیسے وہ وہاں ہوں ہی نا...... مینا کو لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کے سامنے سر پٹک رہی ہے لیکن سب کچھ کہہ لینے سے اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا۔ برسوں کے رکے آنسو بے حساب بہہ رہے تھے...... وہ کہہ رہی تھی۔

''آپ کو پتا ہے شاہ جی کالج میں ایک لڑکی نے یونہی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تمہیں کسی سے محبت ہو جائے گی مگر تمہاری شادی اُس سے نہیں ہوگی، اُس وقت تو میں محض اِسے مذاق سمجھی مگر مجھے احساس نہیں تھا کہ ہجر کی کالی رات میرا مقدر ہو گی۔''

حاجرہ اپنی بی بی کو اتنے عرصے بعد اتنی لمبی بات کرتے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اور آج شاہ جی بھی کیسے خاموش جامد بی بی کی بات سن رہے تھے۔ ورنہ تو انہیں پانچ سات منٹ سے زیادہ کسی سے بات سنتے یا دیکھتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُدھر مینا بی بی مسلسل اپنی سنانے پر مصر تھی۔

''پھر جس دن ماسی جیراں بابا سائیں کے پاس میرا ہاتھ مانگنے آئی میں گھر پر ہی موجود تھی بابا سائیں ماسی جیراں کی اس جرأت پر بہت حیران ہوئے اور طیش میں آ کر انہوں نے صرف اتنا کہا کہ تم ماں بیٹے کی خیریت اِسی میں ہے کہ دونوں اب کبھی حویلی یا چوہدری شجاعت کے قریب بھی نظر نہ آنا۔''

بابا جانی کا انکار ماسی جیراں اور نورے کی خاموش تذلیل اور نورے کا اُسی دن گاؤں چھوڑ دینا گویا میرے اعصاب پر بہت بھاری بوجھ آ گرے تھے مگر زبان سے میں نے اُف تک نہیں کی مگر اندر سے مینا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر گئی تھی۔ مجھے ایک ایک پل زندگی ختم ہوتی محسوس ہوتی ہر طرف ایک کمی سی محسوس ہونے لگی۔ ہر چیز سے وحشت ٹپکنے لگی۔ زندگی کی تمام رعنائیاں دم توڑ گئیں۔ میری خوبصورتی اور زندہ دلی ایسے بجھنے لگی جیسے تیز ہوا سے چراغ بجھنے لگتے ہیں۔''

''پیر صاحب آپ سن رہے ہیں۔'' مسلسل بولتے بولتے اُسے احساس ہوا کہ پیر صاحب تو اُس کی بات کے جواب میں چپ خاموش جامد و ساکن بیٹھے ہیں۔ کہیں وہ اُس کی اتنی لمبی کہانی پر تھک نہ جائیں۔

''عامر سے میری شادی بھی ہوئی مگر......'' وہ رُک کر تلخ سی ہنسی ہنسی۔

''زندہ وجود جب پتھر کے بت بن جائیں اور جذبات کی گرمی بھی اِس پتھر کو موم نہ کر سکے۔ خواہشوں، امنگوں اور منہ زور جذبوں کی حقیقی پیاس نہ بجھے تو کون ضبط رکھتا ہے کہ پتھر کے مجسمے کے ساتھ ساری عمر بِتا دے۔ وہ بھی تو ایک زندہ انسان تھا۔ مکمل مرد جو گھر بسانا چاہتا تھا۔ جہاں اُس کی اولاد ہو...... خوشیاں ہوں اُس کی حکمرانی ہو۔ مگر وہ کہاں جانتا تھا دل اندر سے مر جائے تو باہر صرف برف رہ جاتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھوس برف۔

پھر اس نے تنگ آ کر برف کے مجسمے کو آزاد کر دیا مگر...... میں پھر بھی قید رہی۔ اب تک قید ہوں۔ اُس محبت میں جس نے مجھے دس سال سے ہر چیز، ہر خوشی اور اس جہان سے بھی بیگانہ کر دیا۔

بس ایک خواہش ہے آخری اور صرف آخری اُس سے ملنے کی، اُسے بتانے کی کہ محبت کے سفر میں تم تنہا تو نہیں تھے۔ میں بھی تھی کمزور نا تواں لاچار بے بس۔

میں اُس سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں شاہ جی اس سے کہنا چاہتی ہوں کہ آگ لگا کر بھاگ نہیں جاتے۔ بجھ جانے تک یا جل جانے تک انتظار کرتے ہیں۔''

''شاہ جی مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ سب کہتے ہیں کہ آپ بہت اللہ والے ہیں تو اللہ سے کہیں کہ وہ مجھے نورے سے ملا دے۔ مجھے اُس کا پتا دے دے میں نورے کو بتانا چاہتی ہوں کہ کم ذات نورے کے عشق کے روگ نے مجھے بیمار کر دیا ہے...... میں اس درد سے نجات چاہتی ہوں۔ میری مدد کریں مجھے نجات دلوا دیں۔''

وہ گڑگڑا رہی تھی بلک رہی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

کچھ لمحے مکمل خاموشی کی نظر ہو گئے پھر شاہ جی کی بھاری آواز گونجی۔

''بی بی خدا سے مانگو، اُس کی شان کے حساب سے مانگو۔ وہ اپنے بندوں کو بے حساب عطا کرتا ہے۔ تجھے بھی سکون دے گا۔''

وہ آنکھیں بند کیے ایک جذب کے عالم میں بول رہے تھے۔ حاجرہ کو اب خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر شے ساکت ہو گئی ہو۔ بینا سر جھکائے اُن کی باتیں سن رہی تھی۔

شاید شاہ جی کے لفظوں نے اُس کے ہلنے کی قوت ہی سلب کر لی تھی وہ جکڑی گئی تھی اُن لفظوں کے جال میں یا مسحور ہو گئی تھی شاہ جی کی شخصیت کے سحر میں۔

اچانک شاہ جی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر بینا کی جانب دیکھا اور نہایت سخت لہجے میں بولے۔

''بی بی انسان کو جینا پڑتا ہے کیونکہ زندگی اللہ کی امانت ہے اور چوٹ کھائے دل میں تو رب بستا ہے۔ اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کے سامنے کوئی وقعت نہیں...... لوٹ جاؤ بی بی! اپنوں میں لوٹ جاؤ۔ کیونکہ تم جس کو چاہتی ہو جس کی یاد میں دیوانی ہو گئی ہو وہ اب تمہیں نہیں چاہتا...... تم سے بچھڑنے کے دکھ نے اُس کو اپنے رب کا قرب دے دیا۔ اور اس قرب کے بعد بندے کو دنیا میں کسی شے کی آرزو نہیں رہتی۔ نورے نے اپنے رب کو پا لیا۔ جا تو بھی اپنے رب کو تلاش کر۔''

غزل

نہ فیصلہ تمہارا ہے، نہ فیصلہ ہمارا ہے
یہ وقت کے قزاق نے چھپا کے تیر مارا ہے
نقیبِ شہرِ شب کو جو سفر میں میرے ساتھ تھا
وہ میں نے تیرے آستاں پہ خواب لا کے وارا ہے
پسِ غبارِ وقت یوں پکارتا ہے کون اب!
یہ ہجر و غم کا سلسلہ نجانے کیوں گوارا ہے
ستارگاں کی بزم میں اُداس چاند دیکھنا
نجانے کیسا خواب ہے نجانے کیا اشارہ ہے
ہمیں یہ خواب تتلیاں تلاشنا ہیں عمر بھر
کہ ہاتھ خالی لگتے ہیں، چراغ ہے نہ تارہ ہے

شاعر: احمد سجاد بابر۔ لودھراں

اتنا کہہ کر شاہ جی کھڑے ہو گئے حاجرہ نے گھبرا کر بینا کو چلنے کا اشارہ دیا۔ بینا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تو اُن کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اس نے آگے بڑھ کر شاہ جی کے ہاتھوں کو چوما اور ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔

حاجرہ سکتے کے عالم میں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی شاہ جی کو دیکھتی کبھی زمین پر ڈھیر اپنی بی بی کے لاشے کو...... اُس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ بینا نے گرتے گرتے صرف ایک لفظ بولا تھا۔ شاہ جی کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کے بعد وہ لہرائی اور اس کے لبوں سے آہ کی صورت ''نورا'' نکلا اور برسوں کی مچلتی روح قرار پا گئی۔

☆☆......☆☆

ساتویں طویل سچ بیانی

سفر جنوں کا



نادیہ ملک

اُس فن کار کی کہانی، جسے اپنے پیشے سے جنوں کی حد تک عشق تھا مگر وہ کسی کے عشق کو نہ پہچان سکا

کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسا شاہکار جو ہمیشہ کی طرح ہلچل مچادے۔ ایک بار پھر ثابت ہو جائے کہ معیز اپنے فن میں منفرد ہے۔ فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس نمائش میں حصہ لے گا اور جب مصوروں کی فہرست شائع ہوئی تو فن شناسوں نے رائے دے دی کہ معیز کا مقابلہ مشکل ہے۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوا تھا۔ ملک بھر کے مصور بار بار اس کے مقابل آچکے تھے لیکن اس جیسی سوچ، جدت اور اس کا خیال نہ لا سکے۔

وہ مصور فطرت تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کا عکاس، رنگ اور برش اس کے ہاتھوں میں آ کر گویا باتیں کرتے تھے۔ رنگ اپنی جگہ کا تعین خود کر دیتے، لکیریں اپنی سمتیں بناتیں اور وہ ان کی مدد سے شاہکار تخلیق کرتا چلا جاتا اور جب یہ شاہکار منظر عام پر آتے تو فن شناس سر دھن لیتے تھے۔ دیکھنے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ملک سے باہر بھی کئی بار اس کی تصویروں کی کامیاب نمائش ہو چکی تھی۔

مرزا شمشیر بیگ ہر چند کہ فن مصوری کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے لیکن اکلوتے بیٹے کے شوق کو انہوں نے بھی بڑھاوا دیا تھا۔ ہر طرح اس سے تعاون کرتے۔ نورولاز کا ایک علیحدہ حصہ اس کی خواہش کے مطابق تعمیر کرایا گیا تھا۔ جہاں اس کا نگار خانہ تھا جو وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے قرب و جوار کی جگہ کو ایک مصور کی نازک خیالیوں کا نمونہ بنایا گیا تھا۔ عام کیا خاص لوگوں کو بھی اس نگار خانے تک رسائی نہیں تھی۔

نورولاز خود بھی ایک عالی شان عمارت تھی اور مرزا شمشیر بیگم کے شناسا اکثر اپنے ملکی اور غیر ملکی دوستوں کو یہاں کی سیر ضرور کراتے تھے لیکن خود مرزا صاحب بھی کسی سے اس نگار خانے کو دکھانے کا وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ معیز شاذ و نادر ہی کسی کو نگار خانے میں داخل ہونے کی اجازت دیتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک باکمال مصور تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور پھر رنگ اور برش کے ملاپ سے کسی بھی خیال کو زندہ کر لینا اس کے لئے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔

اس بار بھی کلر اینڈ آرٹسٹ نامی ایک سوسائٹی نے تصاویر کی نمائش کا انعقاد کیا تھا اور ملک میں

ے بڑے مصوروں کو مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی اور دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ معیز کے بارے میں کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوگا لیکن اس کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مقابلے میں حصہ لے گا۔ پھر حصہ لینے والے مصوروں کے ناموں کی فہرست شائع ہوئی تو



بہت سے چراغ بجھ گئے اور فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والے نمائش کی تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

معیز نے پھر ایک ذمہ داری قبول کر لی تھی اور ان دنوں وہ کسی اچھوتے خیال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کی خوبصورت کار سڑکوں' بازاروں اور ویرانوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس بار کس خیال کو موضوع بنائے۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسی چیز ہو جو ہلچل مچا دے۔

پھر اسے اس کا خیال مل گیا۔ اس کی لمبی کار ایک سگنل پر رکی تھی۔ سامنے والی کار کی کھڑکی سے ایک بھکارن نے ہاتھ اندر ڈالا اور جواب ملنے پر مایوسی سے گردن جھکا کر آگے بڑھ گئی۔ اس بار وہ معیز کے پاس آئی تھی۔ بوسیدہ' میلا کچیلا لباس' پیوند لگا ہوا' مٹی سے اٹے ہوئے بال' دبلا پتلا بدن' سوکھا چہرہ لیکن حسین ترین نقوش' ستواں ناک' پتلے پتلے ہونٹ جن پر اگر خشک پپڑیاں نہ جمی ہوتیں تو ان کا یہ گلابی رنگ نمایاں ہوتا۔ سفید رنگ جسے گرد اور دھوپ نے ماند کر دیا تھا۔

گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی وہ معیز کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس کے دبلے پتلے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں معیز کے سامنے پھیل گئیں۔ معیز نے ان آنکھوں کے سوالات کو پڑھا اور پھر جلدی سے بولا۔ ''سگنل کے اس طرف آ جاؤ......! میں تمہیں بہت کچھ دوں گا۔ فکر مت کرو۔ کوئی بدتمیزی نہیں ہو گی تمہارے ساتھ۔''

اس کی آنکھوں میں شبہات ابھر آئے۔ ہاتھ جلد سے پیچھے ہٹ گیا۔ معیز نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''ایسے بہت سے نوٹ مل سکتے ہیں تمہیں ......اس طرف آ جاؤ!

سگنل کی روشنی سبز ہو گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں طرف کا انڈیکیٹر آن کر دیا تھا۔ کار کو آہستہ آہستہ اس نے بائیں سمت کر کے سڑک کے کنارے روک دیا اور عقب نما آئینے میں بھکارن کو تلاش کرنے لگا۔ وہ آئینے میں نظر نہ آئی تو اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر پیچھے دیکھا۔

چوراہے کے دوسری جانب وہ ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کی کار کی سمت لگی ہوئی تھیں۔

معیز نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انتظار کرنے لگا لیکن وہ جھجک رہی تھی۔

''بیوقوف کہیں کی۔ اس سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟'' معیز کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔

ایک بار پھر اس نے جھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ ہلایا اور وہ اس طرح آگے بڑھنے لگی جیسے اسے پیچھے سے کوئی دھکیل رہا ہو۔ نہ جانے کون سا خیال اسے دھکیل رہا تھا۔ جب وہ سڑک عبور کرنے لگی تو معیز کو کسی قدر سکون ہوا اور چند لمحات کے بعد وہ معیز کے پاس آ گئی۔ وہ اب بھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

''خدا سلامت رکھے بابو جی! اللہ کے نام پر......''

''نخرے کیوں دکھا رہی تھی تو؟'' معیز بولا۔

''خدا خوش رکھے بابو جی! اللہ کے نام پر ......جمعرات ہے۔''

اس نے پھر کہا۔ معیز کی بات کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

''اچھا! جمعرات ہے آج۔ اس اطلاع کا شکریہ! نام کیا ہے تیرا؟''

''خوشبو! بابو جی کچھ اللہ''

''ہاں ہاں' ایک ہی رٹ مت لگا۔ یہ بتا تو سو روپے روز پر کام کرے گی..... دو سو روپے روز بھی مل سکتے ہیں۔ جواب دے!''

''نہیں بابو جی! ہم عزت نہیں بیچتے۔ اللہ کے نام پر کچھ دے سکتے ہو تو دے دو!''

''بے وقوف ہے تو' تجھ سے عزت کون مانگ رہا ہے میں مصور ہوں' تیری تصویر بنانا چاہتا ہوں' تصویر سمجھتی ہے؟''

"ہاں بابو جی!"

"بس! میں تیری تصویر بناؤں گا۔ روزانہ دو گھنٹے کے لیئے تجھے میرے پاس آنا پڑے گا۔ کم از کم ایک ہفتے کا یہ کام ہے' دو سو روپے روز دوں گا تجھے' بول منظور ہے؟"

"نہیں بابو جی! اوے دو کچھ اللہ کے نام پر!"

"جہنم میں جا' تیرا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پارسا بن رہی ہے۔ دیکھ مجھ پر بھروسہ کر...... میں صرف تیری تصویر بناؤں گا۔ ایسی تصویر کہ تو دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی جس جگہ تجھے آنا پڑے گا وہ میرا گھر ہے۔ وہاں میری ماں ہے' بہنیں ہیں، بہت سے لوگ ہیں وہاں۔ تو ایک مرتبہ میری بات مان لے۔ اگر کوئی پریشانی ہو تجھے تو آئندہ مت آنا۔"

معیز کو اس کے انکار سے سخت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ میں کیوں نہیں مان جاتی......؟

بھکارن کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

"ہم مان جائیں گے بابو جی! پر ایک بات سن لو۔"

"ہاں کہو.........!" معیز خوش ہو کر بولا۔

"ہمیں سانس کا مرض ہے اور...... اور دق بھی ہے۔ سردیوں میں سانس اکھڑتا ہے اور گرمیوں میں منہ سے خون آتا ہے۔ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ ہمیں چھوؤ گے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے۔"

"میں صرف تیری تصویر بناؤں گا اور تصویر بنانے کیلئے کسی کو چھونا نہیں پڑتا۔ سمجھی تو؟"

"ٹھیک ہے! کہاں ہے تیرا گھر......؟"

"بیٹھ جا پیچھے...... چل بیٹھ جا!" معیز نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن جھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھے ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

"ابے کیا گھٹیا ٹیسٹ ہے۔ کوئی ڈھنگ کی لونڈیا نہیں ملی تجھے؟"

معیز نے سنی ان سنی کر دی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھے لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔

"سن لیا تم نے بابو جی!"

"ذلیل تجھے آوارہ کہیں کے؟"

"ہمارا یہ ٹھکانہ تو آج چھن گیا بابو جی۔"

"کیوں؟" وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر دیں گے۔"

"ہوں...... تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔" معیز نے کہا اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ سہمی سہمی سی۔ معیز نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

وہ نور ولاز کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عقبی پورچ میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

"آ جا!" اس نے بھکارن کیلئے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اور ست ہو گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیز کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہو گئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔ چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت' بھکارن کی زبان بند ہو گئی۔ یہ طلسم کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جس وقت اسے ہوش آیا تو اس کے بدن میں خوف کر لرزش پیدا ہو گئی۔

"تم نے بولا تھا بابو جی! تمہاری ماں اور بہن......؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا کرنا ہے تجھے ان لوگوں کا......؟ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا۔" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور تھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن سہمی سہمی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے والے وقت کے لیئے خود کو تیار کر رہی تھی۔

معیز تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ مصور تھا۔ اس کی نگاہ میں اپنا شاہکار گردش کر رہا تھا۔ وہ گہری نظر

دل سے بھکارن کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی ہر نگاہ سے کانپ رہی تھی۔ پھر معیز نے کیمرہ سنبھال لیا اور مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر اتارنے لگا۔ درجنوں تصاویریں اتاریں اس نے بھکارن کی اور مطمئن ہو گیا' آج کا کام بس اتنا ہی تھا۔ اب ان تصاویروں میں سے کوئی ایک پوز منتخب کرنا تھا اور اسی اینگل سے تصویر بنانی تھی۔

''بس اتنا سا کام تھا جس سے تو مری جا رہی تھی۔ لے یہ نوٹ رکھ لے اور یہ سو روپے اوپر سے۔ کل سے تجھے دو گھنٹے یہاں روز صرف کرنا ہوں گے اور اتنے ہی روپے روزانہ ملیں گے۔''

''روزانہ؟'' بھکارن کی آواز بھینچ گئی۔

''ہاں روزانہ! کہاں رہتی ہو؟'' اس نے کہا اور بھکارن نے اپنا ٹھکانہ بتا دیا۔

''چل! میں تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں۔ تیرا گھر بھی دیکھ لوں گا تاکہ اگر تو غائب ہونے کی کوشش کرے تو تجھے تیرے گھر سے پکڑ لاؤں۔''

بھکارن تیار ہو گئی۔ معیز اسے کار میں لے کر چل پڑا۔ بھکارن کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں سے معیز کو گزرتے ہوئے ناک پر رومال رکھنا پڑا۔ واپسی پر اس نے ملازم کو ہدایت کر دی کہ کار کی سیٹ دھو دے اور اس کے بعد وہ اپنے نگار خانے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

تصاویر کے پرنٹس بنائے اور ان میں سے سب سے عمدہ پوز کا انتخاب کرنے لگا۔ ہر تصویر اپنا جواب آپ تھی۔ انتخاب مشکل ہو گیا۔ بہر حال اس نے کافی جانچ پڑتال کے بعد ایک تصویر منتخب کر لی اور اس پر کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن وہ ہمت کر کے دوبارہ بھکارن کے مکان پر پہنچ گیا۔ بھکارن اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے خود ہی کار کا عقبی دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ راستے میں اس نے کہا۔

''یہی جگہ ٹھیک رہے گی بابو جی! ہم تمہیں یہیں مل جایا کریں گے' یہیں ہمیں اتار بھی دیا کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مختصراً بولا۔

''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے یہ بات کیوں کہی۔؟''

''بتا دو۔''

''لڑکیاں چھیڑ رہی تھیں۔ پوچھنے لگیں۔ کار والا بابو کون تھا؟ کیسا ہے؟ ایسی ہی بے شرمی کی باتیں۔'' وہ شرما کر بولی۔

''ہوں۔!'' وہ بے خیالی کے انداز میں بولا۔ بھکارن کی باتیں اس کیلئے قابل توجہ نہیں تھیں۔

نور ولاز میں پہنچ کر وہ نگار خانے میں داخل ہو گیا۔ بھکارن کو اس نے سامنے بٹھایا اور کام شروع کر دیا۔ وہ بے خودی کے عالم میں کام کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھکارن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں پیار تھا' وارفتگی تھی۔ وہ اس تصویر کو آنکھوں میں اتار رہا تھا اور اس کے ہاتھ اس کے ذہن سے عکس لے کر اسے کینوس پر منتقل کر رہے تھے لیکن بھکارن کے سوکھے مدقوق چہرے پر بار بار رنگ آ رہے تھے۔ اس نے شرما کر نگاہیں جھکائی تھیں اور معیز کو اسے ٹوکنا پڑا تھا۔

''بابو جی!'' تیسرے دن اس نے کہا۔

''ہوں!''

''تھک گئی ہوں..... رات کو طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ خون تھوکا تھا میں نے۔'' اس کی آواز میں ایک مان تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا جیسے وہ پریشان ہو جائے گا' بے چین ہو جائے گا' خون تھوکنے والی بات سن کر۔ اُمید بھری نظروں سے وہ اسے دیکھنے لگی لیکن معیز کا ذہن تصویر میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے سپاٹ سے انداز میں یہ بات سنی۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''آرام کر لو چند منٹ۔'' اس نے پنسل رکھ دی اور خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔''

''کب سے بیمار ہو۔؟''

''تین سال سے۔''

''کون۔ کون ہے گھر میں۔؟''

''چاچا۔ اور بس۔''

''باپ نہیں ہے۔؟''

''نہیں۔مر گئے بہت دن ہوئے۔''

''چاچا کیا کرتا ہے۔؟''

''یہی دھندا کرتا ہے۔خاندانی کام ہے ہمارا۔''

''تمہاری شادی نہیں ہوئی؟''

''نہیں جی!''اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

''کرو گی بھی نہیں؟''معیز نے سرسری انداز میں پوچھا اور اس کے زرد چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ ناراض تھی وہ اس بات پر کہ وہ اس کے خون تھوکنے کی خبر سے پریشان کیوں نہیں ہوا لیکن اس سوال سے اس کی ناراضی دور ہوگئی۔اس نے شرما کر کہا۔

''مجھے کیا معلوم؟''

''ہاں..... یہ بات تو تمہارے چاچا کو معلوم ہوگی مگر تمہیں تو ٹی بی ہے۔''

''ٹھیک ہو سکتی ہے۔میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اگر علاج ہو جائے تو میں ٹھیک ہو سکتی ہوں۔''

''علاج کیوں نہیں کرایا؟''

''ہم غریب لوگ ہیں بابو جی!اور علاج بہت مہنگا ہے' تین ہزار روپے مہینے کی دوائی آتی ہے۔''

''اوہو' اچھا یہ بات تھی۔''وہ بدستور سادہ سے لہجے میں بولا۔

کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا اس کے دل میں۔کوئی احساس نہ تھا اس کے چہرے پر۔وہ مصور تھا' اپنے فن میں کھویا ہوا۔دوسری باتوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''پر اب میں نے علاج شروع کرایا ہے۔تم نے جو پیسے دیے تھے ناں!اس میں دوائی اور تھوڑے چاچا کو دیے۔میں نے بتایا تھوڑی ہے انہیں تمہارے بارے میں۔''

''ہوں........!''وہ آہستہ سے بولا۔

''بابو جی!پہلے میں ڈرتی تھی تم سے۔''

''مجھ سے۔کیوں؟''

''بس بابو جی!ایک بات ہوگئی تھی ایسی ہی''

''کیا؟''

''تمہاری طرح کا ایک بابو مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا' کہنے لگا ابا کی نیاز ہے۔کھانا اور کپڑے دینے ہیں مگر۔وہاں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور بابو جی!اس نے اس نے''وہ شرما گئی۔

اس نے اپنا پھٹا دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا۔انتظار کرتی رہی وہ کہ بابو کچھ بولے لیکن بابو ایک برش اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

''پھر بابو!میری طبیعت خراب ہوگئی۔میں بیمار رہنے لگی۔الٹیاں آنے لگیں مجھے۔چکر آتے رہتے تھے ہر وقت۔چاچا نے مائی بشیراں کو دکھایا اور مائی بشیراں نے چاچا کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ چچا میرے اوپر ڈنڈا لے کر پل پڑا۔کئی لاتیں ماریں اس نے میرے پیٹ پر۔میں بیمار ہوگئی۔میری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیٹ میں بچہ آگیا ہے۔خدا قسم بابو!میں تو حیران رہ گئی۔کہاں سے آگیا یہ بچہ میرے پیٹ میں؟وہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ بچہ آیا بھی اور چلا بھی گیا۔بس اس کے بعد مجھے دق ہوگئی نہیں تو پہلے میں بہت اچھی تھی۔''

''اچھا!''وہ بولا۔

''چل اب کام شروع کریں۔''اور وہ جل گئی' خاموشی سے وہاں آبیٹھی جہاں وہ چاہتا تھا۔

ایک گھنٹہ ہوگیا اسے بیٹھے بیٹھے' تب وہ اچانک بول پڑی۔

''تبھی تو اس دن میں تم سے ڈر رہی تھی۔''

''ایں!''معیز خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''مگر تم تو سن ہی نہیں رہے میری بات نہ سنو!میرا کیا ہے۔؟''

دوسری صبح جب وہ اسے لینے گیا تو وہ پہلے ہی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔معیز نے اسے نہیں دیکھا تھا۔دیکھا تو تھا لیکن پہچان نہیں سکا تھا۔یہ وہ تو نہیں تھی۔گہرے نیلے رنگ کی شلوار' خوبصورت پرنٹڈ قمیص' میچ کرتا ہوا دوپٹہ' سلیقے سے بندھے ہوئے بال۔اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی

''مجھے تلاش کر رہے ہو بابو! میں یہ کھڑی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی لیکن وہ پریشان ہوگیا۔

''یہ یہ کیا حلیہ بنالیا تُو نے؟ پاگل ہوئی ہے کیا؟'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''ارے خوب چکمہ دیا ہے چاچا کو..... کیا یاد کرے گا۔ میں نے کہہ دیا کہ آج میں شہزادی کی منگنی پر جارہی ہوں۔ خوب ڈانٹ پیپسے اس نے ایک نہ سنی۔ اچھی لگ رہی ہوں ناں میں؟'' وہ کار کے دوراز ے کی طرف بڑھی۔

''سن تو سہی! پاگل ہوگئی ہے کیا؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''کیوں! کیا ہوا؟''

''تیرے وہ کپڑے کہاں ہیں؟''

''گھر میں ہیں''

''بیکار ہے۔ تُو نے اپنی شکل بھی بگاڑ لی ہے۔ آج کام نہیں ہوسکتا۔''

''بگڑ گئی ہے میری شکل؟'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''ہاں..... تصویر کیسے بنے گی اس حلیے میں۔ دماغ خراب ہوگیا ہے تیرا' جاہل احمق کہیں کی جاؤ وہی کپڑے پہن کر آ میں انتظار کر رہا ہوں' جلدی کر!''

اس کے چہرے کی دیوالی ماند پڑ گئی۔ سارے چراغ بجھ گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر واپس لوٹ گئی۔

☆☆☆

کافی دیر سے کام شروع ہو چکا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ دن بھر خاموش رہی۔ شام کو پیسے لے کر خاموشی سے چلی گئی اور پھر دوسرے دن اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''کل میں نے دوا بھی نہیں لی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ دن بھر بس بھوکی رہی۔''

''ہوں۔!''

''آج بھی دوا نہیں لوں گی۔ سوچ لیا ہے' اچھا ہے مر جاؤں۔''

''ٹھیک ہے!'' اس نے جواب دیا اور وہ حیران رہ گئی پھر خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن اور تیسرے دن بھی کچھ نہیں کہا۔ اب وہ بجھ ویران ہوگئی تھی۔ معیز نے اس کے چہرے کی ساری ویرانیاں تصویر میں سمو دی تھیں۔ تصویر مکمل ہوگئی۔

''بس خوشبو! تیرا کام ختم'' اس نے پُر مسرت لہجے میں کہا۔

اس کی نگاہیں پنسل سے بنے ہوئے اس خاکے پر جمی ہوئی تھیں جن میں بس اب رنگ بھرنے تھے' سارے جہاں کی ویرانیوں کے رنگ۔

''میں جاؤں؟''

''ہاں! یہ پیسے رکھ لے۔'' اس نے کہا اور وہ پیسے لے کر چلی گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو جب وہ نگار خانے سے نکلا تو ملازم ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''چھوٹے حضور! باہر وہ بھکارن کھڑی ہے۔ گیارہ بجے سے کھڑی ہے۔ پریشان تھی پاگل...... پوچھنے لگی کہ صاحب بیمار تو نہیں ہوگئے۔ آج مجھے لینے نہیں آئے؟''

''اوہ! میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کام ختم ہوگیا ہے۔ جاؤ اس سے کہہ دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اندرونی عمارت کی طرف چل پڑا۔

دوسری دوپہر ملازم نے پھر اس بھکارن کے بارے میں اطلاع دی۔''

''وہ بری طرح رو پیٹ رہی ہے چھوٹے حضور! آج نو بجے ہی آگئی تھی۔ کہہ رہی ہے بس ایک بار اسے آپ سے ملا دوں۔'' وہ ملازم کو خونخوار نگاہوں سے گھورنے لگا۔

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''جی..... وہ سرکار!'' ملازم بوکھلا گیا۔

''دوبارہ مجھے اس کے بارے میں اطلاع نہ ملے۔'' اس غرائی ہوئی آواز میں کہا اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔''

اس کے بعد اسے اس بھکارن کے بارے میں کو

کی اطلاع نہ ملی۔ تصویر مکمل ہوگئی تھی جس کے پس منظر، پیش منظر میں بھکارن کا چہرہ تھا۔ حسرت و یاس کی تصویر سوکھا چہرہ، تیکھے خدوخال، پپڑی جمے ہوئے ہونٹ۔

پس منظر میں بھی وہی چہرہ تھا۔ سرسبز و شاداب، ترو تازہ، زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور۔ وہی خدوخال تھے جو پیش منظر میں تھے لیکن پس منظر میں وہ حسن دلکشی کا مجسمہ تھی۔ اس تصویر میں معیز نے انسان کی بے بسی پیش کی تھی۔ دل میں چھپے ہوئے اس درد کو لکیروں میں سمو دیا تھا جو انسانیت کا درد تھا۔ افلاس، سرسبز و شاداب چہروں کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

تصویر نمائش میں رکھی گئی اور لاکھوں نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ نقاد سر دھننے لگے۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کے دلوں پر پہلے ہی دن اوس پڑ گئی تھی۔ وہ خود اس تصویر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ معیز نے ایک بار پھر ایک شاہکار تخلیق کر دیا تھا۔

اخبارات نے لکھا۔

"نمبر ایک...... فنکار ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ پس منظر میں معیز نے ایک افلاس زدہ بھکارن کو پیش کیا ہے جو نوجوان ہے، تیکھے خدوخال کی مالک ہے، لیکن اس کے حسین نقوش افلاس اور فاقہ کشی کی چادر کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ پس منظر میں اس کا دلکش روپ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت برہنہ ہے۔

نمبر دو...... نور محل کا شہزادہ عظیم ہے کہ اس کی نگاہ زمین کی گہرائیوں پر رہتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کسی گندی سی کھولی میں رہنے والے مصور کا ذہن اگر منظر کی عکاسی کرتا تو یہ بات اس قدر قابل ستائش نہ ہوتی لیکن فنکار دولت کی چمک سے اندھا نہیں ہوتا جس کا ثبوت پس منظر ہے۔ معیز ایک ارب پتی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ مرزا معیز بیگ، بلکہ یہ صرف معیز ہے صرف ایک فنکار۔

نمبر تین...... سچ کو پرکھ کر، خون دل میں ڈبو کر معیز نے پس منظر تخلیق کیا ہے اور ایک بار پھر اپنے فن کا لوہا منوالیا ہے۔ اس کا حساس دل انسانیت کے دکھوں سے لبریز ہے۔ پس منظر کے عظیم فنکار کو ہمارا سلام!"

غزل

چاند اپنا نا کہکشاں اپنی
کیوں بنے بات آسماں اپنی
کس سے جا کر جواب مانگیں ہم
ہوگئی زیست کیوں خزاں اپنی
خود ہی روتے ہیں خود ہی ہنستے ہیں
خود ہی سنتے ہیں داستاں اپنی
سچ تو بولیں گے چاہے جانتے ہیں
کاٹ دی جائے گی زباں اپنی
جانتے ہیں نصیب اپنا ہم
صبح ہوگی دھواں دھواں اپنی
اپنے بچپن سے ملنے جاتے ہیں
ملکیت تو نہیں وہاں اپنی
سعدیہ گھر سے تو نکل آئے
جانے منزل ہے اب کہاں اپنی

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔ لندن

فیصلہ ہوگیا۔ متفقہ طور پر اس تصویر کو اول قرار دیا گیا۔ معیز کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ الٹرا ماڈرن لڑکیوں نے اس کے ہاتھ چومے، فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والی ایک خاتون نے کہا۔

"معیز! کاش تمہارے ہاتھ کی پرچھائیں ہی ہمیں نصیب ہو جائیں۔ کاش" ایک شوخ و شنگ اخباری رپورٹر لڑکی نے کہا۔

"پلیز مسٹر معیز! صرف چند سوال سنا ہے آپ اخبار نویسوں کو مایوس نہیں کرتے۔"

"جی فرمایئے!" وہ پروقار لہجے میں بولا۔

"آپ یہ خیال کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟"

"خیالات حاصل نہیں کیے جاتے۔ ان کا تعلق ذہن و دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ تصویر صرف خیالی ہے یا حقیقی؟"

''یہ ایک حقیقت ہے!''
''گویا...... آپ نے کسی کو ماڈل بنایا ہے؟''
''ہاں......!''
''کون ہے...... یہ لڑکی؟ کہاں ہے؟''
''میرے وطن' میرے شہر کی گلیاں اور سڑکیں غربت وافلاس کے ایسے ماڈلوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ لڑکی خوشبو ہے' ہاں ...... اس کا نام خوشبو ہے' لیکن یہ بھوک' پیاس' افلاس اور بیماری کے جہنم میں رہتی ہے۔ شہر کی کسی سڑک پر تلاش کر لیں۔ یہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔ یہ بدنصیب ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی۔ زندہ رہنے کی خواہش رکھتی تھی لیکن اس کی غربت' اس کا افلاس بالآخر اسے موت کی وادیوں تک لے جائے گا۔ مجھے یقین ہے' وہ طویل عرصہ زندگی کے اس بوجھ کو گھسیٹ نہ سکے گی۔''معیز کی آواز بھرا گئی۔

''آپ نے اس کی صرف تصویر بنائی ہے معیز! یا اس کی غربت کا علاج...... آپ تو ایک دولت مند خاندان کے چشم وچراغ ہیں؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''ایکسکیوزمی معیز! آپ اس کی تصویر کو فروخت کریں گے؟ سنا ہے' فن مصوری کے سب سے بڑے قدر دان سیٹھ نظام شاہ اس منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں؟'' ایک اور رپورٹر نے اسے اس نازک سوال کے جواب سے بچا لیا۔

''میں اپنا شاہکار فروخت نہیں کرتا۔''اس نے ایک شان سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

نمائش گاہ کے باہر' درمیانی سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سیٹھ نظام شاہ اپنی شاندار مرسڈیز کے پاس کھڑے کہہ رہے تھے۔

''کسی طرح اسے تیار کرو جیلانی صاحب! میں اس تصویر کا پچاس لاکھ سے پچھتر لاکھ تک دینے کو تیار ہوں۔ کم بخت نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے' کیا چیز بنائی ہے۔ جیلانی! اس کے بغیر میری آرٹ گیلری نامکمل ہے۔ تم پھر بات کرو اس سے۔ یہ ڈرائیور کمبخت کہاں مرگیا۔ دیکھو اس بھیڑ میں تو نہیں ہے؟''

''ابھی دیکھتا ہوں سرکار!'' جیلانی آگے بڑھ گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک نوجوان بھکارن کی لاش پڑی تھی جس کے قریب ایک بوڑھا بیٹھا رو رہا تھا۔

''ہائے! خوشبو! میری بچی! اب میں کیا کروں گا اس دنیا میں جی کر؟ ہائے اس جوانی میں مرنا تھا تجھے میری خوشبو! لوگو! اس کے کفن کے لئے کچھ دو۔ ارے اس بے کفن کو کفن تو دے دو۔ دوائی تو کوئی نہ دے سکا۔ اسے کفن ہی دے دو' ہائے میری خوشبو......!''

''کیا ہو گیا تھا اسے بابا؟'' مجمع میں سے کسی نے دریافت کیا۔

''دق کی مریض تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر علاج ہو جائے تو ٹھیک ہو سکتی ہے مگر علاج...... ہائے میری خوشبو......!'' بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔

جیلانی نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں کھڑے ہو میاں صاحب! اتنی دیر سے گاڑی کے قریب کھڑے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کیسا مجمع ہے یہ؟''

''ایک بھکارن مرگئی ہے؟'' ڈرائیور نے کہا۔

''ارے...... اوہ...... یہ تو...... یہ تو وہی ہے۔ بالکل وہی تصویر والی۔'' جیلانی نے بھکارن کے مردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دوڑتا' ہانپتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔

''صاحب...... صاحب...... وہی ہے...... وہی تصویر والی۔ مرگئی۔ فٹ پاتھ پر پڑی ہے۔ بالکل وہی ہے...... آپ دیکھیں تو سہی۔'' انور صاحب کی گھورتی ہوئی نگاہوں کو دیکھ کر وہ سنبھل گیا۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جیلانی......! تمہاری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ شاید بالکل ہی سٹھیا گئے ہو۔ مجھے تصویر چاہیے' مجھے صرف تصویر چاہیے...... تصویر والی نہیں...... کیا میں اس کی لاش کو لٹکاؤں گا آرٹ گیلری میں......؟ چلو ڈرائیور......! آگے بڑھو!''

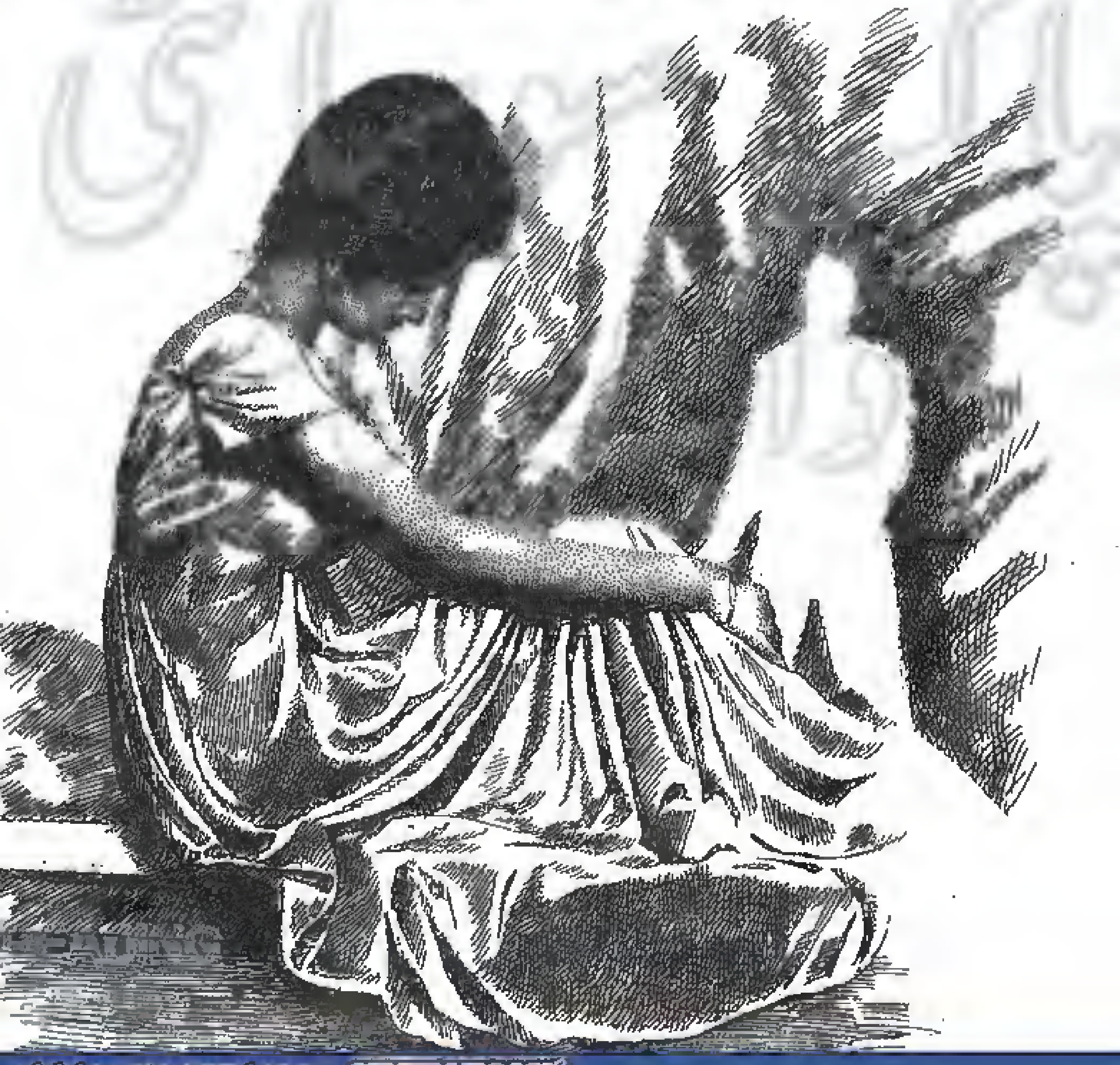
☆☆☆

آٹھویں سچ بیانی

انجانے میں

فرزانہ نگہت

اس شخص کا قصہ فتنہ خیز جو اپنی صنف بہتر پر شک کرتا تھا مگر جب وقت نے اُسے چونکا دیا تو......



وہ سنہرے ریلنگ کا سہارا لیے آہستہ آہستہ بڑے پر وقار اور مسحور کن انداز میں مرمریں زینے اترتی ہوئی محل کی چھت سے۔ نیچے وسیع ٹیرس کی طرف آرہی تھی۔ گہرے سبز رنگ کی بیش قیمت اور خوب صورت ساڑی میں اس کا قیامت خیز سراپا ہزار فتنے جگا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں لمبے لمبے آویزے جگمگا رہے تھے۔ مرمریں حسین لمبی گردن میں ہیرے جڑا نیکلس گویا اپنی ہی خوب صورتی میں اضافہ کررہا تھا۔ گھنے سیاہ حسین بال بڑی دلکشی سے سنورے ہوئے تھے۔ حسین چہرے پر بغیر میک اپ کے بے پناہ نکھار اور تابانی تھی۔

سائلنسر لگے پستول کے دستے پر نواب ذوالفقار کا ہاتھ کپکپا گیا۔ انھوں نے تیزی سے سانس بھری۔ ان کے رگ و پے میں عجیب سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھی کہ عجیلہ پر پستول تانتے ہوئے ان کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ بلکہ جب کبھی بھی انھوں نے اسے یوں گولی کے نشانے پر لیا تھا ان کی یہی حالت ہو جایا کرتی تھی۔

اپنی ناکامی پر انھیں شدید جھنجلاہٹ ہوا کرتی تھی۔ غصہ بھی آتا تھا۔ جانے کیا بات تھی جو وہ اسے دیکھتے ہی اپنے آپ کو کمزور پڑتے ہوئے محسوس کرنے لگتے تھے۔ اور ہر بار اس پر گولی چلاتے چلاتے رہ جاتے تھے۔ حالانکہ وہ بالکل سیدھے اور آسان نشانے پر ہوتی تھی۔

شدید غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ عجیلہ زینے اتر کے نیچے ٹیرس سے گزر کر اندر جا چکی تھی۔ ان کا ارادہ اسے اس طرح گولی مارنے کا نہیں تھا کہ وہ ہلاک ہو جاتی بلکہ وہ اس پر اس طرح گولی چلانا چاہتے تھے جو اسے چھوتی ہوئی سی ہی لگتی جس سے وہ بری طرح خوف زدہ اور بدحواس ہو کر لڑکھڑاتی ہوئی سنگی زینوں پر سے گر کر ہلاک ہو جاتی۔ اس طرح یہ کبھی معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ اس پر گولی چلائی گئی تھی نہ ہی اس کی موت پر قتل کا شبہ ہوتا۔

ایسا موقع شاید ہی آتا تھا کہ عجیلہ محل کے باہر دور دور تک پھیلے ہوئے حسین مناظر فطرت، ہرے بھرے میدانوں، گلزاروں، پرشکوہ پہاڑوں اور ان میں سے نکلتے ہوئے تیز رو جھاگ اڑاتے مڑتے بل کھاتے دریا کا نظارہ کرنے محل کی چھت پر چلی جایا کرتی تھی۔ جب وہ نیچے آنے لگتی تھی تو اس پر گولی چلا کر اسے مرمریں زینوں سے گرا کر ہلاک کرنے کا یہ بڑا سنہرا موقعہ ہوتا تھا اور وہ اب تک اس موقعے سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہی چلے آرہے تھے۔ اپنی اس مسلسل ناکامی پر ان پر غصہ کے ساتھ ساتھ چڑچڑاہٹ بھی طاری رہنے لگی تھی۔

جلتے بھنتے اپنی کمزوری بلکہ بزدلی پر اپنے آپ کو نفرین کرتے۔ انھوں نے پستول کا سیفٹی کیچ اپنی جگہ جماتے ہوئے اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے جھاڑیوں اور قد آور پھولدار پودوں کے اس جھنڈ سے باہر نکل آئے۔

کھلی جگہ پر پہنچ کر انھوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنے کوٹ کو جھاڑا اور محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پھولوں بھرے سبزہ زاروں کے قطعات طے کرتے چمن کو سیراب کرنے والی چھوٹی پگڈنڈی پر بنے ہوئے پل پر جا کر رک گئے اور اس کے سبز جنگلے پر ہاتھ رکھے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگے۔

عجیلہ سے ان کی شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ان کی شادی کسی رومان یا پسند کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ اسے دونوں کے خاندانوں نے باہمی رضامندی سے طے کیا تھا۔ یعنی یہ ارینجڈ میرج تھی۔ عجیلہ ان کی والدہ کے پھوپی زاد بھائی نواب افتخار احمد خان کی بیٹی تھی۔ جسے انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں دیکھا تھا۔

نواب افتخار ویسے بھی شمالی علاقوں کی ایک ریاست کے نواب تھے اور خاندانی تقریبات میں کبھی کبھار ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیگم کا تعلق بھی شمالی علاقوں کی ایک ریاست سے تھا۔ خاندان کے لوگ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ انھیں صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ ان کے تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ اس ایک بیٹی کے حسن و جمال کا خاندان

میں خوب شہرہ تھا۔ سنا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی بلکہ نہایت خوش ذوق، خوش اخلاق اور خوش اطوار بھی تھی۔ جس کے لیے بڑے بڑے خاندانوں سے رشتے آرہے تھے۔ لیکن نواب افتخار اس کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے کسی رشتے کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔

پھر ایک خاندانی تقریب کے سلسلے میں جو نواب افتخار کے بچازاد بھائی نواب طاہر علی خان کی شادی کے سلسلے میں برپا ہوئی تھی۔ نواب افتخار سمن زار پہنچے تو ان کی بیگم کے علاوہ ان کی بیٹی نجیلہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ نواب ذوالفقار اور ان کی والدہ اور بہنیں بھی اس تقریب میں شریک تھے۔ نواب ذوالفقار کی ملاقات صرف نواب افتخار اور ان کی بیگم سے ہی ہوسکی۔ ان کی بیٹی نجیلہ تقریب کی گہما گہمی اور رونقوں میں انھیں کہیں نہ دکھائی دی۔

ان کی والدہ اور بہنوں کی البتہ اس سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات نے انھیں ایسا متاثر و مسحور کیا کہ انھوں نے فوراً ہی اسے اپنے اکلوتے بیٹے، بھائی کی بیوی بنا کر لانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ نواب ذوالفقار نے بھی ان کی مرضی پر صاد کیا۔ چنانچہ ان کی والدہ اور بہنوں نے دیر نہ کی اور فوراً ہی نواب افتخار اور ان کی بیگم سے نجیلہ کا رشتہ مانگ لیا۔

نواب افتخار اور ان کی بیگم کو بھی اپنی بیٹی کے لیے یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب و موزوں معلوم ہوا۔ یوں ان کی اکلوتی بیٹی بڑی دھوم دھام سے بیاہ کر نواب ذوالفقار کے محل ''قصر زرّیں'' میں جا اتری۔

نواب ذوالفقار نے اب تک نجیلہ کی صرف تعریفیں ہی سنی تھیں۔ اب جب اسے دیکھا تو گویا اپنا آپ بھلا بیٹھے۔ اس کے بے پناہ حسن و جمال نے گویا انھیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اس کا ایسا شیدا بنا دیا کہ وہ دل و جان سے اس کی محبت کی خوشیاں اور مسرتیں اس کے قدموں میں لاکر ڈال دیں۔ وہ بھی ان کے لیے بڑی گرمجوشی ان کی مرضی اور پسند کا احترام کرنے والی ان کے اشاروں پر چلنے والی خدمت گزار بیوی ثابت ہوئی۔

ان کی زندگی راحتوں مسرتوں سے بھرپور نمونہ جنت بن گئی۔ پھر اس جنت کو ایک ننھے منے خوب صورت پھول نے اور بھی حسین بنا دیا۔ ننھا سلمان، جو اب آٹھ ماہ کا ہو چکا تھا۔ جو اپنی دادی کی آنکھوں کا نور، پھوپیوں کا بے حد لاڈلا پیارا تھا اور نواب ذوالفقار اور نجیلہ کے دل کا سرور تھا۔

ان کی زندگی شاید اسی طرح راحتوں اور مسرتوں سے بھرپور گزرتی رہتی۔ لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے نواب ذوالفقار کے لیے زندگی کا تمام تر حسن و رعنائی غارت کر کے رکھ دی۔ اس میں غم و غصہ، شکوک و شبہات، رنج و کرب کا زہر بھر دیا۔ ان کے دل و دماغ کو مسموم کر دیا۔ ان کی روح پر ایک بھاری بوجھ سا لا ڈالا۔

ہوا یہ تھا کہ اس شام وہ اور نجیلہ محل کے باہر چمن کی سیر کر رہے تھے۔ ان کے درمیان ہلکی پھلکی پُرلطف و پُرمزاح باتیں ہو رہی تھیں۔ یونہی ٹہلتے، باتیں کرتے وہ چمن میں واقع وسیع و عریض تالاب میں بنی بارہ دری میں جاکر مرمریں نشست پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک بے حد حسین شام تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ان کے درمیان شادی سے پہلے کے زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔ نواب ذوالفقار نجیلہ کو کالج اور یونیورسٹی میں اپنے ساتھ پیش آنے والے رومانی حادثات کے بارے میں بتانے لگے۔ کہ کتنی ہی حسین اور طرحدار دوشیزاؤں نے انھیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کسی کی طرف مائل نہ ہوئے تھے اور یہ معاملات دل یک طرفہ ہی رہے تھے۔

انھوں نے بعض دوشیزاؤں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا تھا اور ان کی یک طرفہ محبت پر اظہار تاسف بھی کیا تھا۔ پھر انھوں نے نجیلہ سے پوچھا تھا کہ آیا اس کے ساتھ بھی ایسا کوئی رومانی حادثہ پیش آیا تھا تو اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر بڑے پُرسکون انداز میں۔۔۔ مگر تاثر سے بھرپور لہجے میں صرف اتنا ہی کہا تھا۔ ''گزر چکی ہے فصلِ بہار ہم پر سے بھی۔'' اس پر وہ بُری طرح چونکے تھے۔ انھوں نے تیز نظروں سے اسے گھورا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر ایسے

تاثرات پھیلے ہوئے تھے گویا اس نے کوئی عام سی بات کہی ہو۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر جو خفیف سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی وہ خاصی معنی خیز دکھائی دے رہی تھی۔

ان کا دل ایک دم ہی شکوک وشبہات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ ان کے ذہن میں بدگمانیوں اور بدخیالیوں کے ناگ سرسرانے لگے تھے۔ عجیب بے چینی اور اضطراب سا انھیں شدید کرب واذیت میں مبتلا کیے دینے لگا تھا۔ ان سے شادی سے پہلے کوئی مرد نجیلہ کی زندگی میں آچکا تھا۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا رہ چکے تھے۔

ان کے درمیان بے تکلفی بھی ہوگی اور باہمی عہدوپیمان بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن پھر نجیلہ کی شادی ان کے ساتھ ہوگئی تھی اس کا واضح مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے کہنے پر ہی ان کے ساتھ شادی پر تیار ہوئی تھی ورنہ اس کے دل میں تو اس اپنے محبوب کی محبت بسی ہوئی تھی۔

انھیں اب نجیلہ کی محبت، اس کی چاہت، اس کا لگاؤ سب منافقت اور ریاکاری معلوم ہونے لگے تھے۔ ان کے اندر ایک الاؤ سا پک رہا ہوتا تھا۔ شاید غیظ وغضب، نفرت واذیت اور شدید حسد ورقابت کے جذبات کے کھولاؤ سے۔ وہ اب نجیلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ جس کے لیے اب ان کے دل میں کوئی محبت وچاہت یا لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔

جو بظاہر ان کی محبت کا دم بھرتے ہوئے اپنے دل میں ایک دوسرے آدمی کے خیال وتصور کو بسائے بیٹھی تھی۔ درحقیقت اس کی محبت وچاہت کا دم بھرتی چلی آرہی تھی اور انھوں نے پہلے سوچا تھا کہ اسے طلاق دے دیں۔ اس سے نجات پالیں، لیکن وہ کسی کے سامنے اس طلاق کی کوئی معقول وجہ نہ پیش کرسکتے تھے۔ انھوں نے کئی ترکیبیں سوچ ڈالی تھیں۔ پھر بالآخر فیصلہ کیا تھا کہ انھیں نجیلہ کا قصہ تمام کردینا چاہیے۔ اس سے نجات کی یہی محفوظ ترین اور مناسب ترین راہ تھی۔ اس طرح کے اس کے قتل کیے جانے کا شائبہ نہ ہوسکے اور اس کی موت سراسر حادثاتی معلوم ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ نجیلہ کو شام کے وقت محل کے گردوپیش پھیلے ہوئے حسین مناظر فطرت کا نظارہ کرنا بے حد پسند تھا۔

اس کے لیے وہ اکثر محل کی چھت پر چلی جایا کرتی تھی اور کافی دیر بعد نیچے آیا کرتی تھی۔ چھت پر جانے کے لیے دوسری منزل پر وسیع وعریض ٹیرس پر طویل مرمریں زینے بنے ہوئے تھے جو محل کے سامنے کے رخ پر تھے۔ ان زینوں سے کوئی بھی گرکر ہلاک ہوسکتا تھا۔ ان زینوں پر دور نیچے چمن سے نظر رکھی جاسکتی تھی۔ انھوں نے خوب اچھی طرح سے ان مقامات کا جائزہ لیا اور مطمئن ہوکر موقعہ کا انتظار کرنے لگے جو انھیں جلد ہی مل گیا۔

اس شام جب نجیلہ مناظر فطرت کا نظارہ کرنے اوپر محل کی چھت پر گئی تو وہ سائیلنسر لگا ہوا پستول لے کر محل کے سامنے چمن میں گھنی جھاڑیوں اور قدآدم پودوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس جگہ سے سامنے محل کی دوسری منزل کی ٹیرس پر ان طویل مرمریں زینوں کا نظارہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پستول ہاتھ میں لیے نجیلہ کے نیچے اترنے کا انتظار کرنے لگے۔

پھر جب کافی دیر بعد وہ زینوں پر نمودار ہوئی اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی تو انھوں نے پستول سے اس کا نشانہ لیا۔ مگر جانے کیا ہوا کہ ان کی انگلی ٹریگر پر نہ دب سکی۔ پستول کے دستے پر ان کے ہاتھ کی گرفت بھی کمزور پڑگئی۔

انھیں اس پر بے حد جھنجھلاہٹ ہوئی۔ حیرت بھی ہوئی۔ غصہ بھی آیا۔ نجیلہ بڑا آسان ٹارگٹ تھی۔ بس ایک بے آواز گولی اسے بدحواس اور خوف زدہ کردیتی جس پر وہ لڑکھڑا کر زینوں سے نیچے گرکر اپنی گردن تڑوالیتی۔ یوں ان کا کام ہوجاتا۔ اپنی ناکامی پر جلتے بھنتے، غصہ کھاتے، شدید جھنجھلاہٹ اور مایوسی کے عالم میں وہ دوسرے موقعے کا انتظار کرنے لگے۔ جس کے لیے انھیں خاصا انتظار کرنا پڑا۔

کیونکہ انہی دنوں نجیلہ کے دو بڑے بھائی اپنی بیویوں، بچوں کے ساتھ سمن زار آن پہنچے تھے اور ان

کی دعوتوں اور تفریحات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پھر جب وہ لوگ سمن زار سے رخصت ہو گئے تب بھی نجیلہ کافی دنوں تک چھت پر نہ آئی۔ پھر جب بالآخر اس کا موقع آیا تو ایک بار پھر ان کے ہاتھ نے اس پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔

اپنی اس ناکامی پر انھیں ایسا شدید غصہ آیا تھا کہ انھوں نے اپنے بال نوچ ڈالے تھے اور کتنی ہی دیر تک جلتے بھنتے رہے تھے۔ اس رات انھوں نے بمشکل ہی اپنے قریب گہری نیند میں مدہوش نجیلہ کا گلا دبانے سے اپنے آپ کو باز رکھا تھا اور دیر تک جاگتے اور مسلسل سگار پیتے ہوئے اپنی کیفیات اعتدال پر لانے کی کوششیں کرتے رہے تھے۔

اس کے بعد بھی ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ جب کبھی انھوں نے نجیلہ پر گولی چلانے کی کوشش کی تھی ان کی انگلی نے ٹریگر پر دباؤ ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ پستول کے دستے پر ان کے ہاتھ گرفت کمزور ہو جاتی تھی۔ اپنی ہر بار کی ناکامی ان پر بری طرح سے اثر انداز ہونے لگی تھی۔

ان کی صحت متاثر ہونے لگی تھی۔ مزاج میں گرمی اور چڑچڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ باوجود انتہائی کوشش اور ضبط کے وہ اکثر نجیلہ کے ساتھ ترش کلامی کر بیٹھتے تھے۔ اس سے سرد مہری برتنے لگتے تھے۔ اسے ڈانٹ اور جھڑک بھی دیتے تھے۔ وہ ان کے اس رویے پر حیران و پریشان انھیں خوش رکھنے اور ان کا ہر ممکن خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

لیکن وہ اس کی جانب سے بدستور کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ نجیلہ نے جب کبھی ان سے ان کے اس بدلے ہوئے رویے کی وجہ جاننا چاہی تھی انھوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔ انھیں بعض اوقات اپنی زیادتی کا احساس ہوتا تھا اور یہ خیال گزرتا تھا کہ شاید وہ اس کے بارے میں غلط فہمی اور بے جا شکوک و شبہات کا شکار تھے۔ لیکن اس کے کہے الفاظ ''گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر سے بھی'' ان کی یادداشت میں محفوظ ہو چکے تھے۔

وہ انھیں نہ جھٹلا سکتے تھے۔ اپنی ہی آگ میں جلتے بھنتے، مسلسل بے چینی و اضطراب میں مبتلا وہ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ جن میں کہیں بھی روشنی کی کرن نہ دکھائی دے رہی تھی۔

انھوں نے سر جھٹکا اور گہری سانس لیتے ہوئے پل پر سے گزر کر محل کے اندر کی سمت ہو لیے۔ وسیع و عریض لاؤنج تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ نجیلہ فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھی۔ قریب ہی صوفے پر ان کی والدہ صفیہ خانم پوتے کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے چائے کی ٹرالی پڑی تھی۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔

''کہاں چلے گئے تھے زلفی۔ تمہارے انتظار میں چائے ٹھنڈی ہوتی رہی۔'' صفیہ خانم بولیں۔

''چمن میں۔ وہاں گلاب کی نئی قسمیں لا کر لگائی گئی ہیں انھیں دیکھنے چلا گیا تھا'' انھوں نے اپنے کپ میں چائے بناتے ہوئے بہانہ بنا دیا۔ اسی وقت نجیلہ فون سے فارغ ہو کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''عذرا کا فون تھا۔ اس کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ چل سکیں گے زلفی؟'' عذرا اس کی بچپن کی عزیز سہیلی تھی۔

''نہیں۔ میں تو فی الحال کہیں نہیں جا سکتا۔'' نواب ذوالفقار سنجیدگی سے بولے۔ ''تمھیں معلوم ہے آج کل ماہرینِ ارضیات کا وفد یہاں پہنچا ہوا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ مصروف رہنا پڑتا ہے۔ تم خود چلی جاؤ میری طرف سے معذرت کر دینا۔''

''ہاں اپنے ساتھ کچھ کنیزیں اور محافظ بھی لے جاؤ دور کا سفر ہے۔'' صفیہ خانم بولیں۔ ''ویسے تم وہاں کتنے دن ٹھہرو گی بیٹی؟''

''ہفتہ بھر تو لگ جائے گا'' نجیلہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''لیکن کوشش کروں گی کہ جلد واپس آ جاؤں۔ آپ ننھے سے اداس ہو جائیں گی نا؟''

صفیہ خانم مسکرائیں۔ انھوں نے جھک کر گول مٹول خوب صورت بچے کو پیار کیا۔

''ہاں یہ تو مجھے بے حد یاد آئے گا۔ لیکن ابھی یہ اتنا بڑا نہیں ہوا کہ مجھے یاد رکھ سکے۔ ہاں تم کب تک

جا رہی ہو؟''

''کل..... عذرا نے جلد پہنچنے کی تاکید کی ہے۔''

''اچھا تم تیاریاں کرلو۔ میں تمہارے سفر کا انتظام کیے دیتا ہوں۔'' نواب ذوالفقار بولے اور خالی کپ ٹرالی میں رکھ کے صوفے سے اٹھ گئے۔

☆☆☆

اس رات وہ اپنے کمرے کے باہر دیر تک لابی میں ٹہلتے رہے۔ مسلسل سگار نوشی کرتے رہے۔ عمیق سوچوں کے گرداب میں چکراتے رہے۔ عجیلہ سے نجات پانے کا یہ اچھا موقع تھا۔ وہ اپنی ریاست جا رہی تھی۔

نبیلی کے بھائی کی شادی کے بعد اس نے اپنے گھر ماں باپ اور بھائیوں سے ملنے تو ضرور جانا تھا۔ اسے وہاں طلاق نامہ بھجوایا جاسکتا تھا۔ اس طرح وہ سمن زار واپس نہ آسکتی تھی۔ اپنے سسرال والوں کے سامنے ان کے پاس اس کی بے وفائی اور فریب کاری کا معقول جواز تھا۔

وہ اس بارے میں اپنی والدہ کو بھی مطمئن کر سکتے تھے۔ جو عجیلہ کو حقیقی بیٹی کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ ننھے کی جدائی انھیں ضرور شاق گزرتی لیکن پھر صبر آ ہی جاتا۔ صبح ہونے تک وہ اسی ارادے، اسی فیصلے کے تانے بانے بنتے رہے۔

اگلی صبح عجیلہ ننھے سلمان کے ساتھ اپنی ریاست پرواز کرگئی۔ اس کے بعد کے چند دن نواب ذوالفقار کے اتنے مصروف گزرے کہ وہ طلاق نامہ تیار نہ کر سکے۔ ایک کے بعد ایک ملکی و غیر ملکی مختلف امور کے ماہرین کے وفود آتے رہے اور وہ ان کے ساتھ دن رات مصروف رہنے رہے۔ پھر جب بالآخر انھیں فرصت میسر آئی تو عجیلہ کے واپس آنے میں تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ اب انھیں جو کچھ کرنا تھا جلد ہی کرنا تھا۔

اس رات کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے کچھ وقت اپنی والدہ کے ساتھ گزارا پھر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے سگار دان سے ایک سگار نکالا اور اس کے گہرے کش لیتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹک کر اپنے ذہن میں طلاق کا مضمون تیار کرنے لگے۔

ان کی نظریں سامنے وارڈ روب پر جمی تھیں۔ اس وارڈ روب میں عجیلہ کے ملبوسات سجے تھے۔ اس میں ایک طرف اوپر تلے کئی کیبنٹ تھے۔ جن میں زیورات اور دیگر بیش بہا اشیاء محفوظ تھیں۔

عجیلہ ہر چیز اور اعلیٰ اور نفیس ذوق رکھتی تھی۔ خواہ وہ جوتے کپڑے ہوتے، زیورات، میک اپ کے لوازمات ہوتے یا آرائشی اشیاء۔ ڈریسنگ روم کی وارڈ روب کے خیال سے ایک دم ہی ان کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ وہ چونکے اور صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گیا۔

اس وارڈ روب کی ہر کیبنٹ پر، ہر دراز ان کا دیکھا بھالا تھا۔ ان میں بھی عجیلہ نے زیورات اور بہت کچھ رکھا ہوا تھا۔ لیکن ایک کیبنٹ ایسا تھا جو بند ہی چلا آرہا تھا۔ انھوں نے جب کبھی عجیلہ سے اسے کھولنے پر اصرار کیا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال گئی تھی۔

ان کے رگ و پے میں ایک دم ہی ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے سگار کے کش لیتے ہوئے صوفے پر سے اٹھ گئے۔ عجیب حیرت کی بات تھی کہ انھیں عجیلہ کی طرف سے مشکوک اور بدگمان ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا تھا اور انھیں ایک بار بھی اس ہمیشہ بند رہنے والے کیبنٹ کا خیال نہ آیا تھا۔ اس میں کیا ہوسکتا تھا؟ اس کے محبوب کے خطوط؟ تصاویر؟ خفیہ ڈائری؟ یا خطرناک قسم کے کاغذات؟

بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ انھوں نے سگار، ایش ٹرے میں کچلا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ انھوں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر روشنیاں جلادیں۔ کمرے کی فضا مختلف خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ ہوا رکی ہوئی اور فضا کچھ گرم ہو رہی تھی۔ وہ وارڈ روبز کی قطاروں کے سامنے سے گزرتے ہوئی عجیلہ کے اس مخصوص وارڈ روب کے سامنے جا کر رک گئے۔

انھوں نے مخصوص خفیہ مقام سے اس کی چابیاں

نکالیں اور اس کے پٹ کھول دیے۔ ہینگروں پر ٹنگے بیش بہا نفیس ملبوسات کو قطاروں کے ایک طرف اوپر تانیچے کئی کیبنٹز کی قطاریں تھیں، جو سب مقفل تھے۔ ان میں وہ کیبنٹ بھی تھا جسے کھولنے سے نجیلہ ہمیشہ کترائی رہی تھی۔

انھوں نے وارڈ روب کے خفیہ خانے سے ان کیبنٹوں کی چابیاں نکالیں اور انھیں اس مخصوص کیبنٹ نے ایک بار پھر بار پھر ان تمام چابیوں کو اس لاک پر آزماڈالا مگر نتیجہ وہی رہا۔ ہونا بھی یہی تھا کہ نجیلہ اپنی ماضی کی ان خطرناک یادگاروں کو ایسی کڑی حفاظت میں رکھتی۔

ان کے رگ وپے میں شدید غیظ وغضب کی لہریں موجزن ہوگئیں۔ انھوں نے چابیاں ایک طرف پھینکیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ سنگھار میز پر ایک نیل کٹر پڑا تھا۔ انھوں نے اسے اٹھالیا اور اس کا چاقو کھول کر اسے اس کیبنٹ کے کی ہول میں داخل کرتے ہوئے اسے پوری قوت سے گھمایا۔ کھٹکا ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی چاقو بھی ٹوٹ گیا۔ انھوں نے نیل کٹر ایک طرف پھینکا اور کیبنٹ کھول دیا۔

ان کے شکوک وشبہات بے بنیاد نہیں تھے۔ اندر واقعی کئی ڈائریاں اور کاغذات کے فیتے لگے پلندے ترتیب سے رکھے تھے۔ شدید غیظ وغضب سے کپکپاتے، شکوک وشبہات کے گرداب میں چکراتے، انتہائی تجسس، واشتیاق سے انھوں نے پہلے ڈائریاں دیکھنی شروع کیں۔ یہ ڈائریاں زیادہ تر غزلوں اور نظموں سے بھری ہوئی تھیں یا پھر ان میں مختلف نام اور پتے جو نجیلہ کی سہیلیوں کے ہی درج تھے۔

وہ ان کی ورق گردانی کرکر کے انھیں فرش پر پھینکتے رہے۔ پھر انھوں نے کاغذات کے پلندے دیکھنے شروع کیے۔ چند پلندے نجیلہ کے زمانۂ طالب علمی میں مختلف رسائل اور اخبارات کو لکھے ہوئے افسانوں اور مضامین کی تراشوں کے تھے۔ وہ ان سب کو توجہ سے دیکھتے رہے۔ لیکن ان میں انھیں اپنے کام کی کوئی چیز نہ مل سکی۔

انھوں نے جھنجھلا کر انھیں ادھر ادھر پھینکنا شروع کردیا۔ اب کیبنٹ میں کاغذات کا ایک ہی پلندہ باقی رہ گیا تھا۔ جس پر اخباری کاغذ لپٹا ہوا تھا اور وہ سُتلی سے بندھا ہوا تھا۔ شاید یہی ان کے کام کی چیز ہوسکتی تھی۔

انھوں نے سُتلی کو کھولا اور اخباری کاغذ ہٹادیا۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تنفس کی رفتار تیز اور ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اخباری کاغذ کے ہٹتے ہی نیلے گلابی اور سفید رنگوں کے لیٹر پیڈز پر لکھے ہوئے خطوط ان کے سامنے تھے۔ شاید یہی اصل چیز تھی۔

انھوں نے ایک ایک کر کے انھیں پڑھنا شروع کیا۔ یہ نجیلہ کی سہیلیوں کے اسے شادی سے پہلے لکھے ہوئے خطوط تھے۔ زیادہ تر خطوط میں اِدھر اُدھر کی باتیں اور پرلطف واقعات ہی لکھے ہوئے تھے۔ انھیں کچھ مایوسی ہونے لگی۔ جس چیز کی انھیں تلاش تھی وہ اب تک نہ مل پا رہی تھی۔ لیکن پھر ایک خط کے مندرجات پر نظریں دوڑاتے دوڑاتے وہ بری طرح سے چونکے اور پوری توجہ سے ان سطروں کو پڑھنے لگے۔

''تو تم نے اپنے خوابوں کا شہزادے کو دیکھ ہی لیا، افسوس کی بات ہے جو تم اس کی نظروں میں نہ آسکیں ورنہ اس کا حال بھی تم سے مختلف نہ ہوتا۔ اب تو تم اپنے خاندان میں برپا ہونے والی ہر تقریب میں شرکت کیا کرو، ہوسکتا ہے کہ کبھی اس کی نظر تم پر پڑ جائے۔''

انھیں اپنے رگ وپے میں شرارت سے کوندتے محسوس ہونے لگے۔ ذہن میں آندھیاں سی مچلنے لگیں۔ خوابوں کا شہزادہ! اب انھیں معلوم ہوا تھا کہ نجیلہ اس کیبنٹ کو اس طرح بند کیوں رکھتی تھی، باوجود ان کے اصرار کے اس کھولنے پر آمادہ کیوں نہ ہوتی تھی۔

اس لیے کہ اس میں اس کا یہ خطرناک راز محفوظ تھا۔ انھوں نے شدید غیظ وغضب سے پھینکتے کپکپاتے ہاتھوں اور تیز سانسوں کے ساتھ دوسرا خط کھولا جو

عجیلہ کی خاص سہیلی عذرا کا تھا۔ اس میں کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد لکھا تھا۔

''ہاں سناؤ پیاری کیا اپنے خوابوں کے شہزادے سے ملاقات نہیں ہوئی؟ مختلف النوع تقریبات تو تمہارے خاندان میں بکثرت برپا ہوا کرتی ہیں۔ ان میں بھی شریک ہوتا ہوگا۔

تم ایسے ہی کسی موقع پر اس کے سامنے آ جاؤ تو یہ ناممکن ہی ہوگا کہ تمہیں دیکھتے ہی وہ تمہارے حصول کے لیے بے تاب و بے قرار نہ ہونے لگے۔ ہم سب بڑی شدت سے اس گھڑی کے منتظر ہیں۔ تم رابطہ قائم رکھنا۔''

شدید حسد و رقابت کی آگ میں جلتے بھنتے، غیظ وغضب کی تیز وتند لہروں سے تھرتھراتے انھوں نے اگلا پتا شدہ خط کھولا۔ اور اس کے مندرجات پر نظریں دوڑانے لگے۔ یہ خط بھی عذرا کا تھا۔ اس میں کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد لکھا تھا۔

''میں گزشتہ ہفتے عقیلہ کے بھائی کی شادی پر سمن زار گئی تھی۔ بڑی دھوم دھام شادی تھی جس میں عقیلہ کے رشتہ داروں کے علاوہ عمائدین شہر کی بھاری تعداد بھی مدعو تھی۔

انہی میں تمہارے خوابوں کے شہزادے نواب ذوالفقار علی خان (اب تو ان کا نام لکھنے میں حرج نہیں۔ آخر تمہاری ان سے منگنی جو ہو چکی ہے) بھی آئے ہوئے تھے۔ مجھے انھیں خوب اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ واقعی اسی قابل ہیں کہ تمہارے خوابوں کے شہزادہ کہلا سکیں۔ اب تو......'' آگے نواب ذوالفقار سے کچھ پڑھا نہ جا سکا۔ ان کا وجود ایک دم ہی شدید زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔ انھیں دھچکے پر دھچکے لگ رہے تھے۔ تو یہ تھی عجیلہ کے اس معنی خیز جملے کی حقیقت! جس کا اس نے ان کے سامنے کھل کر اعتراف نہ کیا تھا۔ اپنی زندگی کے اس حسین راز کو یوں پوشیدہ رکھا تھا۔ ایک قیمتی خزانے کی طرح...... اک سرمایہ بے بہا کی طرح! اُف! وہ بھی کیا کرنے لگے تھے۔ بے بنیاد سے شکوک وشبہات کا شکار ہو کر وہ کیسا بھیانک اقدام کرنے لگے تھے۔ یہ عجیلہ پر کتنا بھیانک ظلم ہوتا۔ یہ ظلم شاید اس کی جان لے لیتا جوان سے ایسی سچی اور گہری محبت کرتی تھی۔ وفا کیش اور پرخلوص تھی۔ یہ انھوں نے بہت اچھا کیا تھا جو اسے طلاق دینے سے پہلے اس کیبنٹ کی تلاشی لے ڈالی تھی اور حقیقت کو پہنچ گئے تھے۔ بڑی بھیانک لغزش اور گناہ سے بچ گئے تھے۔

وہ متحیر وسراسیمہ سے کچھ نادم کچھ مسرور، کچھ غائب الذہن سے وہ خط ہاتھ میں لیے ہوئے جذباتی دھچکوں سے ہولے ہولے کپکپا رہے تھے کہ کمرے میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ دوسرے ہی لمحے عجیلہ تیزی سے ڈریسنگ روم میں داخل ہوگئی۔ زمین پر گری ڈائریوں، کاغذات اور خطوط پر نظر پڑتے ہی وہ حیران و پریشان سی اپنی جگہ پر ایک دم رک گئی۔ پھر اس کی نظریں نواب ذوالفقار پر پڑیں جو اس کی کھلی ہوئی وارڈروب کے پاس کھڑے تھے اس وارڈروب کا وہ مخصوص کیبنٹ کھلا ہوا تھا اور وہ ایک خط ہاتھ میں لیے چہرہ پر عجیب ناقابلِ فہم سے تاثرات لیے اسے دیکھ رہے تھے۔

''زلفی یہ کیا ہے؟ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ سراسیمہ سی چلائی۔ اور تیزی سے ان کے پاس چلی آئی۔

''یہ آپ نے کیا کیا ہے زلفی! آپ نے یہ کیبنٹ کیسے کھول لی؟''

''تم...... تم تو جلدی آ گئیں۔ عجیلہ۔'' ان کے سوکھے حلق سے بمشکل ہی آواز نکل سکی۔

''ہاں مجھے آپ کا خیال تھا۔ اس لیے شادی کے ہنگامے ختم ہونے کے بعد میں وہاں رکی نہیں اور فوراً ہی واپس چلی آئی۔ لیکن یہ سب کچھ کیا ہے؟ آپ کی یہ کیا حالت ہو رہی ہے۔'' اس نے مضطربانہ استفہام کیا۔

انھوں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

''بتاتا ہوں عجیلہ...... میری عجیلہ...... میری محبت...... دراصل میں بہت دور ایک تاریک وادی میں جا نکلا تھا۔ اب میں اس میں سے باہر نکل آیا ہوں...... روشنیوں میں...... جگمگاتی روشنیوں میں۔''

☆☆☆

نویں سچ بیانی

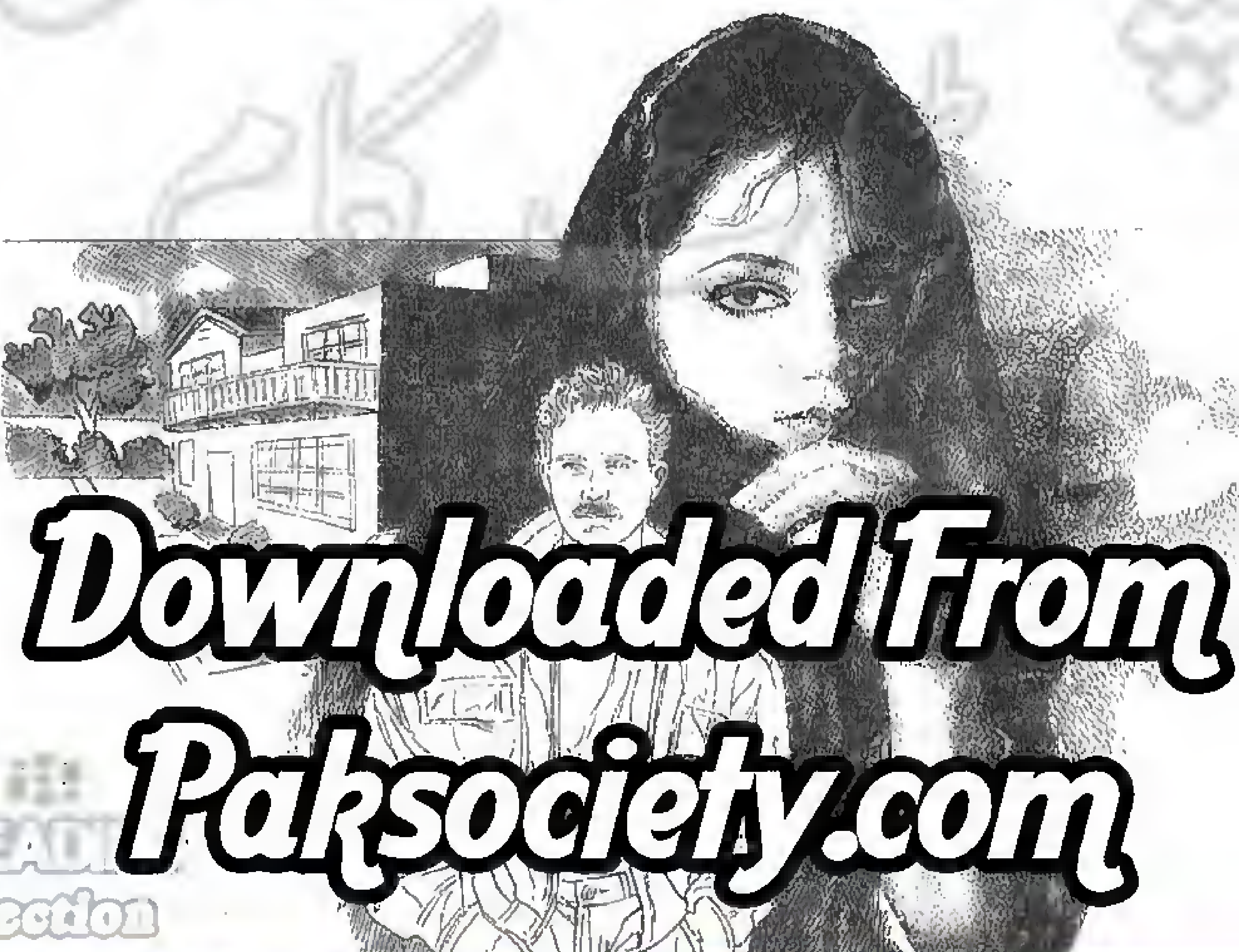
خانہ برباد عشق



مہر پرویز احمد دولو

اُس آستین کے سانپ کی کہانی' جس نے محبت اور بھروسے کی دھجیاں بکھیر دیں

اظہر اور باقر قریبی رشتے دار تھے۔ گھر ساتھ ساتھ تھے۔ بچپن اکٹھا گزرا، اور خوب گزرا۔ اسکول جانے کی عمر کو پہنچے تو بھی ساتھ رہا۔ گاؤں کے اسکول میں بنیادی تعلیم حاصل کی۔ اکٹھے ماہ وسال کی مسافت طے کرنے لگے۔ میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایک ہی کالج میں داخل ہوئے۔ گریجویشن کرنے کے بعد وقت نے جدا جدا منازل کا تعین کر دیا۔ یوں اب ان کی دوستی کی دیوار میں جدائی کی ہلکی سی دراڑ پڑ گئی۔



اظہر کو شروع سے ہی پڑھنے اور پڑھانے کا شوق تھا۔ جبکہ باقر کو پولیس آفیسر بننے کا شوق تھا۔ اظہر کو منزل اس وقت ملی جب وہ کورس مکمل کرنے کے بعد اسکول میں ٹیچر بھرتی ہوگیا۔ جبکہ باقر بھی پولیس میں بھرتی ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ قریبی شہر کے تھانے میں اس کی تقرری ہوئی۔

اگرچہ زندگی کی دوڑ میں الگ الگ منازل کے راہی تھے۔ مگر جدائی اپنی بھرپور کوشش کے باوجود ان کو ایک دوسرے سے دور لے جانے میں ناکام رہی۔ اظہر گاؤں کے اسکول میں ٹیچر تھا۔ جبکہ باقر بھی اکثر شام کو گھر آجاتا، رات کو اکٹھے ہوتے۔ ڈیوٹی کے کارنامے ایک دوسرے کو سناتے۔ ترقی کی منازل پر محوِ سفر رہنے کے منصوبے بنائے جاتے۔ آگے بڑھنے کے طریقوں پر غور کیا جاتا۔ نام پیدا کرنے کے لیے تدابیر پر غور کیا جاتا۔

برسرِ روزگار تھے، اب تحفوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ رشتے داری اور دوستی کی دیوار بلند سے بلند تر ہونے لگی۔ باہمی صلاح مشورے سے بہت سے امور سرانجام دیے جانے لگے۔

رنجش، غلط فہمی حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ اعتماد کے مضبوط جھولے میں جھول رہے تھے۔ دل شفاف آئینوں کی طرح چمک رہے تھے۔ محبتوں کے پھول چن چن کر خود خوشبوؤں کا گلستان بن چکے تھے۔ وقت کی گرمی سردی سے دور خوشیوں کے جہاں میں آباد تھے۔

باقر کے تایا کی تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹے کی نعمت سے محروم تھا۔ باقر کو اس نے بیٹا بنا رکھا تھا۔ اور آج تک اس کی ہر جائز ناجائز خواہش کو فرض سمجھ کر پورا کیا تھا۔ اس کی خوشی میں خوش رہتا تھا۔ پھر اس نے باقر کو داماد بنانے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ پہلے بھی دور نہ تھے۔ مگر داماد کے بندھن میں باندھنے کے بعد وہ اس کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ باقر بھی اس کی محبتوں کا اسیر تھا۔ وہ کب انکار کرتا۔ اس نے سعادت مند بیٹوں کی طرح اس فیصلے پر اپنا سرخم کیا۔

باقر کی فرماں برداری پر تایا ایک بیٹی کے بوجھ سے آزاد ہوا۔ جلد ہی برادری کو اکٹھا کیا گیا اور مختصر خوب صورت تقریب میں باقر اور زویا کو منگنی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔

تایا نے باقر کے سامنے دو بیٹیوں کا مسئلہ رکھا اور اسے کہا کہ اگر تمہارا دوست اظہر مان جائے تو حمیرا کا رشتہ اس کو دے دیا جائے۔ تمہارا دوست حمیرا کا بہت خیال رکھے گا اور پھر وہ ہمارے سامنے ہوں گے۔ دکھ سکھ میں ہم ان کا ساتھ دیں گے۔"

یہ بات باقر کو بھی پسند آگئی۔ اور پھر ایک دن باتوں باتوں میں اس نے اظہر سے بات کردی۔ اظہر اور باقر ایک دوسرے پر جان وارتے تھے۔ اظہر بولا میں اپنے والدین سے مشورہ کر کے آپ کو بتاؤں گا۔"

اظہر کی ماں پہلے ہی اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اظہر اور باقر کی دوستی کی بھی مخالف تھی مگر بیٹے کی خوشی کی وجہ سے خاموش تھی اور پھر جب ایک دن اظہر نے بڑے لاڈ سے ماں سے حمیرا کے بارے میں بات کی اور اجازت مانگی تو وہ پھٹ پڑی۔ اظہر کو خوب صلواتیں سنائیں۔ بچپن سے جوانی تک پالنے اور تعلیم دلوانے کے طعنے دیے۔ اپنے خاوند کو بھی اس بارے میں بتایا۔ وہ بھی اظہر پر سخت برہم تھا۔

"اگر تم پر حمیرا کا عشق کا بھوت سوار ہے تو پھر تمہارا ہمارے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے اپنے خاندان میں رشتوں کی کمی ہے۔ جو ہمارے دور پار کے رشتے دار تم کو اب بڑے عزیز لگ رہے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے تم کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ شروع سے ان کی نظر تم پر اور تمہاری کمائی پر تھی۔ ہماری محبتوں اور قربانیوں کا تم نے یہی صلہ دینا تھا۔"

اظہر، باقر اور اس کے تایا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ والدین کے سامنے ڈٹ گیا۔ گھر چھوڑنے اور خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔ ماں کا دل بڑا نرم ہوتا ہے۔ وہ بیٹے کی ناراضی برداشت نہ کر سکی۔ اور اس نے ایک دفعہ پھر قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ بیٹے کی خوشی کے لیے اپنے ارمانوں کو احساس کی آگ میں جلا دیا۔ خود جل گئی۔ مگر بیٹے کی محبت کو بچا لیا۔

☆☆☆

اور پھر بڑی دھوم دھام سے اظہر اور حمیرا کی منگنی ہوگئی۔ اظہر اور باقر کی دوستی پکی ہو کر رشتے داری میں بدل گئی۔ تایا کے کاندھوں سے ایک اور بیٹی کا بوجھ اتر گیا۔

تایا کی تیسری بیٹی کا رشتہ اس کے سابقہ [illegible] اپنے

بیٹے اجمل کے لیے مانگا۔ اجمل ایک میٹرک پاس نوجوان تھا۔ اپنی زمینوں پر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اور بے ضرر نوجوان تھا۔ جب اس کا رشتہ آیا تو تایا نے اپنے سالے سے کہا کہ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اپنے دامادوں سے مشورہ کرنے دو۔ میری دو بیٹیوں کی منگنی ان سے ہو چکی ہے۔ فیصلہ کرنے سے قبل میں ان سے مشورہ لے لوں۔''

اجمل کا باپ ہر الیکشن میں اظہر کے خاندان کی مخالفت کرتا تھا۔ جس پارٹی کو وہ ووٹ دیتے وہ ان کے مخالف ووٹ دیتا۔ اس کا اثر ورسوخ کافی تھا اور خدا ترس انسان تھا۔ علاقے کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ الیکشن کے دوران وہ اپنا مفاد کم اور عام لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے سیاستدان کا انتخاب کرتا جو کافی حد تک عوامی امنگوں پر پورا اترتا تھا۔ اور پھر لوگوں کے مسائل حل کروانے میں بھی وہ خصوصی دلچسپی لیتا۔ کسی کے ساتھ ناحق زیادتی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس لیے لوگ اس کی بات سنتے تھے اور اس کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔

جبکہ اظہر کے خاندان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ سیاستدانوں سے پیسے لیتے تھے۔ میں ان کو ہزیمت اٹھانی پڑتی۔ ہر الیکشن میں ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ انھوں نے کئی دفعہ اجمل کے والد میاں جمیل کی منت سماجت بھی کی۔ اس کو اپنے حق میں کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر عوامی مقبولیت اس کے ساتھ تھی۔ اس لیے ہمیشہ کامیابی اس کے قدم چومتی لوگوں نے اس کو اپنے سر کا تاج سمجھ رکھا تھا۔ علاقے میں بڑھتی مقبولیت اظہر کے خاندان کو کانٹوں کی طرح چبھتی تھی۔ اس لیے وہ میاں جمیل کو سخت نفرت سے دیکھتے تھے اور ہر مقام پر اس کو زک پہنچانے کی کوشش کرتے۔

جب تایا نے اظہر سے اجمل کے بارے میں مشورہ مانگا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس کے رشتے کی سخت مخالفت کی۔ باقر کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا۔ اس نے بھی تایا سے بات کی اور ان کی مشاورت کے بغیر کوئی قدم اٹھانے سے منع کیا۔ اظہر اور باقر کی مخالفت کے بعد میاں جمیل کو رشتے سے صاف انکار کر دیا گیا۔

ایک ہی گھر رشتہ ہو جانے کی وجہ سے اظہر اور باقر اور بھی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اب اظہر رات کو بھی باقر کے ساتھ ہی سوجاتا۔ تعلق تھا کہ قریب سے قریب تر ہونے لگا۔

☆☆☆

اظہر کا بھائی نجیب ایک وفاقی ادارے میں ملازم تھا۔ تقرری کراچی میں تھی۔ وہ چھ ماہ، سال بعد آتا تھا۔ بیوی بچوں کو بھول جاتا۔ اس کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔ نجیب کافی دنوں بعد گھر چھٹی آتا۔ بچے گاؤں میں تھے۔ ان کو ساتھ لے کر نہیں جا سکتا تھا۔

بیوی جوان عورت تھی۔ خاوند کو سوں دور، مریم خاوند کی کمی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ اگر پانچ بیٹیوں کی ماں تھی۔ مگر جذبات کی مد و جزر کو کب تک قابو میں رکھتی۔ اگرچہ دنیا کی نعمتوں سے مالا مال تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اچھی خوراک، تازہ پھل تھا۔ بے لحاظ گالوں سے ٹپکتا تھا۔ پہلے بھی کم حسین نہ تھی۔ بے فکری نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ اتنی حسین عورت کو کمی تھی تو صرف خاوند کی۔

ایسے میں جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے اس نے اظہر میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اور پھر ایک دن اپنے دل کی ناتمام خواہشات کا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول دیا۔ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اگر پکا پھل جھولی میں گرے تو کون ناشکرا اس کو کھانے سے منہ موڑتا ہے۔

اظہر نوجوان تھا۔ خوب صورت تھا۔ وہ اس نعمت کو کیسے ٹھکراتا اور پھر سونے پہ سہاگہ کہ دونوں کے ملنے پر کسی کو اعتراض نہ تھا۔ اظہر اس گھر کا داماد۔ دن کو آتے یا رات کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

اس رعایت کا اظہر اور مریم نے خوب فائدہ اٹھایا۔ مریم نے کچھ بھی بچا کر نہ رکھا۔ سب کچھ اظہر کے حوالے کر دیا۔ اظہر نے بھی خوب حق ادا کیا۔ مریم کے تمام سلگتے ارمانوں پر اپنی چاہت کے پھول برسائے۔ اس کی خواہشات کو تکمیل بخشی۔ اس کے ارادوں اور آرزوؤں کو دوام بخشا۔

مریم نے اپنی تمام محبتوں کا رخ اظہر کی طرف موڑ دیا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر پل نہ گزارتے۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ ان کی دوستی پیار کے نقش

میں پرورش پاتی رہی۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا اظہر کو باقر کی دوستی اور منگیتر حمیرا کی محبت بھی خاروں کی طرح کھٹکنے لگی اب تو وہ ان سے دنیاداری کے لیے تعلق رکھتا۔ وگرنہ ساری محبتوں کا رخ مریم کی طرف موڑ دیا تھا۔ اب انھوں نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن سماج نے پہلے ہی ان کو مجبوریوں کے زیور پہنا رکھے تھے۔ جن کو وہ کسی صورت اتار کر آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔

مریم پانچ بچوں کی ماں تھی۔ خاوند زندہ سلامت تھا۔ جس کی وہ منکوحہ تھی جبکہ اظہر کی اسی گھر میں ایک خوب صورت پڑھی لکھی لڑکی سے منگنی طے تھی۔ دونوں مجبوریوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ اس قفس سے نکلنا بھی محال تھا اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔

اس مسئلے کا حل ایک دن مریم کے ذہن میں آ ہی گیا۔ اس نے نفرت کا ایسا جال بُنا جس نے اظہر اور حمیرا کے ہوش اڑا دیے۔ اور پھر لاکھ جتن کے باوجود دونوں کے ذہنوں کو جس شک کے ناگ نے ڈسا تھا۔ اس کا زہر ختم نہ ہو سکا۔

مریم ہر صورت اظہر کو اپنانا چاہتی تھی۔ اس نے تمام کشتیاں جلا کر سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اظہر کو حمیرا کے کردار کے بارے میں شک میں ڈالنے کے لیے بڑا عجیب ڈرامہ کھیلا۔

مریم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اظہر میاں جمیل کے بیٹے اجمل سے نفرت کرتا ہے۔ اس نے ایک بچے کو بھیج کر اجمل کو بلوایا کہ تم سے ایک ضروری کام ہے۔

اجمل پیغام سنتے ہی آ گیا۔ اس نے گھر میں ایک خالی کمرے میں بیڈ پر اس کو بٹھایا۔ خود اس کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ جبکہ حمیرا سے کہا کہ فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر اجمل کو پانی پلاؤ۔ میں اس کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔ جب تک میں چائے نہیں لاتی تم اس کے پاس بیٹھو۔''

اس دوران اظہر کو موبائل پر فون کر دیا۔ ''تمہاری محبوب منگیتر تمہارے مخالف کے ساتھ تنہا کمرے میں رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ اگر میری بات پر یقین نہیں تو اپنی آنکھوں سے آ کر دیکھ لو۔''

اظہر سخت غصے میں فوراً ادھر پہنچا۔ مریم نے کچن سے اسی متعلقہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اظہر جب کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حمیرا اور اجمل ایک ہی بیڈ پر بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں اور باتوں میں اتنے مشغول ہیں کہ اظہر کے آنے کا ان کو پتا ہی نہ چلا۔ اندر کمرے میں داخل ہوتے ہی اظہر نے حمیرا کی چٹیا پکڑی اور اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اجمل اس ناگہانی صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ وہ ان کے درمیان مداخلت بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ دونوں آپس میں منگیتر تھے۔ وہ اس اچانک صورت حال سے گھبرا گیا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر اجمل سخت پریشان تھا۔ اس کو تو ضروری کام کے سلسلے میں بلایا گیا تھا، اور جس عورت نے اس کو بلا کر اس بیڈ پر بٹھایا تھا، جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

اگر حمیرا پانی پلا کر ساتھ بیٹھ گئی تو ایسی کون سی قیامت آ گئی تھی۔ آخر وہ بھی آپس میں رشتے دار تھے۔ پھر دن کا وقت تھا، گھر میں چہل پہل تھی۔ بچوں نے اودھم مچا کر گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ باہر چولہے پر کھانا تیار ہو رہا تھا۔ گھر کا بزرگ سامنے صحن میں نیم کے پیڑ کے نیچے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

ایسا کون سا غیرت کو للکارنے والا فعل سرزد ہو گیا تھا کہ اظہر کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا اور بغیر کسی وجہ اور تصدیق کے اس نے حمیرا کو مارنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

مریم نے شام تک پورے گاؤں میں بات کا بتنگڑ بنا کر ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ اجمل اور حمیرا کمرے میں قابل اعتراض حالت میں پڑے تھے۔ اظہر نے خود کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی اور اس کی غیرت نے برداشت نہ کیا۔ اس نے حمیرا کو بے تحاشا مارا ہے۔ پتا نہیں حمیرا کے اجمل کے ساتھ کتنے دیرینہ تعلقات ہیں۔

اظہر کے گھر والے تو پہلے ہی اس رشتے کے مخالف تھے۔ اب جب انھوں نے یہ واویلا سنا، وہ تو اظہر پر خوب برسے۔ اس کی خوب بے عزتی کی۔ حمیرا کو فاحشہ قرار دیا۔ کتنے ہی لوگوں کے ساتھ اس کا معاشقہ جوڑ دیا۔ اظہر کو اسی حالت منگنی توڑنے کا حکم دیا۔

اظہر کی آنکھوں سے دوستی کا بھوت اتر کر مریم کے

عشق کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ اب حمیرا اس کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ تو مریم کا دیوانہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی حمیرا سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اتنا قیمتی ہاتھ آیا موقع وہ کیسے ضائع کرتا۔ والدین سے سابقہ غلطی کی معافی مانگی۔ حمیرا سے منگنی توڑ کر والدین پر احسان کیا۔ ساتھ ہی مریم کو اپنانے کا راستہ بھی ہموار ہو گیا۔

حمیرا کی تھوڑی سی غلطی نے اظہر کے کتنے ہی مسئلے حل کر دیے تھی۔ اظہر نے باقر کو بھی بہت بُرا بھلا کہا۔ اور سازشی قرار دیا اور کہا۔ ''تم نے جان بوجھ کر میری منگنی حمیرا سے کروائی تھی۔ جبکہ تم کو پتا تھا کہ حمیرا اجمل کو چاہتی ہے اور اسی سے شادی کی خواہش مند ہے۔''

یوں اظہر اور باقر کے درمیان دوستی کا رشتہ کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ گیا۔ دراصل یہ دوستی اظہر خود ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر دوستی قائم رکھتا تو پھر مریم کو نہیں اپنا سکتا تھا۔

☆☆☆

حمیرا کی اظہر سے منگنی کیا ٹوٹی، اس کے تو بھاگ جاگ اٹھے۔ اس کے چچا زاد بھائی کے بطور نائب تحصیلدار آرڈر ہوئے تھے۔ جوں ہی منگنی ٹوٹی چچا نے اپنے تحصیلدار بیٹے کے لیے حمیرا کا رشتہ مانگ لیا۔ تایا نے بھی فوراً ہاں کر دی۔ یوں موقع پر ہی ان کا نکاح کر دیا گیا۔ رخصتی دو ماہ بعد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ادھر منگنی توڑنے پر اظہر کا اس گھر میں آنا جانا رک گیا۔ جبکہ دوسری طرف مریم بہت خوش تھی۔ منزل چل کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

اب کی بار جب مریم کا خاوند چھٹی پر آیا تو اس نے پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔ لڑائی جھگڑا شروع کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ کراچی لے جاؤ۔

اس کا خاوند یاسر اس صورت حال سے سخت پریشان ہوا۔ بروقت ان تمام لوگوں کو لے کر جانا ممکن نہ تھا۔ مگر مریم کے اصرار میں شدت آ گئی۔ وہ بضد تھی کہ اگر مجھے کراچی نہیں لے جا سکتے تو مجھے آزاد کر دو۔ اب میں تمہارے بغیر یہاں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا اور اب پکا یقین ہو گیا ہے کہ تم نے وہاں شادی کی ہوئی ہے۔''

اس الزام سے یاسر کی سوچ سمجھ کی قوت مفقود ہو گئی۔ پھر مریم نے دو ٹوک بات کی مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا مجھے طلاق دے دو۔

برادری کے معززین نے اسے بڑا سمجھایا مگر اسے تو اظہر کی محبت کا بخار تھا۔ جس کے لیے وہ اپنی نند کی عزت کو تو داؤ پر لگا چکی تھی۔ وہ کیسے باز آتی اور پھر یاسر کے کراچی جاتے ہی اُس نے عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کر دیا۔

وہ سرعام اظہر کے ساتھ کچہری پیشی پر جاتی اب گھر سے باہر وہ اس کا مشیر تھا اور تمام امور اسی نے سنبھال رکھے تھے۔

یاسر، مریم کی بے حسی پر سخت پریشان تھا اس نے کیس کی پیروی نہ کی۔ یوں اس کو عدالت سے خلع مل گیا۔

عدت گزرتے ہی اس نے اظہر سے نکاح کر لیا۔

گاؤں میں یوں علی الاعلان نکاح کر کے رہنے میں دونوں کے لیے جان کا خطرہ تھا۔ اس لیے وہ شہر میں مکان کرائے پر لے کر زندگی گزارنے لگے۔

یاسر نے بیٹیوں کو لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ اگر تمہارے بغیر زندہ رہنا ہی ہے تو بیٹیوں کی جدائی بھی برداشت کر لوں گا۔

اظہر کے ساتھ یہ چھ نفوس شہر میں مقیم تھے۔

پانچوں بیٹیاں اظہر کو مریم نے جیسے تحفتاً دی تھی۔

ایک بیٹی کی شادی مریم نے خالہ کے بیٹے سے کر دی۔ یہ رشتہ مریم نے بڑی منت سماجت کر کے ان کو دیا تھا۔

شادی کو چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اسے طلاق ہو گئی کہ اگر ماں پانچ بچوں کے بعد بھی معاشقہ لڑا سکتی ہے تو بیٹی سے کچھ بھی بعید نہیں۔

ایک بیٹی کو ایک لڑکا پسند آیا وہ اس کے ساتھ شادی رچا بیٹھی۔

مریم کے بطن سے اظہر کی مزید تین بیٹیاں ہوئیں۔

اس نے گاؤں سے شہر تبادلہ کروا لیا تھا۔

اب پورے خاندان برادری سے کٹ کر شہر میں رل رہا ہے۔ سات خواتین کے ساتھ تنہا اظہر ایک مرد ہے۔ گاؤں میں قریبی رشتے داران کو منہ نہیں لگاتے۔ اب بھلا ایک ایسا شخص جس نے دوست کے گھر میں، آباد گھرانے میں نقب لگائی ہو۔ وہ کس طرح سہل زندگی گزار سکتا ہے۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے۔ آمین۔

☆☆☆

ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط 01

انتقام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا

برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکۃ الآرا سلسلہ

میں کون ہوں؟ آپ مجھے ایی پارک کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ نام ایک اشارہ ہوتا ہے۔ کسی کی شناخت کا۔ میری شناخت ایی پارک ہے اور میرے بابا کارمیل ڈی سازرے کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ چاہیں تو





انھیں کمپارٹو کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ 'کمپارٹو' وہ کمپیوٹر کے حوالے سے کہے جاتے ہیں بلکہ انکل ترمووا دانچی تو اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ پہلے کمپیوٹر ایجاد ہوا یا میرے پاپا۔ یعنی کارمیل ڈی سارترے۔ اس مسئلے کو اس طرح حل کیا جاسکتا ہے کہ کمپیوٹر کو کارمیل ڈی سارترے کا جڑواں بھائی کہا جاسکتا ہے۔

ویسے آپ کو میری تحریری خوبی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ دیکھیے کتنی خوش اسلوبی سے میں نے چند الفاظ میں تین افراد کا تعارف کرایا۔ اب یہاں سے آگے بڑھتے ہیں۔ یعنی ہم کون ہیں اور اپنے بارے میں آپ کو کیا بتانا چاہتے ہیں۔

نمبر ایک: پاپا، مسٹر کمپارٹو، فرانس کے شہر اسٹراس برگ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، مسٹر آرگون سارترے اسٹراس برگ میں باکسائٹ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ مسٹر کمپارٹو نے فوج میں کمیشن لیا اور ترقی کر کے میجر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ درمیان کی تفصیلات غیر ضروری ہیں۔ اس لیے میں انھیں نظر انداز کرتی ہوں۔ آتی ہوں انکل ترمووا دانچی پر، نام ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق ویت نام سے ہے۔ بحیرہ چین کے شمال میں ہیونگ نامی شہر کے رہنے والے ہیں۔ تجربے کار فوجی رہے ہیں اور ویت نام کے لیے فرانسیسی فوجوں سے بڑی دلیری سے لڑے ہیں۔

ویت نام اور فرانس کی سیاسی اور فوجی پالیسی جنگ کے خاتمے کے بعد کیا رہی یہ سیاسی مسئلہ ہے اس لیے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ لیکن دو بدترین دشمن۔ یعنی ایک ویت نامی دوسرا فرانسیسی، بہترین دوست کیسے بنے ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ابھی بتاتی ہوں پہلے تیسرے کردار کے بارے میں، یعنی اپنے بارے میں بتا دوں۔ لیکن اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اپنی ماں کی مختصر نصیحتیں سامنے لاتی ہوں گی۔ میری ماں کا نام سوئی چی تھا۔ ڈانانگ کے ایک نواحی گاؤں کے کسان کی بیٹی تھی۔ مسلم اور البڑ ہی، جو ایک زخمی دشمن فوجی کارمیل ڈی سارترے کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔ یہ زخمی فوجی بھی اس سے پیار کرنے لگا اور دونوں نے اپنے اپنے مذہبی عقائد کو دہراتے ہوئے آپس میں شادی کرلی۔ پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ کارمیل ڈی سارترے کی کمپنی کا وہاں سے گزر ہوا اور وہ سارترے کو اپنے ساتھ لے گئی۔ سوئی چی اس وقت اس غار میں رہتی تھی جس میں انھوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو غار خالی تھا۔

سوئی چی نے سارترے کی محبت کے تحفے کو جنم دیا۔ یعنی 'میں' اور انتظار کرتی رہی کہ شاید آنکھوں کے آئینے جس کے منتظر ہیں اپنا عکس دیکھنے آجائے۔ یہ وہ لمحات تھے جب ویت نام اور امریکہ کی جنگ اپنے آخری مراحل میں تھی۔

یہ جنگ تیس سال جاری رہی۔ ویت نام آرمی نے فرانسیسی فوجیوں کو 1954ء میں ڈین بین پو پر شکست دی اس موقع پر فرانس نے امریکہ سے مدد مانگی۔ لیکن امریکہ نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ جنوبی ویت نامی فوجیوں نے شمالی ویت نام میں بھی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ صدر جان ایف کینڈی نے 1961ء میں 400 سپاہیوں کی فوج جنوبی ویت نام بھیجی۔ نومبر 1963ء میں کینڈی کے قتل کے وقت جنوبی ویت نام میں 1600 امریکی فوجی موجود تھے۔ اگست 1964ء میں لنڈن بی جانسن نے امریکی ایئر کرافٹس کے ذریعے شمالی ویت نام پر فضائی حملے کی اجازت دی اور ساتھ میں 3500 میرین جنوبی ویت نام بھیجیں۔ 1949ء میں جب چین میں کمیونسٹ پارٹی پاور میں آئی تو واشنگٹن میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ انھیں خطرہ ہوگیا کہ ویت نام ایشیا میں مضبوط حیثیت حاصل کرلے گا۔ یہی ایک بڑی وجہ تھی کہ امریکہ 1950ء میں ہی فرانس کو مدد دینے پر غور کرنے لگا۔

اس کے بعد امریکیوں کا رہنما ''ٹرامین'' سامنے آیا جس نے اس امید پر فرانس کی مدد کی کہ یہاں غیر کمیونسٹ قوم ترقی پائے گی۔ اس جنگ کے دور رس اثرات ویت نام کے پڑوسی ملک ملائیشیا کی ربر اور ٹن کی صنعت پر بھی پڑتے تھے۔ امریکہ کی مدد سے فرانس معاشی طور پر بھی خود کو بحال کرسکتا تھا۔ امریکہ خود بھی وہاں سے کاروباری فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ 1956ء میں جب ویت نام میں الیکشن ہوئے تو وہاں کے مرد آہن '' ہوچی من کو 80 فیصد ووٹ ملے۔ امریکہ نے نعرہ لگایا کہ وہ جنوبی ویت نام کے ساتھ ہے اگر وہ وہاں ہتھیار ڈالتا تو ساری دنیا میں مذاق بنتا۔ آئزن ہاور نے بھی جنگ کی حمایت جاری رکھی اور زبردست بمباری جاری رکھی۔ لیکن ''نیشنل لبریشن فرنٹ'' اور شمالی

ویت نام کی طرف سے بھرپور جواب ملا۔ امریکہ کو اس زبردست غلطی کا احساس ہوا وہ شدید معاشی نقصان کا شکار ہوا۔ چنانچہ 1973ء میں امریکی فوجوں نے ویت نام سے نکلنا شروع کر دیا۔

میں زیادہ تفصیل میں چلی گئی۔ سیاسی بازیگری اپنے الگ معاملات رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ موقع ملتے ہی مسٹر سارترے خفیہ طور پر اپنی محبت کی تلاش میں ویت نام پہنچے۔ وہاں دوران جنگ ایک دلچسپ واقعہ مسٹر سارترے اور ترمووا وانچی کا ہوا تھا۔ ترمووا وانچی ویت نام کی طرف سے فرانسیسی فوجوں پر آگ برسا رہا تھا۔ اور مسٹر سارترے اپنی فوج کی طرف سے بہادری کے جھنڈے گاڑھ رہے تھے کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ بالکل اچانک میں دونوں دو بدو لڑائی پر مجبور ہو گئے۔ معاشی درندوں کی طرح لڑے اور دونوں کو شدید زخم آئے۔ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ پھر مسٹر سارترے کو پہلے ہوش آ گیا۔ ان کی ایک ٹانگ چور چور ہو گئی تھی۔ ترمووا وانچی ان کے پاس بے ہوش پڑے تھے۔ مسٹر سارترے ترمووا کو بڑے آرام سے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ لیکن انھوں نے بے ہوش دشمن کو ہلاک کرنا مردانگی کی شان کے خلاف سمجھا اور وانچی کو ہوش میں لا کر نکل جانے کا موقع دیا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کا کوئی پتا نہیں چلا۔ مسٹر سارترے یعنی میرے والد صاحب ویت نام پہنچے اور انھوں نے اپنی محبت کو تلاش کیا لیکن۔ انھیں سوئی چی زندہ نہیں ملی وہ مسٹر سارترے کی بچی کو جنم دے کر چلی گئی تھی۔ تب پاپا مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ انھوں نے کمپیوٹر بنانے والی ایک کمپنی میں کام شروع کیا اور رفتہ رفتہ خود کمپیوٹر بن گئے۔ بہت کام اور دولت کمائی۔ میری پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ تھوڑی سی اپنی تعریف بھی کر دوں۔ لوگوں کا ہی نہیں میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ دلکشی کی آخری حدوں کو بھی پار کر چکی ہوں۔ میرا قد پانچ فٹ سات انچ ہے۔ نقوش فرانس اور ویت نام کا مکمل حسن لیے ہوئے ہیں۔ رنگ بے حد سفید، آنکھیں خالص گرین ہیں اور ان کی بناوٹ پرکشش ہے۔ میرا سینہ کشادہ، کمر پتلی اور دوسرے اعضاء بے مثال میں جس کا ثبوت تو ان لوگوں کے اختیار ہونے سے ملتا ہے۔ جو کسی شکل میں مجھ تک کرتے ہیں۔ میرے حلیے جسامت اور حسن کو دیکھ کر لوگ یہی سوچتے ہیں کہ میں اک نرم و نازک چھوٹی موٹی سی لڑکی ہوں۔ میری تفریحات آزادانہ ہیں اور میں اپنی پسند کی ہر تفریح میں دلچسپی لیتی ہوں۔ لیکن ان لوگوں کو کئی بار بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ جنھوں نے مجھ سے متاثر ہو کر مجرمانہ انداز میں مجھ پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ انھیں اپنی اس احمقانہ کوشش کا عظیم نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ مثلاً ایک بار میں بور بن کلب سے رات گئے اٹھی اور معمول کے مطابق کلب کے پارکنگ لاٹ پر کھڑی اپنی الفاروميو کی طرف بڑھی۔

جونہی میں اپنی کار کے قریب پہنچی۔ میری کار کے قریب کھڑی ڈاج کا پچھلا دروازہ کھلا اور کسی نے مجھے کمر سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ میں اندر گری تو دو طاقتور ہاتھوں نے میرا منہ بھینچ لیا۔ کار کا دروازہ بند ہوا اور وہ اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ چار افراد تھے۔ دو مجھے ڈاج کی پچھلی سیٹ پر سنبھالے ہوئے تھے دو آگے تھے جن میں سے ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا دوسرا اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

یہ لوگ مجھے لیے ہوئے شاندار بنگلوں کے ایک علاقے میں پہنچے۔ اور ڈاج ایک بنگلے کے پورچ میں رک گئی۔ اس موقعے پر میں نے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی، تاکہ وہ لوگ آسانی سے ابتدائی مرحلہ طے کر لیں۔ مجھے ایک بے حد آراستہ بیڈ روم میں لایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ تیز روشنی میں، میں نے انھیں پہچان لیا۔ یہ چاروں اکثر بور بن کلب میں ساتھ آتے رہتے تھے اور لوگ ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔ ویسے بھی یہ خطرناک چہروں اور جسامت کے لوگ تھے۔

خیر جناب انھوں رنگ رلیاں منانے کے منصوبے بنائے۔ شراب کی بوتلیں کھلیں پھر مجھے جگانے کی کوشش کی۔ جس سورما نے مجھے پہلا ہاتھ لگایا اس کے سامنے والے دانتوں کی پوری قطار اس کے منہ میں جا پڑی اور وہ خون اگلتا ہوا مسہری پر کوئی چار فٹ دور جا گرا۔ میں نے اچسمٹو کا پ مارا تھا جو پاؤں کے پنجے سے مارا جاتا ہے۔ باقی تینوں اپنی حیرت کا شکار ہو گئے۔ ابتدا میں سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا ہے بعد جب سمجھے تو دیر ہو گئی تھی۔ میں نے انھیں ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اور یہ ٹھوکر بنی تلی تھیں اور ایسی تھیں کہ بے شمار ایسی لڑکیاں ان کے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں جو ان کی پذیرائی نہ کرنا چاہتی ہوں۔

چاروں کو زمین بوس کر کے میں نے انھیں کچھ نصیحتیں کیں کچھ نیک مشورے بھی دیے اور اس ڈاج میں بیٹھ کر بوربن واپس آئی۔ اصل میں مارشل آرٹس کی مشق میں نے کسی استاد کے بغیر اپنے گھر میں کی تھی۔ میرا بہترین شوق مختلف جانوروں کا تجزیہ کرنا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ ہر ذی روح میں غصے اور انتقام کا جذبہ لازمی ہوتا ہے۔ اپنے بچاؤ کے لیے یا کسی ہم نسل یا غیر نسل کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ کون سے داؤ آزماتا ہے۔ میں نے ان ہی سے تربیت حاصل کی تھی اور بالکل انوکھے داؤ ایجاد کیے تھے۔ جو مارشل آرٹس کے اصولوں سے مختلف تھے۔ اصل میں داؤ پیچ دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے تھے نہ کہ یہ دشمنی کے باوجود تحفظ دینے کے لیے۔

خود انکل وانچی میرے اس فن سے بہت متاثر تھے۔ اور اس کی بھرپور تعریف کرتے تھے۔

میں نے ایک خوف ناک بات کی ہے نا۔ یعنی مسٹر ترمود وانچی، ویت نام کے فوجی اور وفادار اور میرے انکل؟ جی ہاں اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جنگ ختم ہوگئی۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ مسٹر سارترے نے ایک محل نما عمارت میں کمپیوٹر ورلڈ قائم کرلی اور اس کے ذریعہ بہت سے خطرناک کام کرنے لگے۔ جن کی تفصیل میں اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ دنیا کے کئی بڑے ممالک انھیں معقول رقمیں بھیجنے لگے۔ پتا نہیں کیوں؟

کمپیوٹر ہی کے ذریعے ایک ایسی شخصیت کی تفصیل حاصل ہوئی جو مصنوعی اعضا بنانے میں کمال رکھتی تھی۔ اور اس کے اس فن کے بارے میں بہت سے کلپ منظر عام پر آئے تھے کیونکہ ترمود وانچی سے جنگ کے دوران مسٹر سارترے کا ایک پاؤں چکنا چور ہوگیا تھا جسے بعد میں کمر کے جوڑ کے پاس سے کٹوانا پڑ گیا تھا۔ اس نے مسٹر سارترے مصنوعی پاؤں سے کام چلا رہے تھے۔ لیکن یہ مصنوعی پاؤں انھیں بہتر نہیں لگتا تھا۔ انھوں نے اس شخصیت کو میل کیا کہ وہ ان سے آکر ملے اور نتیجے میں انکل وانچی آگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور پھر پاپا نے مسٹر وانچی کو واپس نہیں جانے دیا کیونکہ ان کے اہل خاندان بھی جنگ کی نذر ہوگئے تھے۔

بس یہ چھوٹا سا خاندان بن گیا تھا۔ پاپا نے مسٹر وانچی کو بھی اپنے پراسرار کاروبار میں شامل کرلیا جو وہ کمپیوٹر کے ذریعہ کرتے تھے۔ اصل میں پاپا دنیا کے خطرناک ترین ہیکر تھے جن کے پاس دنیا بھر کے ملکوں کے صنعتکاروں کے، کمپنیوں کے انتہائی خفیہ راز موجود ہوتے تھے۔ بے شک ان رازوں کے ذریعہ اب تک انھوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا سوائے اس کے کہ وہ ان کی کفالت کریں۔ اور ان کی کلائنٹ خوشی سے ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسا انتظام کیا تھا کہ کوئی ان تک نہ پہنچ سکے۔ اور وہ پوری طرح کامیاب تھے۔ ان کا سینہ ایسے رازوں کا مسکن تھا جو دنیا کو ہلا کر پھینک سکتے تھے۔

دوسری طرف میں بھی۔ ایک الگ ہی شخصیت تھی۔ اپنی پسندیدہ شخصیتیں، پسندیدہ مشاغل کے بارے میں بتاؤں گی تو آپ دنگ رہ جائیں گے۔ زندگی کے، جوانی کے اصولوں اور ضرورتوں سے ناآشنا نہیں تھی۔ میں جو چاہتی تھی وہ آپ کو بھی نہیں بتاؤں گی کیونکہ ہر انکشاف کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر کام اپنے وقت پر ہی مناسب لگتا ہے۔

میں دنیا میں صرف چند شخصیتوں سے متاثر تھی۔ میرا آئیڈیل، میری پسند میں سرفہرست ایڈولف ہٹلر تھا۔ جس کے بارے میں، جس کے افکار و خیالات کے بارے میں میں نے مکمل معلومات حاصل کی تھیں۔ مثلاً اس وقت جب بوسٹن کا ماہر نفسیات ڈاکٹر ولیم لنگر دن رات کام میں مصروف تھا۔ وہ محکمہ جاسوسی کی خفیہ میڈیکل برانچ کے ایک خصوصی خفیہ منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ جس کی رپورٹ اُسے جلد از جلد پیش کرنی تھی۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ایڈولف ہٹلر کا ایک جامع نفسیاتی خاکہ مرتب کرلے۔ ہٹلر، ایک سمجھ میں نہ آنے والا شخص جو امریکہ سے ہزاروں میل دور برلن میں چانسلری کی مضبوط عمارت میں بیٹھا، حکم پہ حکم صادر کیے جا رہا تھا۔

دوسری طرف ہٹلر نے بھی ایک ماہر نفسیات کو مامور کر رکھا تھا کہ امریکہ کے لیڈر جنرل آئزن ہاور کا نفسیاتی تجزیہ مرتب کرے۔ ولیم لنگر نے ہٹلر کے بارے میں انتہائی معتبر معلومات حاصل کی تھیں۔ 1922 میں وہ زیادہ تر مشرقی پرشیا میں رہا۔ وہاں وہ ذاتی تہہ خانے میں رہتا تھا۔ جو گھنے جنگل میں تھا۔ اور درختوں سے ڈھکا رہتا تھا۔ بظاہر وہ ایک

عام سا آدمی تھا۔ اس میں کوئی دلکشی تھی تو بس یہ کہ وہ ہٹلر تھا۔ مشہور اور بڑا آدمی۔ وہ اذیت پسند تھا اور اس کی انفرادیت کے بہت سے پہلو تھے۔

میری دوسری پسندیدہ شخصیتیں وہ جاسوس تھے جنھوں نے دنیا بھر میں اپنے کام کا سکہ جما لیا تھا۔ جیسے ماتا ہری، یا اور دوسرے۔ اسپائی دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جو ریسرچ یعنی تحقیق کے شعبے سے وابستہ ہوتے ہیں ان کے ہاتھوں میں کسی بھی ملک کے اہم ترین راز ہوتے ہیں اور ایک اچھا ایجنٹ وہ ہوتا ہے جو چالاکی اور عیاری دکھانے اور جوڑ توڑ کرنے کے بجائے نفسیاتی حربے استعمال کرتا ہے۔

ایک مدت پہلے کی بات ہے کہ جب کریمن میں ایک کمیونسٹ سفارت کار نے کامریڈ اسٹالن کو بتایا کہ کوئی بھی غیر ملکی اگر امریکہ میں پانچ سال گزار لے تو اس امریکی شہریت مل جاتی ہے یہ سن کر اسٹالن بولا۔

''اگر ایسی بات ہے تو ہم کیوں نہ پانچ ہزار مردوں اور عورتوں کو وہاں بھیج دیں تاکہ وہ وہاں کی شہریت حاصل کرلیں اور اس وقت کا انتظار کریں جب ہمیں وہاں ان کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح کے لوگ جرمنوں کے بھی پوری دنیا میں پھیلائے ہوئے تھے۔ اس طرح کے لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے۔

اس بارے میں چند لوگ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جیسے ایزل کرد مین، جو برسوں تک ایک گھڑی ساز کے روپ میں ملک کے اہم راز چراتا رہا، یا نبات کا ایک پروفیسر، جسے 1936ء میں ہوائی بھیجا گیا تھا اسی پروفیسر نے پرل ہاربر سے جاپانی طیاروں کو روشنی کے سگنل دیئے تھے جن کی وجہ سے جاپانی طیاروں نے پرل ہاربر پر ٹھیک ٹھیک بمباری کی۔

ایسے میں لوگوں میں ایک شخص کلازفش تھا جو 1935ء ہی برطانیہ میں داخل ہوا۔ اسے 1949ء میں گرفتار کیا گیا۔ دنیا میں ایٹمی رازوں کی چوری کا آغاز اسی شخص سے ہوا۔ اس کے بعد تو گویا ایک دوسرے کے ایٹمی راز چرانے کی ایک دوڑ شروع ہوگئی۔ اس شخص کو ''ایٹم اسپائی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جرمنوں نے خاص طور پر خوبصورت لڑکیوں کو خصوصی تربیت دے کر دنیا بھر میں پھیلا دیا تھا جو زیادہ آسانی سے ضروری لوگوں تک رسائی حاصل کرکے ٹیلر کے لیے خاص طور پر اہم جگہوں کے نقشے فراہم کرتی تھیں۔ ایسی شاندار خواتین نے اپنے طور پر بھی جاسوسی کی ایجنسیاں بنا رکھی تھیں اور شاید وہ معاوضے پر ضرورت مندوں کے کام آتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک مشہور نام ''ماتا ہری'' کا تھا۔ ماتا ہری نے اپنے فن سے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ 1939ء میں اس نے برطانیہ کو رپورٹ دی تھی کہ ہٹلر جلد ہی جنگ شروع کردے گا اور سب سے پہلے وہ ڈنمارک، فن لینڈ اور ناروے پر چڑھائی کرکے انھیں فتح کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے ان ملکوں میں موجود ایجنٹوں کی فہرست بھی بنا کر دی تھی۔ روسیوں نے اس رپورٹ کی ایک کاپی حاصل کرنے کے لیے بڑی رقم خرچ کی جبکہ فرانس اور برطانیہ نے بھی اس کے حصول کے لیے خوب تگ و دو کی۔

ماتا ہری نے ان جاسوسوں کے بارے میں بھی خبریں فراہم کرکے۔ خوب دولت کمائی جو خاص طور سے۔ بندرگاہوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کاغذات چرائے جارہے تھے۔ کہیں نئی مشینوں اور دیگر ایجادات کے نقشوں اور ڈایا گرامز کی نقلیں تیار ہورہی تھیں۔

جاسوس، ارسپائی، ایجنٹ، دہشت گرد، مخبر، پیغام رساں، سراغ رساں، ان سب کے پیچھے کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ہیکر، یعنی مسٹر کارمیل ڈی سارتر ہے، یعنی میرے گریٹ پاپا بھی ایسے ہی پس منظر کے شکار تھے۔ بے پناہ ذہین، اپنے فن کے ماہر مسٹر کارمیل، بہت بڑی شخصیت تھے لیکن انسان تھے۔ ان کے اندر بھی کوئی دکھ پل رہا تھا۔ بظاہر ان کی زندگی پرسکون تھی۔ لیکن اندر کچھ تھا۔ جو ایک دن یوں سامنے آیا۔ انھوں نے اس خفیہ تہہ خانے میں مجھے طلب کرلیا۔ جسے قید خانے کے بجائے ایک ناقابلِ یقین سائز کا کمپیوٹر کہا جاسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔

اس وقت وہ معمول کے مطابق انکل وانچی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا اپنے باپ سے دور کا کوئی واسطہ

نہیں تھا۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا ہم تینوں ہمیشہ ساتھ کھاتے تھے۔ لیکن اس تہہ خانے میں سب ایک دو بار ہی آنا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑی آبزرویٹری معلوم ہوتی تھی جہاں چھت سے لے کر زمین تک پراسرار مشینوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔

''بیٹھو!'' پاپا نے اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں بیٹھ گئی۔ ''میں آج تم سے کچھ سنجیدہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی پاپا۔''

''کیا تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔''

''کیوں نہیں پاپا؟''

''شادی کرو گی۔''

''نہیں۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ پھر ہنس پڑی۔

''کیوں؟...... ہنسیں کیوں؟''

''آپ کی بات پر پاپا۔''

''اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں تھی۔''

''تھی پاپا۔ آپ نے اپنے فن کی ایک دنیا بسا رکھی ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس وقت کائنات اس پراسرار عمارت کے ایک تہہ خانے میں پوشیدہ ہے۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے ملک کے مکمل کوائف، وہاں کی مشکلات اور دوسرے عوامل کا ریکارڈ اس تہہ خانے میں موجود ہے۔ لیکن یہاں ایک شخص جس کا نام کارمیل ڈی سارترے ہے۔ ایک خالص باپ ہے۔ جو اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

''ہاں۔ میں ایک باپ ہوں۔ کیونکہ انسان ہوں۔'' سارترے نے کسی قدر جذباتی لہجے میں کہا۔ انکل وانچی پتھریلا چہرہ بنائے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

''او مائی سویٹ پاپا۔ میری بات پر ناراض نہ ہو۔''

''وہ معصوم لڑکی میری محبت تھی۔ میری دشمن نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس نے مجھے دوبارہ زندگی دی اور پھر محبت کے ہاتھوں نڈھال ہو کر اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ وہ انسان تھی۔ میں نے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا کیونکہ میں بھی انسان تھا۔ پھر ناگزیر عوامل نے ہمیں جدا کر دیا۔ اگر وہ زندہ ہوتی، اگر وہ مجھے مل جاتی تو یقیناً میری زندگی دوسری ہوتی اور میں یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب میں کچھ اور ہوں۔ سنو اینی پارک، تمہاری عمر پچیس سال آٹھ مہینے چودہ دن سات گھنٹے ہے اس وقت۔ ان میں سے ہر سیکنڈ، ہر منٹ، ہر گھنٹے، ہر دن ہر ماہ، ہر سال کا ریکارڈ ہے میرے پاس۔ تمہیں خود یاد نہیں ہوگا، لیکن مجھے اپنی عمر کے کسی حصے کا نام لے کر بتاؤ کہ اس عمر میں اس گھنٹے میں تم کیا کر رہی تھیں۔ میں تمہیں ٹھوس ثبوت کے ساتھ بتاؤں گا کہ اس وقت تم کہاں اور کس حال میں تھیں۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بہت بڑا دعویٰ لگا یہ۔ اور مسٹر سارترے، جس پائے کے انسان تھے مجھے یقین تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں اس میں ایک لفظ غلط نہیں ہے۔ لیکن مزید بات یہ تھی کہ کچھ تفریحی اقدامات کے علاوہ کوئی ایسا عمل نہیں تھا جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ ہاں ان تنہا لمحات سے میں انکار نہیں کروں گی جب میری عمر نے، موسم اور ماحول نے، مجھ سے کچھ شکایتیں کی تھیں۔ اور کچھ چاہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ان لمحوں کی طلب پوری نہیں کر سکی تھی۔

''گویا تم ایک عام زندگی نہیں گزارنا چاہتیں۔'' پاپا نے کہا۔

''جی پاپا۔''

''تو تمہارے دل میں کیا ہے؟''

''میں کوئی منفرد کام کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے تمہارے رجحان کا علم ہے۔''

''کیا..... بتایئے؟''

''تم ان واقعات، جیسے کرداروں میں دلچسپی رکھتی ہو جو پراسرار روایات کے حامل ہوں۔ تم زیادہ تر اسپائی لٹریچر میں دلچسپی لیتی رہی ہو۔''

''بالکل ٹھیک پاپا۔''

''میں اس کے لیے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''

''آپ نے ہمیشہ میری مدد کی ہے پاپا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے۔ میرے اندر بھی ہے۔ حالانکہ میرے دوست وانچی نے اپنا تمام فن یعنی مصنوعی اعضا سازی میری بہتری میں صرف کر دیا ہے اور کوئی بھی مجھے ایک معذور انسان نہیں کہہ سکتا لیکن اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ میں کہاں خود میں کمی محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت دنیا کے سولہ غریب ملکوں میں کروڑوں ڈالر کی مالیت کے خرچ سے ایسے ادارے اور فیکٹریاں قائم ہیں جہاں مصنوعی اعضا تیار ہوتے ہیں اور اس سے نادار لوگ جو کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنے قدرتی اعضا سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے اپنے لیے نئی زندگی حاصل کرتے ہیں جہاں ان سے کوئی رقم نہیں طلب کی جاتی۔

''اوہ پاپا! سوئی آرگنیو؟'' میں اچھل پڑی۔

''ہاں۔ یہ ادارہ تمہاری ماں کے سوئی چی نام پر ہے۔ لیکن اس کے مرکز کے بعد میں کوئی نہیں جانتا۔ ایک انٹرنیشنل سسٹم کے تحت یہ سب ہوتا ہے۔

''گریٹ پاپا۔'' یہ سوال پر ایک عجیب سا اثر ہوا تھا۔

''میں یہ کام دنیا بھر میں پھیلانا چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا کام ہے پاپا۔''

''ہم اس کام کی سرمایہ کاری کے لیے دوسرے عمل بھی کر رہے ہیں اور ہمیں مزید سرمائے کی ضرورت ہے۔ وانچی نے مجھے ایک مشورہ دیا ہے اور اس کے لیے میں نے تمھیں طلب کیا ہے۔''

''پاپا! میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس سلسلے میں ہمارا سارا پروگرام مسٹر تسوداوانچی تمھیں بتائیں گے۔'' مسٹر سارترے نے کہا۔

☆☆☆

ہوٹل سان کرے کے روم نمبر 705 میں میرے سب سے پہلے ملاقاتی مسٹر جیمس بارلے اور میڈم قیوری تھے۔ دونوں عمر رسیدہ تھے اور قدامت پرست معلوم ہوتے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ فون پر ان کی آواز بالکل جوان لوگوں کی سی تھی۔

''اپنی تصدیق کے لیے پہلے یہ نشان دیکھ لو باتیں اس کے بعد ہوں گی۔''

میڈم قیوری نے اپنے لباس سے ایک کارڈ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔ یہ برٹش سیکرٹ سروس کا شناختی نشان تھا جو بہت خاص مواقع پر سیکرٹ سروس کے ارکان ایک دوسرے کی شناخت کے لیے استعمال کرتے تھے۔

انکل وانچی اور پاپا نے پورے پندرہ دن مجھے اس قید خانے میں قید رکھا تھا اور مجھے جاسوسی کے بہت سے عوامل کی تربیت دی گئی تھی۔ مجھے دنیا بھر کی جاسوس تنظیموں کے بارے میں ایک ایک پہلو سے آگاہ کیا گیا تھا۔ ان کے خفیہ نشان بتائے گئے تھے اور انھیں پوری طرح ذہن نشین کر لیا گیا تھا۔

ان میں برٹش سیکرٹ سروس کا یہ نشان بھی تھا۔ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور انھیں اپنے بارے میں مطمئن کیا۔ پھر میں نے کہا۔

''لیکن مجھے ایک بات کا شبہ ہے۔''

''کیا؟''

''آپ کی یہ شکلیں اصلی نہیں ہیں۔ گو آپ کی آوازیں اور بولنے کا انداز وہی ہے جو میں نے سیل فون پر سنا تھا لیکن چہرے اس آواز سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

''ہمیں بتا دیا گیا ہے کہ جس شخصیت کو ایک اہم کام کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ وہ ایکس ریز آئیز رکھتی ہے اور اسے کسی بھی جگہ بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ہمارے یہ چہرے اصلی نہیں ہیں۔ لیکن ہم احتیاطاً اصلی چہروں میں یہاں نہیں آئے۔

دونوں نے اپنے چہروں سے ماسک اتار دی جو گردن تک کو کور کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھوں کے کھلے حصوں سے بھی جھلیسی اتار دی۔ دونوں خوب صورت تھے۔ مسٹر بارلے کی عمر چالیس کے قریب تھی اور قیوری اندازاً تیس سال کی ہوگی۔ میں مسکرا دی۔

''کیا ہم پھر بوڑھے ہو جائیں۔'' قیوری نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

''بہتر ہوگا کیونکہ میں آپ کے لیے کوفی منگوانا چاہتی ہوں اور روم سروس نے آپ کو دوسرے روپ میں دیکھا ہوگا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ مجھے یہ خوش مزاج جوڑا پسند آیا تھا۔

میک اپ کی ہزاروں قسمیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ اس کے لیے با قاعدہ کام ہوا ہے اور اس میں بڑی ترقی کی گئی ہے۔ خواتین نے اپنے حسن میں اب چار چاند کے بجائے آٹھ چاند لگانے کے انتظامات کر لیے ہیں۔ دوسرا شعبہ یہ بھی ہے جس میں تھیٹر کے اداکاروں سے لے کر جاسوسی کے شعبے تک منسلک ہیں اور وہ جدید ترین میک اپ سے اپنی شخصیت کو اس طرح بدل لیتے ہیں کہ آئینہ دیکھیں تو خود کو خود بھی نہ پہچان سکیں۔

مسٹر بارلے اور میڈم قیوری نے ماسک پہن لی اور پھر سے بوڑھے ہو گئے۔

''بڑی دلکش جوڑی ہے آپ دونوں کی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اصل شکل میں یا اس شکل میں۔'' قیوری نے کہا۔

''دونوں میں بس ہنس پڑی اور وہ دونوں بھی ہنسنے لگے۔ پھر مسٹر بارلے نے کہا۔

''میں نے تو بہت کوشش کی مس قیوری مجھ سے رومان کرنے پر تیار ہو جائیں۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کے اندر رومانس کے جراثیم ہی نہیں ہیں۔''

دونوں دیر تک ہنستے مسکراتے مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں نے روم سروس کو فون کر کے کوفی منگوالی تھی۔ کوفی کے گھونٹ لیتے ہوئے میں نے کہا۔

''کیوں نہ اب کام کی باتیں کی جائیں۔''

''ضرور۔ ویسے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے مس پارک۔ بڑی نوعمری میں آپ نے ایک خطرناک شعبے کا انتخاب کیا ہے۔''

''شاید۔'' میں نے اس گفتگو کو طول کر دینے کے لیے مختصراً کہا۔ پھر مسٹر بارلے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں آپ کو اس خطرناک گروہ کے بارے میں بتا کر اس گفتگو کی ابتدا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ گروہ کورڈیل نامی ایک شخص نے بنایا تھا جو ہنگری کا باشندہ تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے یہ بات کھلی بھی نہیں تھی کہ ریڈول کو قتل کر دیا گیا اور گروہ کے دوسرے طاقت ور افراد نے اس کے عہدے سنبھال لیے۔ لیکن گروہ نا کام کورڈیوال ہی رہنے دیا۔ بلکہ ایک پراسرار کردار پیدا کر لیا گیا۔ جو خود کو ریڈول میں کہتا ہے۔ لیکن وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے کسی کو نہیں معلوم جبکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ کورڈیول نہیں ہے کیونکہ انھوں نے کورڈیول کو خود قتل کیا تھا۔ اور اس کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔

''گڈ! دلچسپ!'' نے کہا۔

''یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ گو ان کا تعلق دنیا کے مختلف ممالک سے تھا لیکن وہ خفیہ طریقوں سے کسی بھی مقررہ

وقت پر ایک دوسرے سے ضرور ملتے ہیں۔ اور تمام امور پر منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ان کا اہم ترین مقصد کمیونسٹوں کے خلاف کام کرنا تھا اور وہ ایسی ہر تنظیم کی حمایت کرتے تھے۔ جو کمیونسٹوں کے خلاف کام کرتی تھی۔ لیکن پھر اس میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انھوں نے ایک فوجی گروپ بھی بنالیا۔ اس گروپ میں امریکہ، برطانیہ، فرانسیسی اور پولینڈ کے بہت سے فوجی بھی شامل ہوگئے۔ یہ کورڈیل کا عسکری ونگ تھا۔ اور اس کے اغراض ومقاصد خفیہ تھے۔ اس خطرناک گروپ کی خفیہ کارروائیاں صیغۂ راز میں تھیں۔ اس معاملے میں سب سے پہلے روس چونکا۔ کیونکہ اس کا ایک سفارت کار یورا گوئے سے اغوا ہوا اور پھر اسے قتل کروا دیا گیا۔ روسی تحقیقات نے انکشاف کر دیا کہ سفارت کار کے قتل میں کورڈیل کا ہاتھ ہے۔ روس چوکنا ہو گیا اور اس نے کورڈیل پر سخت نگرانی کروی۔ پھر اس نے کورڈیل کے سربراہ کو ختم کرنے کے لیے اپنے ایک خوفناک ایجنٹ کو بھیجا مگر کورڈیل اس سے زیادہ ذہین نکلی اس نے اس ایجنٹ کے ٹکڑے کیے اسے لندن کے روسی سفارت خانے کو بھیج دیا۔ اس واقعے سے لندن کی سیکرٹ سروس چونک گئی اور اس نے ایڈمن گوتیز کو اس تنظیم میں داخل کر کے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ لیکن سیکرٹ سروس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ کسی غیر متعلق اور اجنبی شخصیت کو بھی اس معاملے میں ملوث کیا جائے۔ اور مس اینی پارک، اس کے لیے کسی طرح آپ کے ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اور آپ کو اس مقصد کے لیے حاصل کرلیا گیا۔''

مسٹر بارلے نے بات ختم کر دی۔ لیکن میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ کا نام نہیں معلوم تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مسٹر کارمیل ڈی سارترے اور ترمودا وانچی نے ان لوگوں سے کیا معاملات طے کیے۔ میرے باپ نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ مجھ سے یہ ضرور کہا گیا تھا کہ مجھے لندن جا کر ایک خطرناک تنظیم کے خلاف کام کرنا ہے کچھ لوگ مجھ سے مل کر مجھے تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔ لیکن میرے اتالیق مسٹر وانچی مجھ سے کہا تھا۔

''یہ آپ کی پہلی مہم ہے۔ مس پارک اور اس میں آپ کو اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر کے کام کرنا ہوگا۔ یعنی آپ کو وقفے وقفے سے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ آگے کی صورت حال کیا ہے۔ پہلے سے پوری تفصیل آپ کو اس لیے نہیں بتائی جاسکتی کہ ہمیں خود اس بارے میں معلوم نہیں ہے۔ لیکن آپ کی یہ مہم ہمارے لیے نہ صرف منفعت بخش ہے بلکہ یہ جاسوسی کی دنیا میں ایک ذہین جاسوس کا تعارف بھی ہے۔''

اور میں نے یہ چیلنج قبول کرلیا تھا۔

مسٹر بارلے نے کہا۔ ''آپ کو یہ کام آج ہی سے شروع کرنا ہے۔''

''آج سے۔'' یہ میرے لیے دوسری چونکا دینے والی بات تھی۔

''جی۔ چونکہ آج رات ایڈسن گوتیز کورڈیل کے سربراہ سے ملنے والا ہے۔''

''اوہ۔ وہ کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا ذریعہ مسولینا فورڈ ہے۔''

''یہ کون ہے؟''

''آپ اس گوتیز کی محبوبہ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن دونوں کے گہرے اور خصوصی تعلقات ہیں اور مسولینا فورڈ ہی نے اطلاع دی ہے کہ کورڈیل نے کمیونسٹوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔ مسولینا نے گوتیز کو سربراہ سے متعارف کرایا ہے۔ اور آج دونوں کی ملاقات ہونے والی ہے۔''

''خود مسولینا بھی کورڈیل گروپ میں شامل ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

''یقیناً۔''

''کیا مسولینا جانتی ہے کہ گوتیز کورڈیل کے خلاف جاسوسی کر رہا ہے۔''

''شاید نہیں۔''

''شاید؟'' میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہم حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ اگر مسولینا کورڈیل کی ممبر ہے تو کوئی بے وقوف لڑکی نہیں ہوگی۔ ویسے وہ بے حد خوب صورت اور دلکش ہے۔" بارلے نے قیوری کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

مسٹر بارلے اور میڈم قیوری دیر تک ساتھ رہے۔ انھوں نے خفیہ چیزیں بھی میرے حوالے کیں جو یہاں میرے کام میں معاون ہو سکتی تھیں۔ میں نے ان کے استعمال کو سمجھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ان واقعات پر غور کرنے لگی۔ گویا مجھے اس سلسلے میں اپنی پوری ذہانت اور کارکردگی کا مظاہرہ کر کے اپنے آپ کو ایک خطرناک ایجنٹ کی حیثیت سے رجسٹر کرانا تھا۔ اور یہی میری سب سے بڑی خواہش تھی۔

مسٹر بارلے اور قیوری مجھ سے کہہ گئے تھے کہ وہ گویئز کے معاون کی حیثیت سے میرا تعارف کرا دیں گے تاکہ وہ خود کو تنہا نہ محسوس کرے۔ اور ضرورت پڑنے پر مجھ سے رابطہ کر کے کسی طرح کی مدد طلب کر سکے۔ انھوں نے مجھے اس آلے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا جس پر گویئز مجھ سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔

اس کیس کے بارے میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے حالات کے تحت اپنی سمجھ کے مطابق فیصلے کرنے ہوں گے تاکہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے اندر ایک ماتا ہری یا میریلین ہڈ چھپی ہوئی ہے۔ اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی اجازت دے کر شاید وانچی اور مارترے نے بہت سے لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا کیونکہ وہ میرے بزرگ ہونے کے باوجود میری فطرت کے اس خونخوار پہلو سے واقف نہیں تھے جس کی نشوونما ان خطرناک ایجنٹوں کے حالات زندگی نے کی تھی۔ جو ایک ایجنٹ کی حیثیت سے اپنا تاریخ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ گویئز تو کورڈیل کے سربراہ سے ملاقات کرنے جا رہا تھا لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں تھا کہ میں سربراہ پر ہاتھ ڈال کر کورڈیل کے بقیہ افراد کا بھی صفایا کر سکوں۔ میں تیار ہو کر اپنے ہوٹل سے نکل آئی تھی۔

مطلوبہ جگہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ ایک بہتر جگہ پہنچ کر میں نے انفرا ریڈ لینس والی دوربین نکالی جس کی مدد سے رات کے اندھیرے میں بھی دن کی روشنی کی طرح دیکھا جا سکتا تھا۔ دوربین کی مدد سے اس نے اس محل نما مکان کو دیکھا جو بے حد خوب صورت بنا ہوا تھا۔ مکان کا ایک حصہ دور تک سمندر میں چلا گیا تھا اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لہریں پوری قوت کے ساتھ مکان سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے اس مکان کے جائے وقوع کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے اس سڑک کی طرف دیکھا جو دور سے بل کھاتی چلی آ رہی تھی۔

پھر میرا کام خود بخود شروع ہو گیا۔ میں نے دو تیز روشنیاں دیکھیں جو اس سڑک پر بڑھتی آ رہی تھیں ان کا رخ اس مکان کی طرف تھا۔ چھ دروازوں والی لیموزین مکان تک پہنچی اور اس کے کھلے ہوئے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ میں نے لاکھ کوشش کی لیکن اندازہ نہیں ہو سکا کہ لیموزین میں کتنے افراد ہیں۔ میں مسلسل مکان اور اس کے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس مکان کی تین گارڈز حفاظت کر رہے تھے جن میں ایک بڑے گیٹ پر، دوسرا سمندری دیوار کے قریب اور تیسرا چھت پر متعین تھا اور نپے تلے قدموں سے گشت کر رہا تھا۔ اس دوران مسٹر بارلے کے مطابق ایڈلن گویئز مجھے باقاعدہ سگنل دے رہا تھا۔ ابھی مجھے گویئز کی طرف سے تیسرا اشارہ موصول ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ گویئز پوری محنت سے اپنا فرض سرانجام دے رہا ہے اور کسی پریشانی کا شکار نہیں ہے۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا جب اچانک گویئز کی طرف سے تیز اور مسلسل سگنل موصول ہونے لگے۔ اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ گویئز خطرے میں پڑ گیا ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ گویئز کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ کافی ایکٹو اور پھرتی سے عمل کرنے والا ایجنٹ ہے۔ اگر وہ مدد کی ضرورت محسوس کر رہا ہے تو یقیناً کوئی بہت خطرناک بات ہوئی ہے۔ پروگرام کے مطابق مجھے یہ خطرے کو نظر انداز کر کے اس وقت گویئز کی مدد کرنی تھی چنانچہ میں نے برق رفتاری سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کسی بلی کی طرح برق رفتاری سے محل نما مکان کی طرف دوڑی۔ مکان کے چاروں طرف آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ بس سمندر کی طرف سے راستہ تھا لیکن ادھر سے جانا ناممکن تھا۔ چنانچہ اب صرف گیٹ رہ جاتا تھا۔ جو لیموزین کے اندر جانے کے بعد بند نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے

چھت پر ٹہلتے گارڈ پر نظر ڈالی وہ سامنے والے حصے کی طرف آ کر لوٹ رہا تھا اس کے اوجھل ہوتے ہی میں نے گیٹ کی نگرانی کرنے والے گارڈ کے سینے کا نشانہ لیا اور میرے ایل سی ایٹ سے لگاتار دو شعلے نکلے اور گارڈ کے سینے میں دل کے مقام پر دو سوراخ ہو گئے۔ وہ لڑکھڑایا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے پھرتی سے اندر دوڑ لگا دی تھی۔ اس کے بعد دوسرا خطرہ چھت والے گارڈ سے تھا۔ لیکن اس کے لیے چھت پر جانا ضروری تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ چھت پر جانے کے لیے لوہے کا ایک زینہ گیٹ کے پاس سے اوپر جاتا تھا۔ ایک لمحہ توقف کے بعد میں نے بجلی کی سی تیزی سے لوہے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گئی۔ گارڈ کو شاید سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دے گئی تھی وہ فوراً فاصلہ طے کرنے کے بجائے جہاں تک پہنچا تھا وہیں سے پلٹ پڑا۔ مگر ایل سی ایٹ اُسے بھی چاٹ گیا۔ اپنے نشانے پر مجھے ناز تھا۔ اس دوسرے گارڈ کو ختم کر کے میں اس کی طرف لپکی۔ اصل میں گوئیز کی طرف سے ملنے والے سگنلوں نے مجھے خونخوار بنا دیا تھا اس کی حفاظت ضروری تھی کیونکہ مجھے اس سے آگے چل کر بہت کام لینے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر گارڈ کے پاس پڑی اسٹین گن اٹھالی۔ ان حالات میں یہ پستول زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ اسٹین گن کا میگزین چیک کر کے میں چھت کے کنارے پہنچی سر کے جھانک کر نیچے دیکھا۔

دوسرے لمحے میرے پورے ذہن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ وہاں تقریباً آٹھ دس گارڈ کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی گنیں سیدھی کی ہوئی تھیں اور ایک شخص کو نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے بلی جیسی تیز آنکھوں کے سامنے نشانہ لیتے ہوئے شخص کو دیکھا۔ اس کا اوپری جسم برہنہ تھا۔ ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے تھے۔ برہنہ بدن میں ڈوبا ہوا تھا اسے تشدد کے بعد ہلاک کیا جانے والا تھا۔

سو فیصدی یہ ایڈلن گوئیز ہی تھا۔ اس وقت کوئی تاخیر، کوئی سوچ گوئیز کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ فائرنگ اسکواڈ اس کو چھلنی کرنے کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا دوسرے لمحے میرے ہاتھوں میں دبی اسٹین گن قہقہے لگانے لگی۔ بہت مہارت سے یہ کام کرنا تھا کیونکہ گوئیز بھی گولیوں کی زد میں آ سکتا۔ گارڈز کی سراسیمہ چیخیں ابھری گئیں آخری چیخیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو بچ گئے تھے لیکن یہاں وہ کسی طرح کیا کر نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخے۔

''نہیں۔ نہیں رک جاؤ۔ نہیں پلیز۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنی گنیں پھینک دیں۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ ان پر گولیاں برسانے والے کتنے افراد ہیں اور کون ہیں۔ ورنہ شاید وہ گنیں اس طرح نہ پھینکتے۔ لیکن گوئیز نروس نہیں ہوا اس نے زمین پر لوٹ لگائی اور برق رفتاری کے لڑھکتے ہوئے پھینکی ہوئی اسٹین گنوں میں سے ایک گن اپنے قبضے میں کر لی۔ شاید انھیں لوگوں نے اس پر تشدد کیا تھا اور اس آخری کام یعنی ختم کرنے کے لیے لائے تھے۔ چنانچہ گوئیز نے اسٹین گن سیدھی کر کے فائر کیے۔ اور ان میں سے ایک کو للکار دیا۔ میں برق رفتاری سے گن سنبھالے نیچے اتر گئی۔

''نہیں۔ دوسرے کو نہ مارنا۔ میں اپی پارک ہوں۔'' گوئیز رک گیا۔ اور میں زندہ بچ جانے والے گارڈ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ وحشت سے کانپ رہا تھا۔ میں نے گوئیز کی طرف توجہ نہیں دی اور اپنا پستول اس کی کھوپڑی سے لگاتے ہوئے کہا۔

''لیموزین پر کون آیا تھا؟''

''وہ......وہ میں اس کا نام نہیں جانتا۔ یہاں کسی کا نام کوئی نہیں جانتا بس ان کے کوڈ ہوتے ہیں۔''

''اس کا کیا کوڈ ہے۔''

''گولڈن کراس''......وہ کورڈیل کا چیف ہے۔''

''اس کے ساتھ اور کون تھا۔''

''سلور شارک۔ وہ عورت ہے۔ چیف کے بعد کی عہدیدار۔''

''آج کوئی میٹنگ ہے یہاں؟''

''ہاں وہ۔ گارڈ نے کہا۔ لیکن وہ تاک میں تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے کرائے کا ایک ہاتھ میری بغل میں مارا۔

الگ بات تھی کہ اس کے وار سے بچنے کے لیے میں نے پینترا بدلا اور بالکل اتفاقیہ پستول کے ٹرائیگر پر میری انگلی دب گئی اور ایک افسوسناک کام ہوا۔ گوییز جو اچانک اپنی جگہ سے ہٹا تھا اس گولی کا شکار ہو گیا۔ گولی اس کی پیشانی سے گزر کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔

گارڈ نے موقع دیکھ کر مجھ پر چھلانگ لگائی۔ بے شک میں گوییز کے حادثے سے متاثر ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے دانت پچپچا کر بلیک ہٹ لگایا اور گارڈ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے منہ سے خون ابل پڑا تھا۔ لیکن میں اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے گوییز کے پاس بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ گوییز کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور پھر اس نے دم توڑ دیا۔ میرے ہونٹوں سے ایک افسوس بھری آواز نکل گئی۔ اس وقت ایک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں بل کھا کر اٹھی لیکن کار کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکی۔ دوسرے لمحے وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔ افسوس میری یہ کاوش کامیاب نہیں ہو سکی اور وہ لوگ صاف نکل گئے۔

اتنی بڑی محل نما عمارت کی تلاشی لینا ناممکن تھا۔ لیکن میں نے اس کا تھوڑا سا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ ایک انتہائی کارآمد آدمی مارا گیا تھا اور وہ بھی تھوڑی سی غلطی سے۔ مجھے اس کا افسوس تھا۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب کیا کیا جا سکتا تھا۔

محل نما عمارت کا جائزے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھے یہی امید تھی۔ ظاہر ہے اتنی بڑی آرگنائزیشن کے لوگ بے وقوف نہیں تھے۔ انھوں نے صرف ایک جگہ کو اپنی تمام کارروائیوں کا مرکز نہیں بنایا ہوگا۔ اپنے کاغذات اور دوسری چیزیں انھوں نے حفاظت سے رکھی ہوں گی۔

اب یہاں رکنا بیکار تھا۔ لیکن ایڈلن گوییز کی لاش کے بارے میں اطلاع دینا ضروری تھا۔ میں نے مسٹر بارلے کو یہ بُری خبر سنائی تو چند لمحات کے لیے وہ گم ہو گیا۔ پھر بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب وہ اس جگہ کو استعمال نہیں کریں گے۔''

''شاید۔''

''اوکے، میں دیکھتا ہوں۔ بارلے نے کہا پھر جلدی سے بولا۔ ''کیا آپ وہاں میرا انتظار کریں گی۔''

''نہیں'' میں نے حتمی طور پر جواب دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن گیارہ بجے بارلے نے مجھے فون کیا۔ ''مجھے یقین تھا آپ جاگ رہی ہوں گی۔''

''جی مسٹر بارلے۔''

''ہمیں گوییز کی موت کا بہت افسوس ہے۔ ہمیں دوسری لاشیں بھی مل گئی ہیں۔ باقی عمارت سے کوئی کارآمد چیز نہیں ملی۔ ویسے گوییز کی موت بہت بڑا سانحہ ہے۔ کورڈیل کی سرگرمیاں کئی ملکوں میں بڑی تشویش کے ساتھ دیکھی جا رہی ہیں۔ البتہ میں آپ کو ایک خصوصی اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں۔''

''جی۔'' بتائیں۔

''آپ کے بارے میں صرف ہماری حکومت ملوث ہے۔ دوسرے ملکوں کو آپ کے بارے میں نہیں بتایا گیا ہے ہم ذرا ہٹ کر آپ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی حکمت عملی ہے۔''

''جی۔ میں سمجھ گئی۔''

''آپ کو اس امر کا خیال بھی رکھنا ہے۔''

''میں خیال رکھوں گی۔ لیکن اس بارے میں کیا ہو رہا ہے۔''

''ہاں۔ میں وہی بتانا چاہتا ہوں۔ اس وقت برطانیہ میں تقریباً اٹھائیس افراد اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ جن میں برطانوی اور امریکی مشترکہ کام کر رہے ہیں اور یہ اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ آئندہ ہفتے برسلز میں فضائیہ، بحریہ اور زمینی

افواج کے بڑے افراد گیم وار کے بارے میں میٹنگ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ عمارت سے ساری لاشیں اٹھوا کے اسے سیل کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔''

''جی۔''

''یہ نام آپ کے لیے بہت کارآمد ہے اور خصوصی طور پر اسے آپ کو بتایا جا رہا ہے۔''

''یہ کون ہے۔'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''ان خاتون کا نام ایم روسٹر ہے۔ یہ کمیونیکیشن وژن سے منسلک ہے اور خصوصی حیثیت رکھتی ہے۔ امکان ہے کہ وہ کوئی کال پکڑنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اس پر توجہ ضروری ہے۔''

''لیکن خاص پیغامات تو کوڈ ورڈز میں ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''مجھے اس کا پتا بتائیے۔''

''آٹھ سو تیس بروکلین اسٹریٹ۔''

''ٹھیک ہے۔ اور کچھ؟''

''اپنا خیال رکھیے، ضروری سمجھیں تو آپ کو سیکورٹی دی جا سکتی ہے۔''

''نہیں شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا اور تیاریاں کرنے لگی۔ مجھے ایک گاڑی دے دی گئی۔ اس عمارت کو تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ یہ سات منزلہ عمارت تھی۔ نیچے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں ان میں سے ایم روسٹر کے نام کی تختی بھی نمایاں تھی۔ میں تیزی سے اوپر چڑھ گئی اور مطلوبہ جگہ تلاش کر لی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں اطلاع دیے بغیر اندر جاؤں۔ یہ ایک غیر مہذب عمل تھا لیکن کبھی کبھی دل صحیح رہنمائی بھی کرتا ہے۔

میں نے دروازے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ دروازے کے دوسری طرف چھوٹا سا پیسج تھا پھر ڈائننگ ہال میں بہت خوب صورت فرنیچر اور آرائش کی دوسری قیمتی اشیاء موجود تھیں۔ شیشے کی ایک میز قابل توجہ تھی جس پر بڑی سی ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ یہ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ ابھی میں کمرے کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ باہر سے ایک آواز سنائی دی۔ غالباً کسی نے داخلی دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے برق رفتاری سے کمرے کا جائزہ لیا۔ پوشیدہ ہونے کے لیے کافی جگہیں تھیں۔ میں ایک پردے کے پیچھے چلی گئی اور میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔

کوئی دروازے سے اندر آیا تھا۔ میں نے گنجائش کر کے اسے دیکھا۔ وہ اچھی خوب صورت عورت تھی عمر پچیس سال کے قریب ہو گی۔ خوب صورت لباس میں ملبوس تھی۔ اسے کسی کی موجودگی کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان سے شیشے کی ٹاپ والی میز کے پاس جا بیٹھی۔ پھر اس نے میز کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا پھر اسے لائٹر سے سلگا کر دو تین گہرے گہرے کش لیے۔ میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ آخری فیصلہ کر کے میں پردے کے پیچھے سے باہر آ گئی۔ اس نے فوراً مجھے دیکھ لیا اور بُری طرح چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے سگریٹ ایش ٹرے پر رکھا اور کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ میں نے دونوں ہاتھ سیدھے کھڑے کیے اور نرم لہجے میں بولی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آئی۔ بیٹھ جاؤ۔''

''کون ہو تم؟'' وہ بولی۔

''میرا نام اینی پارک ہے۔ شاید میرا نام تمہارے علم میں ہو۔''

''اوہ مجھے آج ہی بتایا گیا۔''

''تفصیل کے ساتھ۔'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔ کسی حد تک۔''

''گڈ۔'' ٹھیک تب تم مجھے بیٹھنے کے لیے کہوگی۔''

''سوری۔آؤ بیٹھو۔میں کس قدر نروس ہوگئی تھی۔'' میں آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی نظر آرہی تھی۔وہ گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لے کر میرے بارے میں اندازے قائم کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

''تمھیں پتا چل گیا ہوتا کہ ایڈمن گونیز مرچکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں،معلوم ہے۔''

''گڈ تم اچھی بچی ہو۔مجھے ایسے لوگ پسند ہیں جو صورت حال کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس پر بدترین تشدد کیا گیا تھا۔اور اس کے علاوہ بھی سمندر کے کنارے کی عمارت میں مزید بہت سے لوگوں کو مارا گیا ہے۔''

''ہاں۔یہ پوری رپورٹ مجھے مل چکی اور مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انھیں تم نے ہلاک کیا ہے۔''

''بالکل ٹھیک خبریں پہنچی ہیں تمہارے پاس۔لیکن میں مزید ایک قتل اور نہیں کرنا چاہتی۔''

''میں نہیں بھی۔'' وہ بولی۔

''میرا مطلب تم سے ہے۔اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو مجھے مجبوراً تمھیں بھی جہنم رسید کرنا ہوگا۔'' میں نے اس کا چہرہ زرد ہوتا محسوس کیا۔پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو۔''

''تمہارے اپنے بارے میں۔لیکن وہ جو تمہارا اصل کام ہے اور جس کے لیے تم بڑی اہمیت رکھتی ہو اور سنو! جھوٹ نہیں زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔

''میں ایک کلب کے لیے کام کرتی ہوں۔وہاں لوگوں کو نشہ آور ادویات کا عادی کر کے ان سے غیر قانونی کام کرائے جاتے ہیں۔میں اس میں معاونت کرتی ہوں۔لیکن یقین کرو میں خوشی سے یہ سب نہیں کرتی۔بس تقدیر نے اس چکر میں پھنسا دیا ہے۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ پر بہت بڑا قرض ہوگیا تھا۔اور میں اس کی ادائیگی کے لیے سخت پریشان تھی۔پھر ایک شخص مجھے ملا اس نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی اور میں اس کے جال میں پھنستی ہی چلی گئی۔اس نے مجھ سے بہت سے غیر قانونی کام کرائے۔اس نے مجھے تمہارے بارے میں بھی اطلاع دی کہ تم اس سے خطرناک ہو اور ممکن ہے کہ تم مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''اس شخص کا تعلق کورڈیل سے ہے۔''

''ہاں۔میں اس کے لئے بھی کام کرتی ہوں۔''

''لازمی بات ہے میں تم سے پوچھوں گی کہ تم اس کے لیے کیا کرتی ہو۔''

''میں ان کے لیے باہر سے آنے والے پیغامات ڈی کوڈ کرتی ہوں۔وہ مجھے بہترین معاوضہ دیتے ہیں۔وہ جو کچھ کررہے ہیں اسے ملک وقوم کی خدمت کہتے ہیں۔''

''کیا تمھیں میری آمد کی توقع تھی؟''

''تھوڑی دیر پہلے مجھے اس بارے میں خبر دی گئی تھی کہ ممکن ہے تم مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''ویری گڈ۔مگر مجھ سے باخبر ہیں وہ لوگ۔اور کیا کہا تھا انھوں نے۔''

''یہی کہ جونہی تم آؤ میں پچھلے کمرے کی کھڑکی کھول کر وہاں سے سرخ روشنی کا سگنل دوں۔''

''دن کے وقت روشنی کا سگنل۔'' میں نے بے یقینی انداز میں کہا۔

''ہاں۔انھوں نے کہا کہ وہ دیکھ لیں گے۔''

''تو پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔''

''م۔میں سخت خطرے میں ہوں۔میں ایک بزدل لڑکی ہوں۔ان لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے یہی خوف رہتا ہے کہ ضرور کسی وقت میں موت کے جال میں گرفتار ہو جاؤں گی۔حالانکہ مجھے ان سے کافی بڑی رقم ملتی ہے۔مگر میں یہ سب کچھ مجبوراً کرتی ہوں۔''

''تب پھر تم اپنے لیے کچھ کرلو۔''

''م،میں،میں کیا کروں۔''

''انھیں پروگرام کے مطابق سرخ روشنی کا سگنل دو۔''

''ایں؟''وہ حیرت سے بولی۔

''ہاں۔جلدی کرو،میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔بعد میں تم ان سے کہہ دینا کہ میں نے تمھیں پستول سے کور کررکھا تھا۔

''یہ بہت خطرناک ہے۔وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''دوسری طرف میں تمھیں نہیں چھوڑوں گی۔''میں نے پستول نکال کر سفاک لہجے میں کہا۔وہ بادل نخواستہ کھڑی ہوگئی۔میں اسے پستول سے کور کیے دوسرے کمرے میں پہنچی وہاں سے اسے سرخ سگنل دینا تھا۔یہ سگنل ایک انفراریڈ ٹارچ سے دیا گیا اور دوسری طرف سے اس کا جواب گرین روشنی سے مل گیا۔میں نے اسے دوسرے کمرے میں چلنے کے لیے کہا اور پھر وہاں سے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔مجھے اندازہ تھا کہ ضرور کوئی آئے گا۔اس کے لیے لائحہ عمل میں لیا تھا۔

بالکل صحیح اندازہ تھا۔کچھ ہی لمحوں کے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں دروازے کی آڑ میں ہوگئی۔دروازہ اب بھی کھلا ہی ہوا تھا۔آنے والا یہی سمجھا کہ ایم روسٹر نے اس کے لیے دروازہ کھولا ہے۔وہ ہاتھ میں مشینی پستول لیے اندر داخل ہوا۔میں اپنا پستول لیے تیار تھی۔میں نے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا لیکن پستول کا دستہ قوت سے اس کے شانے پر پڑا اور اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔اس دوران میں نے اس کے پاؤں پر اپنے سینڈل کی ایڑی ماری اور وہ بلبلا گیا۔

دونوں وار زبردست تھے۔اس نے تیسرا وار بھی پستول کے دستے سے کیا تھا جو بھرپور طاقت سے اس کے سر پر پڑا تھا۔اس نے درد سے کراہ کر اپنا پاؤں اٹھایا لیکن توازن قائم نہ رکھ سکا اور نیچے گر پڑا۔میرے لیے کافی تھا۔میں نے اچھل کر ایک ٹھوکر اس کی کنپٹی پر ماری اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔دوسری ٹھوکر اس کے لیے کافی ہوئی اور وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

''کک۔کیا یہ مرگیا؟''روسٹر کے منہ سے گھگھیائی ہوئی آواز ابھری۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ویسے یہ کون ہے تم اسے ضرور جانتی ہوگی۔''

''یہ بھی اس کلب میں کام کرتا ہے۔مگر میں اس کا نام نہیں جانتی۔''

میں اس کے پاس بیٹھ کر اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی۔لیکن وہاں کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی۔تب میں سیدھی کھڑی ہوگئی۔مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ لوگ میرے ہر عمل سے واقف ہیں۔یہ سوچنے میں وقت نہیں صرف کیا جاسکتا تھا کہ اس واقفیت کا مرکز کیا ہے۔اب ان کے بارے میں اندازہ لگانا تھا کہ وہ کیا کررہے ہیں اور باہر نکل کر کیا کرنا ہوگا۔

''تم اس کا خیال رکھنا۔میں باہر جا کر دیکھتی ہوں۔''

میں نے روسٹر سے کہا۔اور باہر چل پڑی۔لیکن میں محتاط تھی۔کہیں سے بھی مجھ پر حملہ ہوسکتا تھا۔میری گاڑی حفاظت سے سامنے کھڑی تھی۔لیکن مجھے دو گاڑیاں اور نظر آئیں جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھیں جب میں یہاں

آ کر رکی تھی۔

میں گھوم کر اپنی گاڑی کے پاس آ گئی پھر دروازہ کھول کر اندر بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں نے فوراً دونوں گاڑیوں کو اسٹارٹ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے میرا اندازہ ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو تو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ روسٹر کی رہائش گاہ پر ان کے ساتھی کے ساتھ کیا ہوا لیکن میرے باہر آنے پر انھیں یہ اندازہ ضرور ہو گا کہ میں صاف نکل آئی ہوں۔

پھر اچانک میں نے اپنی کار کی رفتار طوفانی کر دی۔ سڑک صاف تھی اور کسی طرح کا ٹریفک نہیں تھا۔ آگے جا کر سڑک دو طرفہ ہو جاتی تھی اور اس کی شاخیں مخالف سمتوں کو چلی گئی تھیں۔ ایک شاخ کا خاتمہ آگے چل کر ایک خوب صورت نقلی برج پر ہوتا تھا جبکہ دوسری شاخ سیدھی چلی گئی تھی۔ میں نے اپنی کار کا رخ اس طرح بدلا جیسے میں برج والی سڑک پر جا رہی ہوں۔ لیکن بالکل کنارے پر جا کر میں نے پورا اسٹیرنگ گھمایا اور بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ میری کار شفاف سڑک کی طرف آ گئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ آگے والی کار میرے ڈاج میں آ گئی اور برج والی سڑک پر گر گئی۔ جبکہ دوسری کار نے دو شانے کے قریب بریک لگا دیے تھے اور چند سیکنڈ کے اندر سے میں نے آگے جانے والی کار کو ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ برج سے ٹکراتے ہوئے دیکھا۔ نارنجی شعلوں کا مرغولہ بلند ہوا اور انسانی چیخیں سنائی دیں۔

اس دوران دوسری کار صورت حال کا جائزہ لے کر برج والی سڑک پر مڑی لیکن اس طوفانی رفتار کے ساتھ نہیں جس رفتار سے دوسری کار گئی تھی جو حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ البتہ اس دوسری کار کے ڈرائیور کو میں داد دیے بغیر نہ رہ سکی جن نے زبردست قدم اٹھایا تھا۔ آگے کافی دور جا کر وہ سڑک بھی گھوم کر اسی سڑک سے آملتی تھی جس پر میں جا رہی تھی۔

اچانک وہ کار اس راؤنڈ اباؤٹ سے گھوم کر میرے سامنے آ گئی۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگائے تھے۔ لیکن میں حواس باختہ نہیں ہوئی اور میں نے فوراً پستول نکال کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔
ابتداء میں تو میرے فائر کارگر نہیں ہوئے لیکن پھر دو گولیوں نے ونڈ اسکرین توڑ دیا اور چاروں طرف کرچیاں بکھر گئیں۔ پھر ایک گولی ڈرائیور کے کان کے قریب اور دوسری اس کی کھوپڑی پر پڑی۔ ساتھ ہی کار جھپک کر اس کی طرف بڑھی۔

میری کار اسٹارٹ تھی۔ اور دماغ حاضر، میں نے کلچ پر سے پاؤں ہٹا دیا اور کار ایک جمپ لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس میں بچت ہوئی تھی ورنہ دوسری کار میں گھس ہی جاتی۔ اب تعاقب کرنے والی کار سڑک کے دوسری طرف جا کر سڑک کے کنارے ایک سنگی مجسمے سے ٹکرا گئی تھی۔

میرا وہاں رکنا خطرناک تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس پہنچ جائے گی اور میرا سارا کام خراب ہو جائے گا میں نے اک لمحے میں ایک بہترین فیصلہ کیا۔ اور اس راؤنڈ اباؤٹ سے کار گھما دی۔ جدھر سے دوسری کار حد آئی ہوئی تھی۔ پہلی تباہ شدہ کار کے اب بھی شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں اس کے پاس سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لوگ اب اس طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ رک کر کار میں بیٹھے لوگوں کے بارے میں معلوم کرنا بہت بڑی حماقت تھی۔ البتہ میں پچویشن سے فوری طور پر میرے ذہن میں آیا کہ روسٹر کی خبر لے لوں۔ نہ جانے اس بے چاری کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑ گیا اور میں تیزی سے اس کی طرف چل پڑی۔ ٹھیک اس جگہ کار کو روک کر میں نیچے اتری اور تیز رفتاری سے ایم روسٹر کی رہائش گاہ پہنچ گئی۔ حیرت کی بات تھی کہ دروازہ اس وقت بھی کھلا ہوا تھا۔ میں پستول سنبھال کر اندر داخل ہو گئی پھر میں نے روسٹر کو آواز دی۔ ایک بار، دو بار تین بار لیکن جواب نہیں ملا۔ پھر میں روسٹر کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔ اور پھر اس نے گہری سانس لی۔ روسٹر بستر پر مڑی تڑی پڑی تھی۔ ایک نگاہ میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ اور یہاں اس کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

☆☆☆

برٹش سیکرٹ سروس کے چیئرمین نے میرا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ وہ دراز قامت اور مضبوط جسم کا مالک تھا اور اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی بہت سے کام ہماری توقع سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ تمہارے بارے میں مجھے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ تم ایک نوجوان خوب صورت سی لڑکی ہو۔ لیکن ذہین اور اعلیٰ کارکردگی کی مالک۔ لیکن تمہیں دیکھ کر شدید حیرت ہوئی ہے۔''

''کیوں سر۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیونکہ تم سے ملاقات کرنے والا اگر تمہارے بارے میں جانتا ہو تو تمہیں ایک حسین لڑکی کے علاوہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ جس سے صرف محبت کی جاسکتی ہے۔''

''شکریہ سر۔''

پھر کام کی باتیں شروع ہوگئیں۔ ہر سیک مین نے مجھے ہر طرح کی سہولت مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ اور میری ضرورت کے مطابق مجھے سیکرٹ سروس کا ریکارڈ مہیا کردیا۔ اس دوران وہ متعلقہ امور پر مجھ سے گفتگو بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''میں پہلے سے کہتا ہوں مس پارک کہ ایم روسٹر اس سلسلے میں اکیلی نہیں ہوسکتی۔''

''آپ کا کیا خیال ہے سر۔''

''سیکرٹ سروس میں کوئی کالی بھیڑ ضرور موجود ہے۔ جس نے اس کوڈ بک کی فراہمی پر اکسایا ہے۔''

''مجھے آپ سے اتفاق ہے سر۔'' میں نے مسٹر سیک مین سے اتفاق کیا۔

''ساحل سمندر کے کورڈیل کے مرکز سے کچھ بھی نہیں ملا۔ البتہ وہاں سے کچھ نام ضرور ہاتھ لگے ہیں جن میں ایک نام نمایاں ہے۔''

''وہ کون سر۔''

''اس کا نام لی موش آرگر ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی شخص کورڈیل آرگنائزیشن کا چیف کنٹرولر ہے۔ اور باقی دوسرے ملکوں کے اعلیٰ ترین نامور لوگ ہیں جن میں سے زیادہ تر فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ لی موش آرگر امریکی فوج میں شامل تھا اور وہ ویت نام کی جنگ میں نمایاں کارکردگی دکھا چکا ہے۔''

''گڈ۔'' سر ایک نام اور ہے جو اہمیت کا حامل ہے۔''

''تم یقیناً مسز لینا فورڈ کا نام لوگی۔ اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ اسے تلاش کرکے فوراً گرفتار کرلیا جائے۔ مگر وہ غائب ہوگئی ہے اور ابھی تک اسے تلاش نہیں کیا جاسکا۔ لیکن میں نے اعلیٰ کارکردگی کے مالک سیکرٹ سروس کے کچھ افراد کو اس کلب کی نگرانی پر لگا دیا جو پراسرار کارروائیوں کا مرکز ہے۔''

''ویری گڈ۔ میں خود اس کلب کے بارے میں سوچ رہی تھی اور میں اس کا جائزہ ضرور لوں گی۔ میں سیکرٹ سروس کے ریکارڈ کا مسلسل جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ اچانک میری نگاہ ایک تصویر پر پڑی اور میں چونک گئی۔ میں نے تصویر والا فائل اٹھالیا۔

''مسٹر سیک مین نے بھی مجھے چونکتے دیکھ لیا اور بولے۔'' کوئی خاص تصویر ہے۔''

''جی سر۔ میں وہی شخص ہے جسے اس نے ایم روسٹر کے فلیٹ پر زخمی کیا تھا اور جو وہاں کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

سیک مین نے اس تصویر سے منسلک فائل دیکھتے ہوئے کہا۔'' جیک ملٹن۔ اوہ یہ شخص ہماری سیکرٹ سروس میں شامل ہے۔ ایک اعلیٰ کارکردگی کی مالک فوجی، جس کا سروس ریکارڈ بہترین ہے۔

''اس کے بارے میں کچھ اور......؟''میں نے سوال کیا۔

''اور کوئی خاص بات نہیں۔''

''اس وقت یہ کہاں ہوگا؟''

''گزشتہ دو ہفتوں سے یہ چھٹی پر ہے۔''

''اسے مستقل چھٹی پر جانا ہوگا۔اس کی رہائش گاہ کا مکمل پتہ مجھے چاہیے۔میں نے اینا سے کہا تھا کہ میرے سیل پر اشارہ موصول ہوا۔میں نے معذرت کے ساتھ اپنا سیل آن کیا۔تو دوسری طرف سے ترموداوانچی کی آواز آئی۔

''تم ٹھیک ہو بے بی۔''

''جی بالکل۔''

''ایک اہم واقعہ ہوگیا ہے جس کی تفصیل انتہائی خفیہ رکھی جارہی ہے کیونکہ اگر یہ تفتیش منظرِعام پر آجائے تو دنیا میں تہلکہ مچ جائے۔

''بتانا پسند کریں گے کہ انکل۔اور یہ بھی کہ مجھے اس بارے میں فوری اطلاع دینا کیوں ضروری ہے جبکہ میں ایک اہم کام میں مصروف ہوں۔''

''کار میں سارترے کا خیال ہے کہ اس ...... تمہاری واقفیت ضروری ہے کیونکہ تم جس مشن پر کام کررہی ہو یہ عمل اس سے متعلق ہوسکتا ہے۔

''بتائیے۔''میں نے کہا۔

''ایک امریکی سب میرین کو سمندر میں اغوا کرلیا گیا ہے جس پر چار ایٹمی میزائل بھی ہیں۔آبدوز کو بڑے ڈرامائی طریقے سے اغوا کیا گیا ہے۔اور ایک اہم بات کارمیل کے ذہن میں ہے...... کہ ردعمل اس طرح کے کاموں میں آج کل زیادہ سرگرم ہے۔ایک طرح کے یہ تنظیم کسی ایک ملک کے تحت نہیں بلکہ اس نے اپنا مرکز الگ ہی بنا رکھا ہے۔ اور ہر ملک سے اپنے مفادات حاصل کررہی ہے۔زیادہ تر تاوان کی شکل میں۔

''یہ تو بہت سنسنی خیز واقعات ہیں۔پاپا کو یہ انفارمیشن کہاں سے حاصل ہوئیں۔

''سارترے اس وقت کسی بھی طرح دنیا کے خطرناک ترین لوگوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔دنیا کو اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔لیکن وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہونے والی ہر طرح کی سیاسی، ایٹمی اور سائنسی سازشوں سے واقف ہے۔آبدوز کا اغوا انتہائی خفیہ رکھا گیا ہے لیکن بہت سی خفیہ کوڈ ورڈز میں اہم ملک ایک دوسرے سے رابطہ کیے ہوئے ہیں اور شدید سنسنی کا شکار ہیں۔لیکن سارترے کی ناقابل یقین صلاحیتوں نے حقیقت جان لی ہے۔ انھوں نے یہ پیغامات ہیک کرکے انھیں ڈی کوڈ کیا ہے۔

''مائی گاڈ۔''میں نے کہا۔

''تمھیں یہ اطلاع ہونے دی گئی کہ یہ کورڈیل آرگنائزیشن بھی اس عمل میں ملوث ہوسکتی ہے۔اور چونکہ تم اس کے خلاف کام کررہی ہو اس نے اغوا کی اس سازش کا بھی خیال رکھنا جس کی تیار کردہ دنیا کی کسی خطرناک حادثے کا شکار ہوسکتی ہے۔

''ٹھیک ہے انکل۔''میں نے کہا۔

''اس سلسلے میں چند نام جوان خفیہ پیغامات میں سامنے آئے ہیں انھیں ذہن نشین کرلو۔ترموداوانچی نے کہا۔

''جی انکل۔''میں نے کہا اور وانچی وہ نام دہرانے لگے۔

☆☆☆

(اینی پارک...... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔
اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

ایک تصویر، ایک کہانی

ہم کسی سے کم نہیں



کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب ..... بھاگ گئے نا آپ لوگ ۔ اگر کرکٹ اور ہاکی میں رسوائی اور ناکامی کا دھبہ ہی دیکھا ہے تو اب پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب والی مثال ..... سو فیصد درست ثابت ہو گئی ہے ۔ بھاگ ..... بھاگ ..... اور بھاگ ..... بھاگ بھاگ کر کھیلنے والے اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا ۔ زیر نظر تصویر ہمارے ملک کے نامور کھلاڑی ثاقب حنیف کی ہے ..... جن کا شمار ان ہی خوش نصیبوں میں ہوتا ہے ..... ثاقب حنیف جو پاکستان کے ایک بڑے کلب کے نامور گول کیپر ہیں ۔ انہوں نے ناروے میں اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیا ہے ۔ یاد رہے ثاقب حنیف پاکستان کے دوسرے کھلاڑی ہیں جو ناروے کے ٹاپ ڈویژن کلب کے لیے کھیل رہے ہیں ۔

تو پھر سچ ہے نا ..... کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب

قانون خاموش ہے

سید ملازم حسین شیرازی

ایسے سفاک جرم کی چشم کشائی' جس کی سزا ہمارے قانون میں بہت کم ہے

یہ واقعہ آج سے چار سال قبل وقوع پذیر ہوا۔

صوبہ پنجاب کے ضلع بھکر سے راولپنڈی جاتے ہوئے 20 کلومیٹر کے فاصلے پر موضع کہاوڑ واقع ہے۔ جو سڑک کے دونوں اطراف پھیلا ہوا ہے۔ سارا علاقہ ریتیلا ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے مکانات ہیں۔ چھوٹے مکانات چھوٹے زمینداروں کے ہیں۔ کہاوڑ کی گلیاں کچھ پختہ کچھ نیم پختہ ہیں۔ گلیوں میں نکاسی آب کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ بارش ہونے کی صورت میں پانی دنوں کھڑا رہتا ہے۔ شام ہی سے ویرانی چھا جاتی ہے۔

یہاں کی عرصہ دراز سے مقیم ایک فیملی میں فوتگی ہوئی۔ مرنے والی ایک نوجوان لڑکی تھی جسے کینسر کا مرض تھا وہ اسی مرض میں فوت ہوئی۔ اسے اس کے ورثا نے اسی بستی میں واقع قبرستان میں دفن کیا۔ یہ قبرستان بستی سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دوسری صبح اس کے ورثا رواج مطابق قبر پر فاتحہ پڑھنے اور گل پاشی کرنے گئے۔ دیکھا تو قبر اکھڑی ہوئی تھی۔ ساری مٹی ریت قبر کے برابر پڑی تھی۔ اور اس میں دفن شدہ لاش غائب تھی۔ لواحقین نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ لوگ جمع ہو گئے بہت حیران اور عبرت پکڑے ہوئے تھے۔ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ لاش کہاں غائب ہوئی؟ کون لے گیا؟ قبر کے ارد گرد کسی جانور کے قدموں، پنجوں کے نشانات ناپید تھے۔ لاش کی باقیات مفقود تھیں۔ لوگ نزدیک دور تلاش میں نکل پڑے لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ ورثاء اور لواحقین کی آہ و بکا اور دردناک چیخیں دور دور سنائی دے رہی تھیں۔ آخر بستی سے دور دس کلومیٹر کے فاصلے پر تحصیل دریا خان کے تھانے کو اطلاع دی گئی۔ پولیس باخبر ہوئی۔ ان کے لیے یہ لمحہ فکریہ تھا۔ پولیس حرکت میں آ گئی۔ تھانے میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ لوگ توبہ استغفار کر رہے تھے۔ کبھی ایسا واقعہ سننے یا پڑھنے میں نہ آیا تھا۔

پولیس کے افسران اور اہلکار جائے وقوعہ پر پہنچے۔ تفتیش شروع ہوئی۔ شکستہ قبر کا ملاحظہ کیا گیا اردگرد کے مقیم لوگوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔

کہاوڑ موضع کے درمیان میں مین روڈ سے ذرا ہٹ کر ریلوے لائن ہے جہاں اس لائن پر راولپنڈی سے ملتان ٹرین چلتی ہے۔ کہاوڑ میں اسٹیشن تو نہیں ہے۔ لیکن ریلوے پھاٹک ضرور ہے۔ جہاں ہمہ وقت ریلوے چوکیدار موجود رہتا ہے اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ رات بارہ بجے دو بھائی جو اسی گاؤں کے رہائشی ہیں۔ کندھوں پر گینتی۔ کدال لیے پھاٹک کراس کر گئے۔ زیادہ تشویش کی بات اس لیے نہ تھی کہ گاؤں میں لوگوں کی اپنی زمینوں کو پانی دینے کے لیے آمد و رفت رہتی ہے۔ رات یا دن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا جن جن کی



پانی کی باری ہو وہ اپنی زمینوں کو سیراب کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

ایس ایچ او نے ان مذکورہ بھائیوں کے گھر کا پتا معلوم کیا، انھیں بتایا گیا کہ ان کی رہائش نزدیک ہی کی گلیوں میں ہے۔ پھاٹک چوکیدار نے پولیس کو ان کے گھر کی نشان دہی کی۔ پولیس نے فوراً وہاں پہنچ کر اسی گلی کے درمیان میں واقع نیم پختہ گھر پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بھائیوں میں سے ایک بھائی نے دروازہ کھولا۔ وہ 24/25 سال کا جوان العمر تھا۔ پہلے تو پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کے چہرے اور حرکات سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت ہراساں تھا۔ چونکہ اس گھر میں خواتین نہ تھیں پولیس اس کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ دو کمروں پر محیط مکان تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا جس میں تین چار چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک کمرہ کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ دوسرا کمرہ کھلا تھا۔ پولیس اس کمرے میں داخل ہوئی تو ان کو گوشت کے گلنے سڑنے کی بدبو محسوس ہوئی۔ چولہے پر ہانڈی چڑھی تھی اور نیچے لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اس چولہے کے نزدیک چادر کے نیچے کوئی چیز ڈھانپی پڑی تھی۔ سڑاند اس سے آرہی تھی۔ پولیس نے چادر کو ہٹایا تو سب کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ اس فوت ہونے والی لڑکی کی لاش تھی جو سڑ چکی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ کو کاٹ دیا گیا تھا اور اسی کا گوشت استعمال میں لانے کے لیے پک رہا تھا۔

یہ ایک خوف ناک اور عجیب منظر تھا۔ جس نے بھی یہ صورت حال دیکھی دہشت زدہ ہو گیا۔ پولیس نے فوراً اس شخص کو گرفتار کر لیا جس نے اعتراف کیا کہ یہ لاش اسی مرنے والی لڑکی کی ہے جسے قبر سے نکالا گیا ہے۔ اسی لاش سے کٹا ہوا گوشت پک رہا تھا۔ جسے انھوں نے کھانا تھا دوسرے بھائی کے بارے میں پوچھا گیا تو پتا چلا وہ نزدیک ہی دکان پر گیا ہے۔ سپاہی کو دوڑایا گیا وہ اسے گرفتار کر کے اسی گھر میں لایا۔ ادھوری لاش کو پولیس اور مقامی معزز لوگوں نے باعزت طریقے سے دفنایا اور

پولیس ان مجرموں کو لے کر تھانے روانہ ہوئی۔ لوگوں کا ہجوم ساتھ تھا جسے بھی پتا چلا وہ تھانے پہنچ گیا۔ سارا علاقہ سخت پریشانی اور خوف میں مبتلا تھا۔ سب لوگ توبہ استغفار کر رہے تھے۔

تھانے میں مجرموں کو لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔

اسی دوران ضلع بھکر، تحصیل دریا خان، و دیگر ملحقہ شہروں اور قصبوں کے افسران، ناظم اور دیگر ذمہ داران پہنچ گئے۔

تھانے میں مجرموں سے پوچھ تاچھ شروع ہوئی۔

پولیس ''تم دونوں آپس میں کیا لگتے ہو؟''

ملزم '' ہم دونوں سگے بھائی ہیں۔'' دونوں کے چہروں مہروں سے ڈر خوف گھبراہٹ دکھائی نہ دے رہی تھی کوئی پریشانی پشیمانی نظر نہ آتی تھی بلکہ ان کی باڈی لینگویج سے پتا چل رہا تھا کہ انھیں کسی چیز کی طلب ہو رہی ہے جو ان کے سوکھے ہونٹوں سے دکھائی دے رہا تھا۔

پولیس '' گھر میں جو ہانڈی چڑھی تھی اس میں کیا پک رہا تھا۔''

ملزم۔'' تھانیدار صاحب۔ آپ نے خود دیکھا ہانڈی میں گوشت پک رہا تھا۔'' بڑے بھائی نے بے خوف و خطر جواب دیا۔

پولیس۔''وہ گوشت کس چیز کا تھا؟''

ملزم۔''سر آپ نے جو لاش دیکھی تھی اس کی ٹانگ کا گوشت پکا رہے تھے۔''

پولیس افسر۔ پیر پر اسٹک مارتے ہوئے بولا۔ ''ذلیل انسان تمہیں معلوم تھا کہ وہ مردہ عورت کینسر کی مریضہ تھی۔ سارا جسم پہلے سے گل سڑ چکا تھا۔ ایسے میں......''

ملزم ان کی بات کاٹتے ہوئے۔ بڑے بھائی نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''سر ہمیں اس سے غرض نہیں کہ لاش کی کیا حالت تھی ہمیں تو مردہ گوشت کھانے سے رغبت ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ مریض ہو یا صحت مند ہو۔''

پولیس، پولیس افسران اور باقی موجود لوگ ان کی بے حسی ہٹ دھرمی پر بہت حیران تھے۔ اور یقیناً ان کے لیے یہ پہلا موقع نہ تھا اور وہ اتنے انسانیت سوز ظلم پر بھی نادم نہ تھے اور برملا اعترافِ جرم کر رہے تھے۔

پولیس نے بے اختیار کہا۔'' ذلیل کمینو۔ ایسا وحشیانہ پن تو جانور اور مردار خوار بھی نہیں کرتے۔ تم یہ سب کب سے کر رہے تھے۔''

ملزم کا چھوٹا بھائی بولا۔'' جناب چار سال سے یہ کام کر رہے تھے۔''

پولیس۔'' کتنے مردوں کو اب تک اپنے وحشیانہ پن کا شکار کر چکے ہو۔''

ملزم۔ ہم تقریباً دو سو کے قریب مردے کھا چکے ہیں۔

نہایت حیرانگی اور عبرت پکڑتے ہوئے۔ افسر بولا۔''200 مردوں کو کھا چکے ہو۔''

ملزم۔''جی ہاں۔''

پولیس۔''ایسا کیوں کر رہے تھے۔ اور کب سے یہ قیامت ڈھا رہے تھے؟''

ملزم۔ ہمارا ایک بھانجا ہے جو جھنگ شہر میں (بھکر سے 130 کلومیٹر) اپنی ماں یعنی ہماری بہن کے ساتھ رہ رہا ہے۔ وہی ایک دفعہ ہمارے لیے پکا ہوا گوشت لایا تھا۔ عجیب ذائقہ تھا ہم نے بڑی رغبت سے کھایا تھا۔ اس میں عجیب لذت تھی۔ ہم نے اس کی بڑی تعریف کی اور بھانجے سے کہا وہ دوبارہ ایسا گوشت پکا لائے۔ کچھ دنوں بعد وہ دوبارہ گوشت لایا جو پہلے سے بھی زیادہ مزیدار تھا۔ ہم نے اس سے استفسار کیا کہ ایسا گوشت کہاں سے ملتا ہے؟ اور وہ کیسے پکاتے ہیں؟''

پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا اور پھر ہمارے بے حد اصرار پر بتایا کہ دراصل یہ مُردہ لوگوں کا گوشت ہے۔ یہ سن کر پہلے تو ہمیں کڑواہٹ محسوس ہوئی اور بہت عجیب لگا لیکن چونکہ ہم اس کی لذت سے محظوظ ہو چکے تھے لہٰذا اس پر غور نہ کیا۔

بھانجے نے مزید بتایا کہ وہ قبروں سے تازہ اور دفنائی لاشیں نکالتے ہیں پھر گھر میں محفوظ کر لیتے ہیں اس کی ماں اسے پکاتی ہے۔ یہ ہمارا روز کا معمول ہے جس روز کا ناغہ ہو ہماری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اور سخت اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔

چونکہ ہمیں گوشت کھانے کی عادت ہو چکی تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنے تیئں علیحدہ کارروائی کرنے کا بنانے کا پروگرام بنایا اس طرح ہم نے اپنے گاؤں سے آغاز کیا جس دن

فوتگی نہ ہوتی ہم دوسرے دن قصبوں شہروں کا رخ کرتے۔''
یہ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
''خبیث لوگو۔ تمہیں ڈر نہ لگتا تھا کہ کسی دن پکڑے جاؤ گے تو تمہارا کیا حشر ہوگا اور دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤ گے۔''
''ہمیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن پکڑے جائیں گے۔ وارداتیں ضرور ایک نہ ایک دن افشا ہوں گی۔ لیکن ہم اس کے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتے تھے ہم عادت کے ہاتھوں مجبور تھے۔''
''یہ تمہاری عادت نہیں بلکہ سارے کنبہ کی فطرت بن چکی ہے۔''
سارے ضلع کی پولیس بہت پریشان تھی قانون کی دفعات دیکھی جارہی تھیں۔ علماء سے رابطہ کیا جارہا تھا۔ یہ واقعہ سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل رہا تھا۔ اخبارات، ریڈیو، ٹی وی سب خبریں نشر کررہی تھیں۔ ویڈیو فلمیں بن رہی تھیں۔ پرنٹ/ الیکٹرانک میڈیا، بین الاقوامی میڈیا موقع واردات پر پہنچ رہے تھے۔ دھڑا دھڑ اخباری ٹی وی نمائندے ملزمان سے رابطہ کررہے تھے۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں تھے۔ ایسی انہونی اور دلخراش واردات کی کوریج کی جارہی تھی۔ قانون دان تعزیرات میں الجھے تھے کہ کن دفعات کی رو سے مقدمہ درج کیا جائے اور کارروائی عمل میں لائی جائے۔
قانون کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسی واردات ہوئی تھی اس بارے میں کوئی قانون وضع نہ تھا نا اس کی تشریح تھی۔ قانون میں لاش کی بے حرمتی کی دفعہ ضرور تھی جس کی سزا دو سال تھی لیکن لاش کو قبر سے نکالنا۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ اسے کھانا۔ اس کا اندراج اور تشریح نہ تھی۔ کوئی دفعہ نہ تھی۔
دوسرے دن ایس ایچ او نے ملزمان سے رابطہ کیا۔ چونکہ چوبیس گھنٹوں سے پولیس کسٹڈی میں تھے اب انھیں عدالت میں پیش کرنا تھا لیکن کچھ کھایا پیا نہ تھا لہٰذا پولیس نے ان سے پوچھا کہ چائے، روٹی، پانی جس چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔ فوراً بندوبست ہو جائے گا۔
یہ پیش کش سنتے ہی دونوں بھائی ہاتھ باندھتے ہوئی التماس کرنے لگے۔

تھانیدار صاحب ایک احسان فرمائیں ہمیں بھوک کی بہت اشتہاق ہے کھانے کی طلب ہو رہی ہے۔ گھر میں ہانڈی میں بچا کھچا گوشت ہوگا وہ ہمیں لا دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔''
یہ سنتے ہی پولیس والے اور باقی لوگ اپنا منہ پیٹنے لگے۔
اسی دن ان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے عدالت میں اپنے جرم کا اعتراف کیا اور کسی قسم کی پشیمانی یا شرمندگی ان کے چہرے سے عیاں نہ تھی۔ عدالت نے پولیس کو پانچ دن کا جوڈیشل ریمانڈ دیا تاکہ مزید تفتیش تحقیقات کی جائیں۔ اسی دوران جھنگ پولیس سے رابطہ کیا گیا تھا اور ملزمان کی بہن اور بھانجے کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے خلاف بھی اسی قسم کی قانونی / عدالتی کارروائی شروع کی گئی۔ انھوں نے بھی جرم قبول کیا تھا کہ وہ عرصہ چھ سال سے اس مذموم جرم میں ملوث ہیں۔
ملزمان ان دونوں بھائیوں کو عدالت میں چالان کے ساتھ پیش کیا گیا۔ وکیلوں کے بحث مباحثے تفتیش مقدمے کی تیاری آخر کار چھ ماہ بعد عدالت نے فیصلہ سنایا انھیں دو سال کی سزا دی گئی اس سے زیادہ سزا قانون میں نہ تھی۔
پارلیمنٹ نے اس طرف توجہ نہ دی۔ ایسی کارروائی کے سدباب کے لیے کوئی قانون وضع کرنے یا بنانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ کوئی ایسا قانون نہ بنایا گیا جس کی رو سے ایسے قبیح فعل کی سزا زیادہ سے زیادہ ہو۔
نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال بعد یعنی اپنی سزا پوری کرنے کے بعد وہ لوگ پھر ایسی واردات میں ملوث پائے گئے۔ پھر قبرستان۔ پھر مردے پھر ویسی کارروائیاں۔
وہ دونوں بھائی دوبارہ گرفتار ہو کر اپنی مختصر سزا کاٹ رہے ہیں۔ رہا ہونے کے بعد کیا ردعمل ہوگا قانون اس بارے میں خاموش ہے۔ بستی اور قرب وجوار کے معصوم لوگ آج بھی اس المناک واقعہ سے ڈر اور خوف میں مبتلا زندگی گزار رہے ہیں۔
آخر میں حکومتِ وقت سے استدعا ہے کہ ایسے المناک واقعہ کے پیشِ نظر قانون بنایا جائے جس کی رو سے ملزمان کو کم از کم سزائے موت دی جائے اور کوئی رعایت نہ کی جائے۔

☆☆☆

بکاؤ مال

محمد ندیم عباس میانی

اُس لڑکی کا زندگی نامہ جس کی خوب صورتی نے اسے بکاؤ مال بنا دیا تھا

شام کو عروہ جب دفتر سے ہوسٹل پہنچی تو ہوسٹل کی منیجر نے اسے ایک خط تھمایا۔ جو دوپہر کی ڈاک سے اس کے نام آیا تھا خط ہاتھ میں لیے وہ دیر تک اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ وہ حیران تھی کہ اسے یہ خط کس نے لکھا ہے۔ پچھلے پانچ برس میں اسے کبھی کسی نے خط نہیں لکھا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے والد کی وفات پر بھی کسی نے اسے ہمدردی کے دو لفظ تک نہ لکھے تھے۔ حالانکہ اس نے اپنے تمام رشتے داروں کو اس سانحے کی اطلاع دی تھی۔ وہ خط کھولے بغیر ہی اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ یہ خط کس کی طرف سے آیا ہے۔ اپنے قریبی رشتے داروں اور ساتھ پڑھنے والی سہیلیوں کو ایک ایک کر کے اس نے اپنے ذہن میں ٹٹولا مگر خط سے کسی کا رشتہ نہ جوڑ سکی۔ آخر چائے کی میز پر بیٹھ کر اس نے خط کھول ہی لیا اور اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں اس طرح چھلکتی گئیں جیسے برسوں کے رکے آنسوؤں نے بہنے کا راستہ تلاش کر لیا ہو۔ کپ میں پڑی چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ نہ تو خط ہی ختم ہو رہا تھا اور نہ ہی عروہ کے آنسو تھم رہے تھے۔ خط کا ہر لفظ جہاں آنکھ میں آنسو بن کر ٹپکتا وہاں اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ سر پر پھیرتا نظر آتا۔

اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی سسکیوں کے درمیان کبھی کبھی ابھرتی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ سے ایسا لگتا تھا جیسے مسلسل بہنے والے آنسوؤں میں دو چار آنسو خوشی کے شامل ہوں۔ میز سے اُٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور کولر سے دو گلاس پانی پی کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اور پہلے سے طے شدہ رات کی ملاقات کے بارے میں سوچنے لگی۔

اسے مہینے میں تین چار ایسی ملاقاتیں جھیلنی پڑتی تھیں یہ کام گویا کہ اس کی نوکری کا حصہ بن چکا تھا لیکن اس کام کے عوض اسے اس ''ملاقات'' کے الگ سے روپے ملتے تھے۔ اس کی کمپنی والے اس سے بہت خوش تھے کیونکہ وہ سلم و سمارٹ تھی۔ خوب صورتی میں یکتا و بے مثال تھی۔ کمپنی کی طرف سے اسے مشہور ترین ہوسٹل میں عالی شان کمرہ اور زندگی کی ہر سہولت میسر تھی۔ یہ سب مراعات کمپنی کی طرف سے تھیں۔

اس نے اپنے دستی پرس سے ایک کاغذ نکالا اس پر وہ پتا دیکھا جہاں آج رات کی ملاقات آنے والے نیو افسر سے تھی جو کہ کمپنی سے بہت بڑی ڈیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا جس پر پتا درج تھا آفس میں چپڑاسی نے مالک کمپنی کی طرف سے اُسے تھمایا تھا۔ عروہ چند لمحے اس پتے کو دیکھتی رہی پھر اس کے پرزے پرزے کر دیے اور بستر پر لیٹ گئی۔ اسے آج

عجیب سی اپنائیت کا سکون مل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر خط کو نکالا اور دوبارہ غور سے پڑھنے لگی۔

اب خط کو پڑھتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے بلکہ اب خط کا ہر لفظ اسے شفقت کا سایہ دار شجر لگ رہا تھا۔ جس کی گھنی چھاؤں میں بیٹھنے کے لیے وہ ترس چکی تھی۔ خط پڑھ لینے کے بعد جب وہ اسے بیگ میں رکھنے لگی تو اسے بچپن کی وہ تصویر نظر آگئی جس میں وہ اپنے پاپا کی گود میں بیٹھی تھی۔ ساتھ اس کی ماں کھڑی تھی۔

یہ تصویر اس مکان کے برآمدے کی تھی جو ان کا اپنا تھا لیکن اب نہ ماں رہی تھی نہ پاپا اور نہ وہ گھر تھا۔ وہ اکیلی تھی بالکل اکیلی...... یہاں تک کہ اب اس کا ظاہر جسم بھی اپنا نہ رہا تھا اور وہ بھی اکثر اپنے وجود سے الگ خیالات کے بے آب وگیاہ صحرا میں بھٹکا کرتی تھی۔

اس تصویر کو دیکھ کر عروہ کی آنکھیں ایک بار پھر بغاوت کرنے لگیں۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ ایف اے کے سالانہ امتحان میں آخری پرچہ دے کر خوشی خوشی گھر لوٹی تھی لیکن اسی شام ایک اندوہناک خبر نے گویا ان کے پُرسکون نشیمن پر بجلی گرا کر اسے خاکستر کر دیا تھا۔ وہ حواس باختہ اپنی ماں کے ہمراہ اسپتال پہنچی، جہاں اس کے پاپا کو پہنچایا گیا تھا۔ پاپا کی حالت دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور اس کی ماں چکرا کر گر پڑی تھی جو کئی گھنٹوں تک بے ہوش رہی تھی۔ اس کے پاپا کی دونوں ٹانگیں غائب تھیں۔ پتا چلا کہ وہ اپنی فیکٹری سے جہاں وہ اکاؤنٹینٹ تھے۔ چھٹی لے کر اپنے نجی کام سے کہیں جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم کے پل سے گزرنے کے بجائے وہ دوسری طرف اتر کر پٹریوں پر سے گزر رہے تھے جہاں تیزی سے آتی ٹرین ان کی ٹانگوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔

تیسرے روز وہ اسپتال سے گھر لائے گئے دیکھتے ہی دیکھتے گھر کی جمع پونجی ساز وسامان علاج کی نذر ہو گیا مکان تک رہن رکھ دیا گیا۔

غریبی نے اپنے سائے پھیلائے تو اپنے بھی پرائے ہوتے چلے گئے۔

کس کو پڑی تھی کہ وہ تین افراد کا بوجھ اٹھاتا؟



غریبی میں تہمت اور حسن کی قیمت لگنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے اور عروہ تو ویسے بھی حسن و جمال کا پیکر تھی اس پر یہ بھید تب کھلا جب بھوک وشدت کی خاطر اس کی ماں نے کوئی اور راستہ نہ پاکر اسی فیکٹری میں دس ہزار کی معمولی تنخواہ پر نوکری پر لگا دیا جہاں وہ آج لاکھوں میں کھیل رہی تھی۔ روپیہ پیسہ اس کی پاؤں کی دھول بن چکا تھا۔ شروع میں پڑوسیوں اور رشتے داروں نے خوب باتیں بنائی تھیں کیونکہ اس معاشرے میں لڑکیوں کی نوکری کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بس طرح طرح کی باتیں تھیں۔

صرف ایف اے پاس کو نوکری کہاں سے مل گئی؟ جبکہ یہاں تو گریجویٹ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ ''کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو گی۔''

ان طعنوں سے تنگ آ کر ماں نے تو مر کر چھٹکارا پا لیا تھا لیکن عروہ اور اس کے پاپا خاموشی سے الفاظ کے ان تیروں کو سہتے رہے۔

اس کے پاپا نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ عروہ کو دیکھتے ہی رونا شروع کر دیتے تھے۔ جب وہ رات کو دیر سے گھر لوٹتی تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر چپ چاپ سسکتے تھے۔ لوگ اب ان سے کترانے لگے تھے۔ اور عروہ تو اس کھوٹے سکے کی طرح ہو چکی تھی جسے لوگ طاق میں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ رشتے داروں کو شاید اب انہیں رشتہ دار کہنے بھی شرم آتی تھی۔

عروہ اکثر سوچتی رہتی تھی کہ وہ زیادہ غلطی پر بھی نہیں تھے۔ اسے خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ ذہنی طور پر بوڑھی ہو گئی تھی اس پر جوانی کی بہار، ہزاروں امنگیں، احساسات و جذبات آنے سے پہلے ہی بڑھاپا آ گیا تھا اس نے کئی بار اپنی زندگی کو ختم کرنے کی ٹھانی تھی لیکن اپنے معذور پاپا کی وجہ سے ایسا نہ کر پائی تھی وہ دیر تک اپنے پاپا کے پاس بیٹھتی، ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہتی۔ انہیں نہلاتی دھلاتی ہر طرح کی دیکھ بھال کرتی...... لیکن ان سے بات کرنے کو ترستی رہتی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بول نہیں سکتے تھے مگر انہوں نے خود ہی اپنی زبان کو تالے لگا رکھا تھا۔ وہ اکثر بیٹھی سوچتی کہ اس کے پاپا کیوں نہیں بولتے؟ پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتیں کہ وہ بات کریں بھی تو کیا؟ یہ کیا کم تھا کہ وہ سب کچھ دیکھ کر بھی زندہ تھے۔

☆☆☆

پھر ایک دن جب انہیں وکیل کا نوٹس ملا کہ یہ مکان انہیں خالی کرنا پڑے گا تو اس کا جی ایک بار پھر مرنے کو چاہا۔ وہ اپنے اپاہج باپ کو آخر کہاں لے کر جائی؟ رات بھر اس کے کان سائیں سائیں کرتے رہے۔ رات بھر گھر کے سناٹے۔ میں اس کے دل پر ہتھوڑے چلتے رہے۔ جیسے رات بھر کوئی پوچھتا رہا ہو۔ ''کہاں جاؤ گی اپنے اپاہج باپ کو لے کر؟'' تبھی اس کا باس اپنے مفاد کی خاطر فرشتہ بن کر ظاہر ہوا، جس مفاد کی وہ مہینے میں تین چار ملاقاتوں سے خمیازہ چکا رہی تھی۔

باپ، بیٹی کی حالت دیکھ کر خون کے آنسو روتا رہا۔ اک دن داعی اجل کو بھی رحم آ گیا۔ وہ خون ناک کے راستے ظاہر ہوا جس سے ان کے دماغ کی نس پھٹ گئی وہ عروہ کو تنہا ظالم سماج کے پنجوں میں بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔

وقت پر لگا کر اڑ گیا پل بھر میں پانچ سال بیت چکے تھے۔

عروہ نے تصویر کو پونچھ کر پھر اٹیچی بیگ میں رکھ دیا اور تیسری بار پھر خط ہاتھوں میں لیا۔ یہ خط اس کے پاپا کے کسی دور کے بھائی نما کزن کا تھا جو پہلے اسی شہر میں رہتا تھا۔ اس خط کے مطابق اب وہ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ اس نے عروہ کو اپنے پاس بلوایا تھا اپنی ساری شفقت اس خط میں انڈیل دی تھی۔ اپنی تحریر میں اپنے مرحوم بھائی کی روح سے معافی بھی مانگی تھی۔ اور ساتھ لکھا تھا۔ ''بیٹی! ان دنوں میرے حالات کچھ اچھے نہ تھے ورنہ......''

وہ سوچنے لگی، ورنہ میری زندگی کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ عروہ نے استعفیٰ لکھ کر پرس میں خط رکھا آج وہ بہت خوش تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ فیکٹری کی لڑکیوں سے بڑے

تپاک سے ملی سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی اپنے آفس میں پہنچی جہاں بڑے صاحب بے چینی سے ٹہل رہے تھے اسے دیکھتے ہی وہ چلائے۔

''یہ کیا حرکت ہے مس عروہ......؟ تمہیں پتا بھی ہے کہ تمہاری اس نافرمانی سے وہ شریف آدمی رات بھر تمہارا انتظار کرتا رہا۔''

''شریف آدمی۔'' عروہ نے استہزائیہ کہا۔

''ہاں وہ بھی آپ ہی کی طرح شریف آدمی ہے۔'' آپ جیسے شرافت کا پیکر اپنے جائز و ناجائز کاموں کے لیے ہم جیسی مجبور لڑکیوں کے نہ ملنے پر شاید اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو پیش کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔ آپ کی نظروں میں پیسے سے بڑھ کر کوئی اور شے ہے ہی نہیں۔ یہ لیجیے میرا استعفیٰ۔'' جو وہ رات ہی لکھ چکی تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اور اپنے باس کو غصے میں کھولتا ہوا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ آفس سے باہر آ کر اسے احساس ہوا جیسے اس کے کندھوں پر...... پَر آ گئے ہیں اور وہ ان کے سہارے آسمان کی بلندیوں پر اڑی چلی جا رہی ہو...... وہ وہاں سے سیدھی اپنے ہوسٹل گئی انکل نما فرشتے کو کال کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی کہ وہ دوپہر کی گاڑی سے روانہ ہو رہی ہے۔

☆☆☆

تھکا دینے والے لمبے سفر، لاہور سے کراچی پہنچی تو انکل مع آنٹی کو اسٹیشن پر منتظر پایا۔ وہ جذباتی ہو کر ان کے گلے لگ کر خوب روئی۔ انھوں نے بھی خوب لپٹا کر پیار کیا۔

''چاند کا ٹکڑا ہے میری بیٹی۔ کیا رنگ روپ نکالا ہے اس نے'' آنٹی نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب غلط تھوڑی ہی کہتے تھے۔'' انکل نے کہا۔

''کون ملک صاحب'' عروہ نے چونک کر پوچھا۔

''ہیں ہمارے ایک دوست...... انھوں نے ہی ہمیں تمہارا پتا دیا تھا۔ وہ تو مرحوم بھائی کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور تم نے بھائی جان کے مرنے کی اطلاع ہی نہیں دی ورنہ ہم ضرور پہنچتے۔ اللہ اسے جنت نصیب کرے بہت نیک آدمی تھا۔ ویسے بیٹی ان دنوں ہمارے حالات ناساز تھے ادھر کراچی آ کر خدا کا کرم ہوا ورنہ لاہور میں تو گزارا مشکل ہو گیا تھا۔ تبھی بس تم سے انجان رہا۔ خیر بیٹی گزرا وقت بھول جاؤ اب تم دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ آؤ بیٹی گھر چلیں۔''

عروہ اتنی بڑی کوٹھی نما محل دیکھ کر حیران رہ گئی اور گھر کی آرائش دیکھ کر تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ورنہ تو وہ ہوسٹل کے روم کی آرائش تک ہی محدود رہی تھی اس سے پہلے اپنا غریب خانہ تھا۔ گھر کے لوگوں کی محبت نے اسے بے حد متاثر کیا۔ اب اس کے سارے زخم بھرنے لگے اس روز تو اسے بہت تعجب ہوا جب اس کی آنٹی نے اپنے گہنے اور کپڑے اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ ''بیٹی جو پسند ہوا اٹھا کر پہن لو۔''

ان کے بچے کسی دوسرے شہر میں ایک بورڈنگ اسکول میں پڑھتے تھے۔ عروہ کی دیکھ بھال کے لیے وہ دونوں اور کئی نوکر بھی تھے۔ ان سب کی خاطر مدارت سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہو۔

عروہ اپنی دوزخ جیسی زندگی سے نکل کر بے حد خوش تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں کی روٹھی ہوئی شفقت اب اسے گود میں اٹھائے پھر رہی تھی۔ وہ اب روز آئینے کے سامنے بیٹھ کر نت نئے کپڑے اور گہنے پہنتی اور آئینے میں خود کو دیکھ کر شرما جاتی۔

کھانے کی میز پر انکل و آنٹی اکثر کروڑوں اربوں کی باتیں کرتے وہ حیران رہ جاتی اور سوچتی کہ خدا نے اگر اس پر اتنے برس پہلے مہربانی کی ہوتی تو اس کی ماں بلک بلک کر نہ مرتی اس کا اپاہج باپ اس طرح خاموشی کو نہ اوڑھ لیتا اور وہ خود اس طرح پیسے والوں کے ہاتھوں کھلونا نہ بنتی۔

☆☆☆

گھر میں اکثر ملک صاحب اور ان کے دونوں بیٹوں کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ جن میں سے ایک ڈاکٹر اور دوسرا انجینئر تھا۔ ایک دن انکل کا فون آیا کہ ملک

صاحب کے گھر ڈنر ہے۔ یہ سنتے ہی جلدی جلدی تیاریاں ہونے لگی۔ عروہ کی آنٹی نے اسے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے دلہن کو تیار کر کے سجایا سنوارا جاتا ہے۔ عروہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر بہت خوش ہو رہی تھی کہ اس کی آنٹی اس سے کتنا پیار کرتی ہے۔

شام کو جب وہ ملک صاحب کے گھر پہنچے تو وہ وقت کہیں باہر گئے تھے ان کے دونوں بیٹے گھر پر تھے دونوں خاصے خوبرو تھے۔ عروہ جھکی جھکی چور نظروں سے کبھی ایک کو تو کبھی دوسرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس طرح آنٹی جان نے یہاں آنے سے پہلے تیار کیا تھا۔ اب یہ سوچ کر اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی کہ غالباً ان کا ارادہ ملک صاحب کے کسی بیٹے سے اس کا رشتہ طے کرنے کا ارادہ ہے۔ عروہ یہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ اگر اس کے سامنے دونوں کی تجویز رکھی گئی تو وہ دونوں میں سے کسے پسند کرے گی۔

وہ دونوں جب اس کی طرف دیکھتے تو اس کی نظریں شرم سے اور بھی جھک جاتیں۔ وہ آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے اس کا عروہ کو کوئی ہوش نہ تھا وہ تو بس اپنے خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر آج اس کے ماما پاپا ہوتے تو کتنے خوش ہوتے وہ اپنے خواب سے اس وقت چونکی جب ملک صاحب وہاں آئے۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونکی جیسے کہیں دیکھا ہو وہ ذہن پر زور دینے لگی وہ ان سب لوگوں کو ایک ایک کر کے یاد کرنے لگی۔ جن سے اس کا واسطہ پڑا تھا کئی چہرے اس کے ذہن میں ابھرے اور دھندلا گئے۔ وہ ملک صاحب سے ملتا جلتا کوئی چہرہ پوری طرح اپنے ذہن میں نہ ابھار سکی۔

''یہ ہماری بھتیجی ہے عروہ۔'' اس کے انکل جانے ملک صاحب سے مخاطب ہوتے کہا۔ ''اسی کا ذکر کیا تھا نا آپ نے؟؟؟؟''

''ہاں ہاں۔ جانتا ہوں۔ میں پہلے بھی مل چکا ہوں۔'' پھر وہ عروہ کی طرف جھکے۔ ''یاد ہے نا یا مس عروہ تمہارے باس کی پارٹی؟ اور وقار ملک؟''

فوراً تمام مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ کہیں وہ ملک صاحب تھے جس نے ہوس بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا جس کے نتیجہ برعکس نکلا تھا۔ وہ ایک سال پہلے ہونے والی پارٹی میں کھوگئی اور وہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کر کے اندر جا چکا تھا۔

''بڑے اچھے اور نیک آدمی ہیں ملک صاحب! انھوں نے ہی تمہارے انکل کو لاکھوں کا بزنس مین بنایا ہمیشہ روپیہ ہم پر پانی کی طرح بہایا ہے۔ اب ایک کروڑوں کا کام ہے۔ جو ان ملک صاحب کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر وہ تمہارے انکل جان کو مل جائے تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

ملک صاحب کے جانے کے بعد آنٹی نے عروہ سے سرگوشی میں کہا۔'' عروہ کے سامنے زندگی کی کتاب کا دوسرا باب ورق در ورق کھل کے سامنے آ رہا تھا۔

''بیٹی! یہی ملک صاحب ہیں جنھوں نے تمہیں تمہارا پتا دیا تھا ورنہ تم اس کال کوٹھری میں ذلت کی زندگی گزارتی رہتیں۔

اتنا سنتے ہی عروہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ شیطان نما انکل حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر لاڈ بھرے لہجے میں بولا۔

''بیٹی ہم تو تمہارا بھلا ہی سوچ رہے ہیں۔ ملک صاحب تو تمہیں اب باقاعدہ......''

''دیکھیے آپ کو اپنے کاروبار کے لیے ہم جیسی لڑکیوں کی ضرورت ہوسکتی ہے لیکن مجھے اپنے دھندے کے لیے آپ کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ آپ کی عزت افزائی اور یہ گہنے کپڑے میں سب آپ کے گھر پر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اپنوں سے بس غیروں میں ہی بہت ہوں۔''

یہ کہہ کر عروہ ان دونوں کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی۔

زندگی کا سفر دوبارہ جوڑنے کے لیے اب اس نے کراچی سے لاہور جانے والی ٹرین کا ٹکٹ لینا تھا۔

☆☆☆

تیسرا شعلہ

منظر، پس منظر



کرن شبیر

اُس جرم کی کہانی، جس کے مرتکب کہیں نہ کہیں ہم سب ہوتے ہیں

جس دن امی جان نے مجھے یہ کہا کہ شام کو چند مہمان آ رہے ہیں، تم ذرا اچھے کپڑے پہن لینا۔ تب مجھے احساس ہوا اب اس گھر سے رخصت ہونے کا وقت آنے والا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میرے لیے آنے والا پہلا ہی رشتہ قبول کرلیا گیا۔

میں ایک سال سے بی اے کرکے فارغ تھی۔ آگے پڑھنے کا مجھے کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ گھر والوں نے بھی اصرار نہیں کیا اور ان کا ارادہ بھی تھا کہ مناسب رشتہ دیکھ کر مجھے سوال بھیج دیا جائے۔ میرے لیے جو رشتہ آیا تھا وہ لڑکا ایک



پرائیویٹ فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔ آفس کی طرف سے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ تنخواہ بھی پرکشش تھی۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں فوت ہو چکی تھی۔ صرف دونوں باپ بیٹا ہی تھے۔

میں تیار ہو کر چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''ادھر آؤ بیٹی میرے پاس بیٹھو۔'' ایک نرم سی آواز سن کر میں نے سامنے دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ گورا چٹا خوب صورت آدمی تھا۔ جو اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان جو کہ اس آدمی کا ہم شکل تھا بیٹھا تھا اور بہت پرشوخ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں جھک کر وہیں کھڑی ہو گئی۔

''ادھر آؤ بیٹی۔'' اس آدمی کے دوبارہ کہنے پر میں اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ماشاء اللہ! بہت پیاری بچی ہے۔'' انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور ابو سے کہنے لگے کہ آج سے آپ کی بیٹی ہماری ہوئی۔ میں انکار نہیں سنوں گا۔''

پھر وہ مجھ سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتے رہے۔ ان کا لہجہ بہت شفیق اور مہربان تھا۔ میں بہت متاثر ہوئی اور پھر اسی دن میرا رشتہ پکا کر دیا گیا۔

☆☆☆

میرے شوہر کا نام فیصل بٹ تھا اور سسر کا نام وقار بٹ۔ وقار انکل فوج سے ریٹائرڈ تھے۔ شاید اسی لیے چاق و چوبند اور اسمارٹ لگتے تھے۔ وہ فیصل کے والد نہیں بڑے بھائی لگتے تھے۔ رشتہ ہونے کے چھ ماہ بعد میری شادی ہو گئی۔ میرے والدین نے اپنی حیثیت کے مطابق مجھے بہترین جہیز دیا۔ حالانکہ وقار انکل ساتھ ساتھ منع کرتے رہے تھے۔ شادی بھی دھوم دھام سے ہوئی اور میں اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آ گئی۔ میرا استقبال بہت شان سے ہوا۔ ولیمہ بھی شاندار تھا اور ایک مشہور ہوٹل میں تھا۔

ولیمے کے اگلے ہی دن ہم ہنی مون کے لیے نکل گئے۔ مری، سوات، کاغان ہر جگہ فیصل کے ساتھ اور حسین ہو گئی تھی۔ فیصل بے حد محبت کرنے والے اور کیئرنگ شوہر تھے۔ وہ تو میرے دیوانے ہو گئے تھے۔ میں بھی خوبصورت تھی مگر فیصل کی محبت نے مجھے اور حسین بنا دیا تھا۔ انھوں نے ڈھیروں شاپنگ کروائی۔ کسی نازک چیز کی طرح وہ مجھے سنبھالتے تھے۔ میں تو اپنی قسمت پر رشک کرتی تھی۔ پندرہ دن کے بعد ہم واپس آ گئے۔ ہم لوگ رات کو گھر پہنچے تھے۔ انکل سے مل کر ہم سو گئے۔ صبح انکل نے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دے کر ہمیں اٹھایا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر آئی تو سامنے ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا سجائے وہ ہمارے منتظر تھے۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی۔ وہ بے چارے ہمارے لیے کتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

''آئی ایم سوری انکل! آج اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ کل سے آپ کو ناشتا وقت پر ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں نہیں۔ ابھی تم نئی نویلی دلہن ہو۔ خوب گھومو پھرو، دعوتیں اڑاؤ، بعد میں سب کچھ تم نے ہی تو دیکھنا ہے۔'' انھوں نے شفقت سے کہا۔ فیصل بھی آ گئے تو ہم تینوں نے ناشتا کیا۔

''بیٹی! اب تم اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے مل آؤ۔ وہ اداس ہو رہے ہوں گے۔ اور کچھ تحائف بھی لائی ہو ان کے لیے یا اس کنجوس نے تمھیں شاپنگ ہی نہیں کرائی۔'' وہ مسکرا کر فیصل کو دیکھ رہے تھے۔

''ابو جی! آپ کی بہو نے تو میری خوب جیب خالی کرائی ہے۔'' فیصل نے کہا۔

امی ابو اور گھر والوں سے مل کر میں لوٹ آئی۔ اگلے چند دن دعوتوں میں گزرے اور اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔ فیصل کی چھٹی ختم ہو گئی اور میں نے گھر سنبھال لیا۔ فیصل نے آفس جانا شروع کر دیا۔

وقار انکل اپنی ڈائٹ اور صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہمارے اٹھنے سے پہلے وہ واک کرنے

آ چکے ہوتے اور اپنے لیے جوس نکال کر پی لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں فیصل اور اپنے لیے ناشتا بناتی۔ انھیں تیاری میں مدد دیتی۔ وہ چلے جاتے تو وقار انکل کمرے سے باہر آتے۔ میں ان کے لیے ناشتا بناتی اور وہ ناشتا کرتے، میں صرف ان کے پاس بیٹھ کر چائے پیتی تھی۔ کچھ دیر ہم دونوں باتیں کرتے، اخبار پڑھتے پھر وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے۔ میں صفائی کرتی، برتن وغیرہ دھو کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی وہ پھر میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ باتیں بہت اچھی کرتے تھے۔ ان کی معلومات حیرت انگیز پر تھیں۔ ہر موضوع پر انھیں عبور حاصل رہتا۔

دوپہر کو چونکہ ہم دونوں ہی ہوتے تھے۔ اس لیے ہلکا پھلکا کھانا بناتے تھے اور رات کو کھانے پر اہتمام ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آکر سو جاتی یا کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتی۔ فیصل کے آنے سے پہلے ہلکا پھلکا تیار ہوتی اور باہر جاتی۔ انکل بھی اپنے کمرے سے آجاتے۔ شام کی چائے ہم تینوں ساتھ پی کر انکل اپنے دوستوں سے ملنے ملانے اور واک کے لیے نکل جاتے۔ ہمارا کوئی پروگرام ہوتا تو باہر چلے جاتے ورنہ فیصل سے باتیں کرتے کرتے میں کھانا بنالیتی۔

رات کا کھانا نو بجے ہم تینوں ساتھ کھاتے۔ میں اور فیصل چہل قدمی کے لیے باہر چلے جاتے اور کچھ دیر بعد گھر آکر اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے چلے جاتے۔ چھٹی والا دن میں اور فیصل ایک ساتھ باہر گھومنے، امی کی طرف جانے یا پھر کھانا باہر کھانے میں گزارتے تھے۔ میری زندگی بہت خوب صورت تھی۔ میں رشک کرتی تھی اپنی قسمت پر، قدر دان شوہر، شفقت اور محبت لٹانے والا سسر، کوئی مالی تنگی نہیں۔ میں اپنے گھر کی مالک تھی۔ کسی ملکہ کی طرح خوش باش جس کی ہر بات پر ہر دوسرے سر تسلیم خم کرتے۔ میرے ماں باپ شکر ادا کرتے تھے کہ ان کی بیٹی اپنے گھر میں سکھی تھی۔

☆☆☆

میری شادی کو ایک سال ہونے والا تھا۔ وقار انکل نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کی سال گرہ دھوم دھام سے منائیں گے۔ ابھی تک مجھے ماں بننے کی خوش خبری نہیں ملی تھی۔ ہمیں اس بات کا کوئی احساس بھی نہیں تھا۔ فیصل تو کہتے تھے کہ کچھ عرصے گھوم پھر لیں زندگی کو انجوائے کرلیں اور ایک دوسرے کا ساتھ بھرپور طریقے سے محسوس کرلیں تب بچے کے بارے میں سوچیں گے۔ مجھے بھی کوئی فکر نہیں تھی۔ زندگی سکون سے رواں دواں تھی۔ فیصل اپنے والد کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابو نے امی کی وفات کے بعد صرف میری پرورش کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ ابھی تک عورتیں ان سے شادی کے لیے دلچسپی رکھتی تھیں اس لیے انھیں احساس نہ ہوا مگر میری شادی کے بعد وہ تنہا ہوگئے ہیں۔ میں خود بھی انکل کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ایک بیٹی کی طرح ان کا خیال کرتی۔ ان کی خوراک کا لباس کا دھیان رکھتی۔

گھر کے کام سے فارغ ہوکر اکثر ٹی وی دیکھتے تھے۔ کوئی نہ کوئی فلم روزانہ ہم دیکھتے اس پر تبصرہ کرتے۔ ساتھ ساتھ میں کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی۔ وہ بھی میری مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مجھے ڈھیروں دعائیں رہتے تھے۔ جب بھی میں میکے سے آتی میرا ماتھا چوم کر استقبال کرتے، ان کی تنہائی کے خیال سے میں رات نہ رکتی۔ غرضیکہ میں اپنے فرائض پوری طرح انجام دے رہی تھی کہ ہماری شادی کی سال گرہ کا دن آگیا۔

انکل نے بڑے پیمانے پر پارٹی کا انتظام کررکھا تھا۔ میرے گھر والے بھی شامل تھے۔ میں اپنے کمرے میں تیار ہورہی تھی۔ فیصل نے شادی کی سال گرہ پر مجھے سبز اور سرخ رنگ کی انڈین ساڑی لاکر دی تھی۔ جس کے ساتھ گولڈ کا خوب صورت سیٹ بھی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آج مجھے دلہن لگنا چاہیے اس لیے کہ آج تجدید شادی کی رات ہے۔

میں نے ساڑی استری کرکے بیڈ پر پھیلائی اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہن کر میک اپ کرنے لگی میرا

ارادہ تھا کہ میک اَپ اور ہیئر اسٹائل بنا کر ساڑی پہن لوں گی۔ ابھی بال تھوڑے سے گیلے تھے۔ میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی اور چہرے پر کریم لگا رہی تھی۔

''بیٹی فیصل کہاں۔'' مجھے انکل کی آواز سنائی دی اس سے پہلے کے میں کچھ بولتی وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ میں ایک دم مڑی وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر شرمندہ ہو گئے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں خود بھی شرمسار کھڑی تھی۔ چند لمحے میں اس احساس میں گھری رہی تھی کہ فیصل آ گئے۔

مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں سب بھول بھال کر تیار ہو گئی۔ پارٹی بے حد شاندار تھی۔ انکل نے ہم دونوں کو پچاس ہزار کا چیک دیا تھا کہ ہم اپنی مرضی کا گفٹ خرید لیں۔

''سب مہمان ہم دونوں کی جوڑی پر رشک کر رہے تھے۔ اگلی صبح چھٹی تھی۔ ہم دونوں بہت رات تک جاگتے رہے اس لیے صبح دیر تک سوئے۔ میری آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ میں اُٹھ کر باہر چلی آئی۔ فیصل ابھی سو رہے تھے۔

وقار انکل ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے سامنے ناشتا پڑا تھا مگر وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

''اسلام علیکم انکل۔'' میں نے سلام کیا تو وہ چونک پڑے۔

''آؤ بیٹی میں تمہارا انتظار کیے بغیر ناشتا شروع کر لیا۔ میں نے سوچا تم دونوں لیٹ اٹھو گے۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔ آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے میں آپ کے لیے تازہ چائے لاتی ہوں۔'' میں اپنے اور انکل کے لیے چائے لائی اور وہیں بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

حسب معمول اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خاموش سے تھے۔ شاید کل کی پارٹی میں تھک گئے ہیں تو میں نے سوچا۔ سوچا کے بعد وہ باہر چلے گئے۔ فیصل اٹھے تو ہم دونوں نے ساتھ ناشتا کیا پھر تحائف کھول کھول کر دیکھنے لگے۔ سب لوگوں نے بہت خوب صورت تحائف دیے تھے میں بہت خوش تھی۔

چند دن گزر گئے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ انکل چپ رہنے لگے ہیں۔ نہ تو میرے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے نہ پہلے جیسی بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ میں نے فیصل سے ذکر کیا انھوں نے انکل سے روٹین چیک اپ کے لیے اصرار کیا جو وہ کروا آئے۔ ڈاکٹر کے مطابق سب کچھ نارمل تھا پھر وہ خود بخود ٹھیک ہو گئے مگر ایک بات میں نے اکثر نوٹ کی کہ جب بھی اچانک کوئی کام کرتے کرتے میں ان کی طرف متوجہ ہوتی تو وہ بڑے غور سے میرے طرف دیکھ رہے ہوتے تھے۔ ان کی نظروں میں عجیب سی چمک ہوتی تھی۔

میں گھر میں کام کاج کرتے ہوئے اور باورچی خانے میں بہت کم دوپٹہ لیتی تھی۔ اگر لیا بھی ہوتا تو بے پروائی سے کاندھے پر پڑا رہتا تھا۔ ایک دوپہر میں فرش دھو رہی تھی۔ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ گھر کی مکمل صفائی کر لوں۔ آج شروع کی اور جب کمروں کے فرش دھو رہی تھی تو مجھے لگا جیسے کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ انکل اپنے کمرے میں تھے۔ میں نے اپنا وہم سمجھا اور تیزی سے فرش دھونے لگی۔ میرے سارے کپڑے گیلے ہو کر جسم سے چمٹ گئے۔ لان کا سوٹ پانی پانی ہو رہا تھا۔ آہٹ میں ایک دم سیدھی ہوئی تو دیکھا کہ انکل میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اور ان کی نظریں میرے وجود پر تھیں۔ مجھے متوجہ دیکھ کر تیزی سے کمرے سے چلے گئے۔ پہلی بار عجیب سے خوف کی ایک لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ میرا وہم میرا وہ خیال ہے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی وہ ٹھیک ہی تھا۔ انکل تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کی نظریں ایک باپ کی طرح نہیں رہے تھے۔ میں تو جیسے مرنے والی ہو گئی۔ یا خدا! میں کیا کروں میں سوچتی رہی۔ پھر جلدی سے کام ختم کیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس دوپہر میں نے کھانا نہیں بنایا۔ اپنے بیڈ پر بیٹھی سوچتی رہی۔ پتا

نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ انکل اندر چلے آئے۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟ آج کھانا نہیں بنایا۔'' وہ بے تکلفی سے میرے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے قریب پڑا دوپٹہ اٹھا کر کندھے پر ڈال دیا۔

''بس طبیعت سست ہے اس لیے کھانا نہ بنا سکی۔'' میں اٹھنے لگی۔

''ارے بخار تو نہیں ہے۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولے مجھے لگا جیسے کسی انگارے نے چھو لیا ہو۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آئیں میں کھانا بناتی ہوں۔'' میں ہاتھ چھڑا کر باہر آ گئی اور باورچی خانے میں جا کر پانی پینے لگی۔ میرا دل کانپ رہا تھا۔

''کھانا رہنے دو میں باہر سے کچھ کھا لوں گا۔'' انکل کی آواز آئی اور وہ گھر سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میری خوشیوں کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کو فیصل آئے تو میں نے امی کے گھر جانے کی ضد کی۔ وہ حیران و پریشان میری شکل دیکھتے رہ گئے پھر کچھ کہے بغیر امی کی طرف چھوڑ گئے۔ چار دن میں وہاں رہی۔ فیصل کا فون آتا آ جاؤ میں اداس ہوں۔ ابو بہت مس کر رہے ہیں۔ میں انہیں کیا بتاتی میں تو اپنی ماں کو بھی نہ بتا سکی۔ کون یقین کرے گا میری اس بات پر۔

کیا فیصل اپنے باپ کے خلاف کوئی بات سنے گا؟ کیا لوگ یقین کریں گے میرے گھر والے تو انکل کی محبت کو میری خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ ان سے کیا کہتی۔ اس خوف نے میری بھوک پیاس اڑا دی۔ پانچویں دن فیصل خود مجھے لینے آ گئے۔ امی کا کہنا تھا زیادہ دیر شوہر کو اکیلا نہیں چھوڑتے ہیں۔ میں سہمی ہوئی واپس آ گئی۔ دروازہ انکل نے کھولا۔ فیصل گاڑی کھڑی کرنے لگے۔ میں گاڑی سے نکل کر اندر کی طرف بڑھی۔

''ارے میری بیٹی! اتنے دن بعد آئی ہے ہم تو اداس ہو گئے تھے۔'' انکل نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ فیصل گاڑی کھڑی کر کے وہیں آ گئے اور مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ انکل نے دونوں بازوؤں میں مجھے تھام کر سینے سے لگا لیا اور میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر ماتھا چومنے لگے۔ پہلے بھی وہ میری پیشانی پر پیار کیا کرتے تھے مگر اس پیار میں ہوس نہیں تھی۔

فیصل اندر چلے گئے۔ میں نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی۔ میرے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں تیزی سے اپنا آپ چھڑا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ فیصل کپڑے تبدیل کرنے لگے تھے۔ ان کے سینے سے لگ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''جب اتنی اداس تھیں تو بتایا کیوں نہیں میں لینے آ جاتا۔'' فیصل نے کہا اور مجھے چپ کرانے لگے۔

میری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ انکل کو جب اس بات کا احساس ہو گیا کہ میں ان کی نیت بھانپ گئی ہوں تو وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ میں نے ان کے ساتھ ناشتا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب میں فیصل کے ساتھ ہی ناشتا کر لیتی اور اپنے کمرے میں آ جاتی اور ان کا ناشتا بنا کر ٹیبل پر رکھ دیتی۔ وہ باہر چلے جاتے تو گھر کا کام جلدی جلدی کر کے کھانا بنا لیتی۔ اب میں نے گھر کا کام کرتے ہوئے بھی دوپٹہ پھیلا کر لینا شروع کر دیا تھا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کیبل بھی نہ دیکھتی۔ کھانا بنا کر اپنے کھانا لے کر بیڈ روم میں آ جاتی۔ اب وہ میرے گریز کو تو سمجھ گئے تھے اسی لیے ذومعنی جملے بولنے لگے تھے۔ میں دوپہر کو بھی اپنا بیڈ روم اندر سے لاک کر لیتی تھی۔

رات کو کھانا تینوں ساتھ کھاتے تھے۔ فیصل کے سامنے وہ میرے بہت ناز اٹھاتے۔ فیصل خوش ہوتا کہ بہو اور سسر میں اتنی محبت ہے مگر میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ میں نفسیاتی مریض بنتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس رات مجھے بخار آ گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ فیصل نے مجھے صبح اٹھنے سے منع کر دیا اور خود ہی ناشتا بنا کر کرا لیا۔ مجھے پیراسٹامول دے کر چلے

گئے۔ مجھے بخار میں غنودگی طاری تھی کہ اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو انکل مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

''طبیعت خراب ہے تمہاری؟'' وہ ہمدردی سے بولے۔ ''فیصل مجھے کہہ گیا تھا تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر میں واش روم میں چلی گئی۔ بہت دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ پھر ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر باہر دیکھا تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ میں نے بھاگ کر دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ دوپہر تک بند کمرے میں بیٹھی رہی۔ شاید انکل نے ہی فیصل کو فون کر کے بلایا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے آئے اور مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

اگلے دو دن فیصل گھر پر رہے۔ میرا بخار ٹھیک تھا۔ کمزوری بہت ہوگئی تھی۔ فیصل میرا بہت خیال رکھ رہے تھے مگر ذہنی پریشانی اور خوف نے میری ساری رنگت خراب کردی تھی۔

تیسرے دن فیصل آفس گئے تو چند گھنٹوں کے بعد واپس آگئے۔ کہنے لگے کہ مجھے کمپنی کے ایک کام کے سلسلے میں فوراً فیصل آباد جانا ہے۔ کل شام تک آجاؤں گا۔''

میں پریشان ہوگئی۔ میں نے فیصل سے کہا کہ مجھے امی کی طرف چھوڑ دیں۔''

''ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انہیں اکیلا چھوڑنا اچھا نہیں لگے گا ان کا بی پی بہت ہائی ہوگیا ہے۔ بتا رہے تھے رات جاگتے رہے ہیں۔ میں بھی یہاں نہیں ہوں گا اور تم بھی چلی جاؤگی تو وہ کیا سوچیں گے۔''

میں خاموش ہوگئی۔ فیصل کا بریف کیس تیار کیا۔ وقار انکل کو جب فیصل نے اپنے جانے کا بتایا ہوگا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ میں ضرور میکے چلی جاؤں گی۔ اسی لیے بیمار ہونے کا بہانا کردیا۔

''یا خدا میری مدد فرمانا۔'' میں نے دعا مانگی۔

فیصل کے جانے کے بعد میں نے کھانا بنایا۔ انکل کے لیے کھچڑی پکائی۔ وہ کمرے میں لیٹے رہے۔ باہر نہیں آئے تھے۔ میں نے ٹرے میں کھانا رکھ کر ان کے کمرے میں دے دیا۔ انھوں نے خاموشی سے کھانا کھالیا۔ پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ کر باہر چلے گئے۔

آج ان کا رویہ بہت سنجیدہ تھا۔ شاید غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ بہرحال میں نے رات کا کھانا جلدی کھالیا۔ انکل نے دوائی کھائی اور کمرے میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے کہہ گئے کہ میں آرام کروں گا۔ کوئی کام ہو تو بتا دینا۔ اب تم بھی آرام کرو۔''

ان کا لہجہ پہلے جیسا مشفق تھا۔ میرے دل کو ذرا سی ڈھارس ہوئی۔ شاید خدا کو میری بے بسی پر رحم آگیا ہے۔

میں اپنے بیڈ روم میں کافی دیر ٹی وی دیکھتی رہی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرا میں نے اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ رات دس بجے کا ٹائم تھا جب دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔

''دروازہ کھولو سدرہ میں ہوں وقار۔'' انکل کی آواز سنائی دی تو میں تھر تھر کانپنے لگی۔ یا خدا میری حفاظت کرنا اس شیطان سے بچانا میں رونے لگی۔

''خدا کے لیے دروازہ کھولو میری طبیعت بہت خراب ہے۔'' اس بار انھوں نے التجا کی لہجے میں بھی شدید درد تھا۔ ''میرا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے دروازہ کھولو۔'' میں مشکل میں پڑ گئی کہیں واقعی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو۔ میں نے سوچا۔ مجھے دیکھنا چاہیے اگر کچھ ہوگیا تو فیصل کو کیا جواب دوں گی۔ مگر نہیں یہ بہروپیا ہے۔ ڈرامہ کررہا ہے۔ صرف دروازہ کھلوانے کے لیے۔ میرے دماغ نے کہا۔ میں دروازہ کھولتے کھولتے رہ گئی۔

پھر زور زور سے دروازہ بجا۔ ''مجھے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے وہ سدرہ بیٹی خدا کے لیے ایک

درد بھری کراہ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ سامنے کھڑے تھے۔

''کیا ہوا انکل۔'' میں نے ان کے قریب جا کر پوچھا۔ ''میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟''

انھوں نے ایک دم مجھے پکڑ لیا۔

میں نے انھیں زور سے دھکا دے دیا۔ وہ کسی کھلونے کی طرح لڑھکتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے چلے گئے۔ میں ششدر سی کھڑی تھی۔ پھر مجھے ہوش آیا کہ میں نے کیا کر دیا۔ میں تیزی سے نیچے اتری جا کر دیکھا کہ وہ اپنے ہی خون میں لت پت پڑے تھے۔ آسمان ہلا دینے والی چیخیں میرے منہ سے نکلیں، پتا نہیں میں کب تک چیختی رہی، آس پاس کے گھروں کے دروازے کھڑکیاں کھلنے لگیں اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔

مجھے ہوش آیا تو ان کا جنازہ تیار تھا۔ فیصل اور گھر والے آ چکے تھے۔ پتا نہیں کس نے فیصل کو اطلاع کی تھی۔ فیصل سے لپٹ کر میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ اپنا غم بھول کر مجھے سنبھالنے میں لگ گئے۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ اگلے دن میں ہوش میں آئی تو انکل کو اُن کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا تھا۔ فیصل کا صدمے سے برا حال تھا۔ اکلوتے بیٹے تھے، ماں کے بعد انکل ہی ان کا دنیا میں واحد اپنا رشتہ تھے۔ وہ تو جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ میں ہاسپٹل میں تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ شدید صدمے نے میرے دماغ کو متاثر کیا تھا۔ میں بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

امی مجھے اپنے گھر لے آئی تھیں۔ فیصل بھی میرے ساتھ تھے۔ چند دن بعد میری حالت سنبھلنے لگی تو پتا چلا کہ جب میں چیخ رہی تھی تو اردگرد کے لوگوں نے آوازیں سنیں اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے ہوش نہیں تھا۔ دیوار پھلانگ کر دو لڑکوں نے اندر سے دروازہ کھولا اور انکل کی لاش دیکھ کر فیصل کو فون کیا۔ انھوں نے آ کر میرے گھر والوں کو بلایا تھا۔ میں ساری بات سن کر چپ رہی۔

انکل کی موت کو ایک ماہ ہو چلا تھا۔ میں ابھی تک امی کے گھر میں ہی تھی۔ مجھے اپنے گھر سے خوف آتا تھا۔ ایک دن طبیعت خراب ہونے پر امی مجھے قریبی کلینک لے گئیں تو پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس خوش خبری نے جیسے ماحول کو ایک دم تبدیل کر دیا۔ میں اور فیصل بہت خوش تھے۔ میں اپنے گھر چلی آئی۔ فیصل کو اکیلے رہنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔

دن گزرتے رہے مگر میں اب بھی خوش نہیں تھی۔ ایک شخص کو قتل کرنے کا احساس میرے دل و دماغ پر حاوی رہنے لگا کیونکہ میری سہیلی نورین جو کہ ڈاکٹر ہے اس نے بتایا کہ جب دل کا دورہ پڑتا ہے تو انسان جس شے کو پکڑتا ہے تو بہت مضبوطی سے جکڑ لیتا ہے۔ گویا میں نے مغالطے میں انکل کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا۔ یہ صرف میں جانتی تھی۔ میں قاتل تھی۔ مجھے ہر جگہ انکل نظر آتے تھے۔

چھ ماہ گزر گئے۔ فیصل پریشان تھے کہ میری صحت گرتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر میری بیماری سمجھنے سے قاصر تھے۔ فیصل کی محبت دیکھتی تو پچھتاوا ہوتا کہ ان کے باپ کو جدا کرنے کا سبب بنی تھی۔

ایک دن امی کی طرف گئی ہوئی تھی۔ دوپہر کو لیٹی تھی کہ قریب پڑا ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ میری بہن کو رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ پڑھتے ہوئے میری نظر ایک ''روحانی مشورے'' کے کالم پر پڑی۔ جہاں ایک شفیق بزرگ کی تصویر تھی۔ جو روحانی طریقے سے مختلف بیماریوں اور مسائل کو حل کرتے تھے۔ حل بتایا کرتے تھی۔ میں نے چند لمحے سوچا پھر رسالے سے ٹیلی فون نمبر لے کر فون کیا۔ ان بزرگ نے فون ریسیو کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں اور ایک بے حد ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ انھوں نے مجھے رسالے کے آفس میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے اگلی دن دوپہر کا وقت طے کر لیا۔

☆☆☆

اگلے دن میں امی سے ضروری شاپنگ کا کہہ کر

رسالے کے آفس چلی گئی۔ پیون نے مجھے ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے اپنا سارا جسم اور چہرہ آنکھیں چھوڑ کر بڑی سی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ مجھے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہت ہی شفیق اور نورانی صورت والے باریش بزرگ تھے۔

''جی فرمایئے بیٹی! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' انھوں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور انھیں سارا واقعہ شروع سے آخر تک سنا دیا۔ وہ خاموشی سے نظریں نیچی کیے سنتے رہے۔ ساری بات ختم ہونے کے بعد میں جیسے تھک سی گئی۔ انھوں نے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھا، میں پانی پینے لگی۔ جب کچھ دیر بعد میں ریلیکس ہو گئی تو وہ بولے۔

''بیٹی! میں نے تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ بہت غور سے سنا ہے۔ اس سارے واقعے میں قصور صرف تمہارا نہیں ہے، اور بھی لوگ قصوروار ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اسلام نے جو پابندیاں یا حدود ہم پر لاگو ہوتے ہیں، جب ہم ان سے روگردانی کرتے ہیں تو مشکلات میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ تم ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئیں مگر تمہارے والدین نے تمہیں یہ تربیت نہیں دی کہ بزرگوں کے سامنے کس طرح رہنا چاہیے۔ اسلام میں دیور، جیٹھ، سسر کو نامحرم رشتوں میں رکھا گیا ہے۔ تمہاری ساس اور نند بھی نہیں تھیں اور تم بے تکلفانہ سسر سے باتیں بھی کرتی تھیں اور بے پردہ بلکہ دوپٹے کے بغیر ان کے آس پاس پھرتی رہتی تھیں۔ شیطان تو انسان کو بہکانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ تم ان کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں بھی دیکھتی تھیں۔ ہنسی مذاق بھی کرتی تھیں۔ وہ تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ عورت کے بغیر رہ رہے تھے۔ تم نے ان کے جذبات کو بھڑکانے کا کام کیا۔ بے شک دانستہ نہیں مگر نادانستہ تم ان کے اندر شیطان جگانے کا باعث بنی تھیں۔

قصوروار تمہارا شوہر بھی ہے جس نے تمہیں نہیں سمجھایا کہ اس کے والد کے ساتھ کس انداز میں پیش آنا چاہیے۔ اگر اس روز تم اگر بیڈروم کا دروازہ بند کر کے تیار ہو رہی ہوتیں تو شاید یہ سارا واقعہ پیش ہی نہ آتا۔ بیٹی! ہم مسلمان ہیں، مجھے یاد ہے کہ میری والدہ میرے دادا جان سے باقاعدہ پردہ کیا کرتی تھیں اور جب وہ بالکل بینائی سے محروم ہو گئے تو تب بھی انھوں نے پردہ نہیں چھوڑا۔ نئی ماڈرن بننے کے چکر میں ہم شیطان سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ قصور تمہارے سسر کا بھی ہے۔ جنھوں نے بیٹی کی طرح نہیں سمجھا تمھیں۔ ورنہ وہ پہلے دن کہہ دیتے کہ بیٹی سر ڈھانپا کرو، اور پھر خود بھی مناسب فاصلہ رکھتے، بے تکلفی سے گریز کرتے، اور بزرگ کی حیثیت سے رہتے۔ جاؤ بیٹی! سجدے میں گر کر اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اپنے لیے سکونِ دل کی دعا کرو۔ وہ صرف کرنے والا مہربان ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا اپنی آنے والی نسل کو اسلامی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا سکھانا اسی میں بھلائی ہے۔ اس بات کا ذکر کبھی بھی کسی سے نہ کرنا۔''

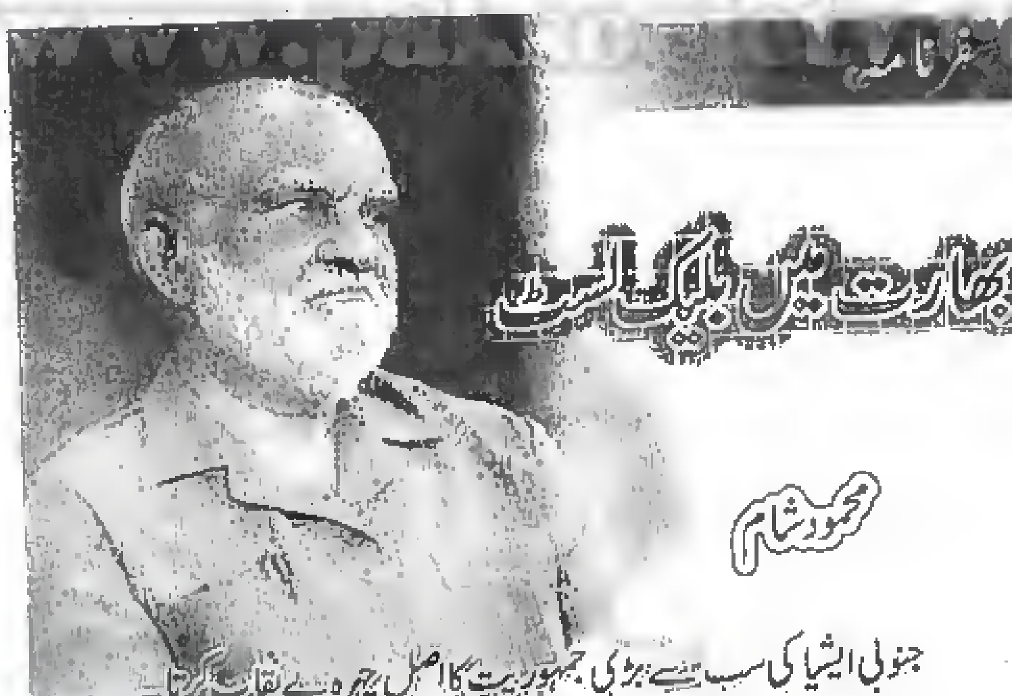
میں نے ان بزرگ کا بہت شکریہ ادا کیا اور گھر لوٹ آئی۔

اس کے بعد میں نے چادر کو اپنے جسم سے الگ نہیں ہونے دیا۔ بلکہ گھر سے باہر جاتے ہوئے پردہ کرنے لگی۔ رو رو کر سجدوں میں خدا سے معافی اور سکونِ قلب مانگتی رہی۔

خدا نے مجھے بیٹے سے نوازا اور میرا دل ٹھہرنے لگا۔ بیٹے کے بعد بیٹی آئی میں نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم اور اقدار کے سانچے میں ڈھالا۔

اس واقعے کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ دو سال پہلے فیصل مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کہانی لوگوں کے سامنے لاؤں گی کہ شاید اسے پڑھ کر کوئی اس حادثے سے بچ جائے اور اپنی غلطی کی پہچان کر لے۔ ورنہ بہت دیر ہو جاتی ہے اور ہمیں حادثے کے بعد عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کاش ہم پہلے سمجھ جائیں۔

☆☆☆



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامۂ بھارت

پانچواں حصہ

۲۸ فروری ۱۹۹۷ء

جمعہ کے مبارک دن ہم دلی روانہ ہو رہے ہیں۔ پی آئی اے کے شعبہ تعلقات عامہ کے لوگ بھی موجود ہیں جو بھارتی اور پاکستانی صحافیوں کو الوداع کہہ رہے ہیں۔

کراچی کے بین الاقوامی قائداعظم ایئرپورٹ کی پرشکوہ عمارت، لاؤنجز کی وسعتیں بھارتی شرکا کو بہت متاثر کر رہی ہیں۔ ان کی کسی ایئرپورٹ پر ایسی جدید ترین سہولتیں میسر نہیں ہیں۔

گزشتہ دنوں کی نشستوں کے مباحث کے بعد ۱۵ نکات پر اتفاق رائے ہوا ہے۔

۱۔ آمنے سامنے۔ کالم۔ مضامین۔ بھارت۔ پاکستان کے بڑے اخبارات میں ایک ہی صفحے پر بھارتی۔ پاکستانی صحافیوں کے مضامین کالم متنازع امور پر شائع ہوں۔ اس میں عام قارئین بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

۲۔ دونوں ملکوں کے اخبارات کے درمیان رپورٹروں کا تبادلہ۔

۳۔ ایک دوسرے کی مطبوعات سے مضامین اور کالم لے کر شائع کیے جائیں۔ خاص طور پر مقامی زبانوں اردو اور ہندی کی تحریریں۔

۴۔ اخبارات 'جنوبی ایشیا کے مشترکہ مسائل' کے لیے ایک صفحہ روزانہ وقف کریں۔

۵۔ ایسے واقعات کے بارے میں رپورٹیں زیادہ شائع کریں۔ جن میں بھارتی اور پاکستانی دونوں شرکت کریں۔ جیسے ٹریولنگ سیمینار اور سرکاری میٹنگیں۔ اس قسم کے دوسرے پروگرام۔

۶۔ نئے رہنما خطوط طے کیے جائیں کہ مقبول عوامی شخصیات کے اشتعال انگیز بیانات کو کس طرح شائع کیا جائے۔ جن سے دونوں طرف کے ذہن مسموم نہ ہوں۔

۷۔ اشتعال انگیز بیانات کی اشاعت پر کسی قدر احتیاط کا مظاہرہ۔

۸۔ اشتعال انگیز بیانات صرف اسی صورت میں شائع کیے جائیں جب ان میں کچھ خبریت ہو۔ لیکن ان کا جواب ضرور دیا جائے۔ ان کے خلاف اداریے لکھیں۔ ایڈیٹر کے نام خطوط میں قارئین کو دعوتِ عام دی جائے۔

۹۔ اعتدال پسند موقف کو زیادہ سے زیادہ نمایاں شائع کریں۔ تاکہ اشتعال انگیز بیانات

کا تاثر کم سے کم ہوتا رہا ہے۔

۱۰۔ رپورٹروں کو تربیت دی جائے کہ وہ بھارتیوں اور پاکستانیوں کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ سمجھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں۔ ناتجربہ کار اور غیر محتاط اخبار نویسوں کو حساس مسائل پر اداریے یا مضامین لکھنے پر مامور کیا جائے۔

۱۱۔ ایک دوسرے کے تہواروں، عادتوں، تقریبات پر انسانی دلچسپی کے مضامین شائع کیے جائیں تاکہ بھارتی پاکستانی ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

۱۲۔ دونوں ملکوں میں ماحولیات۔ انسانی حقوق کے تحفظ۔ خواتین کے حقوق سے متعلق مصروف کارگردیوں کی سرگرمیوں سے متعلق رپورٹروں کا تبادلہ کیا جائے۔ تاکہ قارئین کو دونوں طرف یہ احساس ہو کہ ان شعبوں میں کتنا کام ہو رہا ہے۔

۱۳۔ جب ایک ملک میں مسائل پر کسی اچھے کام کی خبر دی جارہی ہو۔ تو دوسرے ملک میں ایسے ہی اچھے کام کی رپورٹیں شائع کی جائیں۔

۱۴۔ ایسے مورخین کے بارے میں رپورٹیں شائع کی جائیں۔ جو جنوبی ایشیا کے واقعات کو مسخ نہیں کرتے ہیں دونوں طرف ایسے مورخین کو زیادہ سے زیادہ متعارف کروائیں جو حقائق کو درست انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جنھوں نے درسی کتابوں میں تاریخی حقائق کو اسی طرح درج کیا ہے۔ جیسے وہ رونما ہوئے۔

۱۵۔ پاک بھارت سرحد کے دونوں طرف اخبارات کی دستیابی۔ تاکہ ایڈیٹر حضرات لکھتے اور شائع کرتے وقت دونوں طرف کے قارئین کا شعوری طور پر خیال رکھیں۔

پی آئی اے کی پرواز پی کے 272 دہلی پہنچ گئی ہے۔

بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے شہریوں سے انتہائی مخصوص اور امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ معمول سے زیادہ فارم پر کرنے ہوتے ہیں۔

میں پہلے بھی دہلی آیا ہوں۔ اس بار امیگریشن کے معمولات مختلف ہیں۔ اب امیگریشن آفیسر کمپیوٹرز کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میری باری آ گئی ہے۔ تو کمپیوٹر الرٹ ہو گیا ہے۔ امیگریشن آفیسر کبھی مجھے دیکھ رہا ہے۔ کبھی اپنے کمپیوٹر کو جیسے غالب کے الفاظ میں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کمپیوٹر نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے امیگریشن آفیسر نے اپنے سینئرز کو بلایا ہے وہ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتا رہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ میں امیگریشن سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بیٹھ جاؤں۔

سیمینار کے شرکاء سب سرحد عبور کر چکے ہیں۔ میں رہ گیا ہوں۔ امریکی محکمہ اطلاعات اسلام آباد کے پیٹر کلاسن اور دوسرے افسر آئے ہیں۔ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کیا ہوا ہے۔ وہ بھارتی آفیسرز سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا۔ وہ شور مچا رہے ہیں کہ ان کا ویزا تو ہم نے کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ویزا ہے۔ انکار کرنا تھا۔ تو وہاں کرتے۔

سفارتی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔

اب امریکیوں کو احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان بھارت کو ایک دوسرے کے قریب لانا کتنا مشکل ہے۔ پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ تمام وزرا اعلیٰ افسر وہاں بیٹھے ہیں۔ امریکی سفارت خانے کے حکام۔ بھارتی وزارت خارجہ سے گفتگو کر رہے ہیں۔

ایک گھنٹہ گزر رہا ہے۔ میں نے ان افسروں سے کہا ہے کہ آپ باقی شرکا کو تو ہوٹل لے جائیں۔ مجھے ممکن ہے واپس پاکستان جانا پڑے۔ وہ کہتے ہیں ہم انتظار کرتے ہیں۔ دوسرا گھنٹہ گزر گیا ہے۔ کوششیں جاری ہیں۔ باقی شرکا کو ہوٹل لے جانے کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ آگے بھی بہت کارروائی ہے۔

تیسرا گھنٹہ گزر رہا ہے۔ امیگریشن آفیسر

ہیں۔ کہ آپ کے ویزے پر لکھا ہونا چاہیے Special Permission Granted میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ اسلام آباد میں آپ کے ہائی کمیشن کو ویزا جاری ہی نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ ویزا تو امریکیوں نے ہی لیا تھا۔ میں تو یہ ویزا لینے نہیں گیا تھا۔

امریکیوں نے خصوصی اجازت لے لی ہے۔

میرے پاسپورٹ پر انٹری کی مہر لگ گئی ہے۔ کمپیوٹر سے معلوم نہیں کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی فائلیں اس طرح کیسا یا تبدیل کی گئی ہیں۔ تین گھنٹے کی حبس بے جا بے مقصد انتظار۔

پاک بھارت تعلقات کو بہتر کرنے کے میرے سارے جذبات نئی دہلی ایئر پورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر پر دفن ہو گئے ہیں۔

میں سوچ رہا ہوں کہ اپنا سفر یہیں ختم کر دوں اور پاکستان واپس چلا جاؤں۔

پھر میں سوچتا ہوں کہ یہ سلوک معلوم نہیں کتنے شہریوں کے ساتھ ہوتا ہو۔ اسی کو تو ہم نے تبدیل کرنا ہے۔ افسروں کے اسی رویے کو تو بدلوانا ہے۔

میں اس سے پہلے ۱۹۸۹ء میں آیا تھا۔ جب ہم دہلی کے راستے کابل گئے تھے۔ اس وقت ہم نئی دہلی ایئر پورٹ پر کراچی سے جاتے ہوئے اترے۔ پھر کابل سے آتے ہوئے دوبارہ اترے دونوں بار کچھ نہیں ہوا۔ لیکن اس زمانے میں ایئر پورٹ پر کمپیوٹر نہیں تھے۔ فائلیں دفاتر میں موجود ہوتی تھیں۔ اب فائلیں کمپیوٹر میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ کمپیوٹر فوراً بول اٹھتا ہے۔

امریکی بار بار دل جوئی کر رہے ہیں۔ ہر شخص کو ہمدردی ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گا۔ کسی تقریب میں نہیں جاؤں گا۔

جمعہ، ہفتہ، سیمینار کے سلسلے میں کوئی مصروفیت نہیں ہے۔

ہوٹل ہلٹن میں ہمارا قیام ہے۔

ٹیلی فون پر دوستوں سے رابطے کیے ہیں۔ ہفتے کی صبح یہ واقعہ کسی اخبار نے شائع نہیں کیا ہے۔ یا تو یہ اخبار بے خبر ہیں۔ یا انھوں نے اس خبر کو قابل اشاعت نہیں سمجھا ہے۔ میں نے یہ سہ پہر اور شام سو کر گزار دی ہے۔ کسی سے نہیں مل رہا ہوں کیوں کہ یہ بھی خدشہ ہے کہ بھارتی سی آئی ڈی بعد میں اسے ہی تنگ نہ کرے۔

یکم مارچ ۱۹۹۷ء

صبح سویرے میں ٹیکسی لے کر بستی نظام الدین اولیا نکل گیا ہوں۔ شکایت بھی کر رہا ہوں اور دعا بھی کہ اور کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ پاک بھارت تعلقات بہتر ہوں۔

یہ اولیاء اللہ ہی تھے۔ جنھوں نے جنوبی ایشیا میں اسلام کی روشنی پھیلائی ان کی تعلیمات مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے قریب رکھتی تھیں۔ آپس میں اختلافات میں شدت پیدا نہیں ہونے دیتی تھیں۔

شام کو ہم ممبئی روانہ ہو رہے ہیں۔ دہلی سے ممبئی اتنی دور نہیں ہے جتنا ممبئی ایئر پورٹ سے ممبئی۔ ہوٹل پریذیڈنٹ پہنچتے پہنچتے کتنے گھنٹے گزر گئے ہیں۔ سڑکیں اتنی طویل کہ مختصر ہی نہیں ہوتیں۔

رات ممبئی کو لپیٹ میں لے چکی ہے۔ ممبئی بائی نائٹ۔ واقعی خوبصورت ہے۔

۲ مارچ ۱۹۹۷ء

ممبئی کا اتوار۔ کوئی پروگرام نہیں ہے۔ سخت گرمی ہے۔ میں اور جاوید اقبال ممبئی کی میزبانی دیکھنے نکلے ہیں۔ لیکن حبس نے واپس ہوٹل میں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حبس کراچی کی طرح ہی تنگ کرتا ہے۔ پسینہ بہتا ہے۔

اتوار ہوٹل کے کمروں اور لابیوں میں ہی گزر گیا ہے۔

۳ مارچ ۱۹۹۷ء

بھارت میں ٹریولنگ سیمینار کی باقاعدہ پہلی نشست ہے۔ ہم پاکستانی شرکاء سنجیدگی سے تیاری کر رہے ہیں۔ امریکن سینٹر ممبئی کے ڈائریکٹر جوزف برینگ نے ایک خط میں ہمارا خیر مقدم کیا ہے اور ساتویں ٹریولنگ سیمینار میں ہماری شرکت کے قابل قدر ہونے کی توقع کی ہے۔

بھارت سے ممبئی میں درج ذیل صحافی شامل ہوئے ہیں۔
۱۔ دنیا وکیل۔ ریذیڈنٹ ایڈیٹر۔ ڈی ٹائمز آف انڈیا۔
۲۔ کمار کیٹکر۔ ایگزیکٹو ایڈیٹر۔ دی مہاراشٹرا ٹائمز۔
۳۔ راہول سنگھ۔ فری لانس جرنلسٹ۔
۴۔ بی وی راؤ۔ ریذیڈنٹ ایڈیٹر انڈین ایکسپریس۔
۵۔ اے جی نورانی۔ کالسٹ۔ اور مبصر۔
۶۔ ساجد رشید۔ ایڈیٹر اردو ٹائمز
۷۔ طارق انصاری۔ پبلشر انقلاب۔
۸۔ بہرام کنٹریکٹر۔ ایڈیٹر آفٹرنون ڈیچ۔ اینڈ کورئیر۔
۹۔ تولین سنگھ۔ ایسوسی ایٹ ایڈیٹر پلس چینل
۱۰۔ ملاویکا سنگھ۔ ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ممبئی ٹائمز
۱۱۔ جاریہ آنند۔ ایڈیٹر کمیونلزم کمبیٹ
۱۲۔ سمردی کو یکر۔ اسپیشل کارسپانڈنٹ انڈیا ٹوڈے

مبصرین میں شامل ہیں۔
۱۔ جان این بیری۔ سینئر پروگرام آفیسر یو ایس آئی ایس نئی دہلی۔
۲۔ جبری جے برینگ۔ برانچ پبلک آفیسر یو ایس آئی ایس ممبئی۔
۳۔ سپریم کارادیلا۔ ڈپٹی برانچ پبلک افیئر آفیسر ممبئی۔
۴۔ راجہ چندرن۔ پریس ایڈوائزر۔ یو ایس آئی ایس ممبئی۔
۵۔ پیٹر آرکلاسن۔ فرسٹ سیکریٹری انفارمیشن یو ایس آئی ایس اسلام آباد۔
۶۔ پردیپ کے ڈی۔ سینئر پروگرام منیجر یو ایس آئی ایس کلکتہ۔
۷۔ الماس فتح علی۔ پروگرام آفیسر۔ انٹرنیشنل سینٹر فار پیس انی شیٹو ممبئی۔
۸۔ تھیوڈور ایچ۔ جبیں۔ یو ایس آئی ایس اسلام آباد۔
۹۔ منڈیپ کور۔ سینئر پروگرام منیجر یو ایس آئی ایس نئی دہلی۔
۱۰۔ ٹی ایس کپوسوامی۔ سینئر پروگرام منیجر یو ایس آئی ایس مدارس۔
۱۱۔ آر کے وشواناتھن۔ پروگرام ایڈوائزر یو ایس آئی ایس ممبئی۔

جبری برینگ نے استقبالیہ کلمات ادا کیے ہیں۔ تمام شرکا اپنا اپنا تعارف کرا چکے ہیں۔

آرتھر چیرٹی پبلک جرنلزم کے اغراض و مقاصد بتا رہے ہیں۔ اس نشست میں بھارت اور پاکستان کے پہلے سے شریک صحافیوں کے علاوہ ممبئی کے کچھ منتخب اداکار، آرٹسٹ اور صحافی بھی شامل ہوئے ہیں۔ یہ نشست بند کمرے میں منعقد ہو رہی ہے۔ آرتھر چیرٹی کہہ رہے ہیں کہ ہم یہاں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے تو نہیں آئے ہیں۔ لیکن ہم دوسروں کے لیے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کا عمل آسان بنا سکتے ہیں۔ بہت سے راستے ماپنے ہیں۔ مرحلے طے کرنے ہیں۔ منزلیں حاصل کرنی ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان تنازعے اور تصادم کی روایتیں بہت طویل ہیں بھارت تاریخ کا اپنا متن پیش کرتا ہے۔ پاکستان کے نزدیک تاریخ کا اپنا متن ہے۔ دونوں کا خیال رکھتے ہوئے احترام کرتے ہوئے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک مشترکہ نقطے تک پہنچنا ہوگا۔ وہ ایک وڈیو بھی دکھا رہے ہیں۔

فرائیڈے ٹائمز کے خالد احمد نے گفتگو کا آغاز کیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ یہ دیکھنا ہوگا کہ دونوں ملکوں کے عام لوگ کیا سوچتے ہیں۔ ان کی عام فکر کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے میڈیا مشترکہ صفحات۔ تیار کرنے کی طرف بھی قدم بڑھا سکتے ہیں۔ بحث شروع ہو چکی ہے۔ ریناسن چندانی کا مشورہ ہے کہ ٹیلی ویژن۔ انٹرنیٹ اور اخبارات و رسائل میں سنجیدہ امور پر کھلی بحث ہونی چاہیے۔ سمن صاحب کی تجویز ہے کہ دونوں ملکوں کے صحافیوں کو ویزے کے بغیر آمد و رفت کی سہولتیں حاصل

چاہئیں۔ صحافیوں کی اس آزادانہ نقل و حرکت سے وہ ایک دوسرے کے مسائل پر زیادہ لکھ سکیں گے اور قارئین کو دونوں طرف زیادہ بہتر معاملات حاصل ہوسکیں گی۔

بنیادی موضوع یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے نزدیک بھارتیوں اور پاکستانیوں کے راستے میں ایک مشترکہ مقصد کے احساس میں کیا رکاوٹیں ہیں۔

بھارتی اور پاکستانی صحافی اپنی اپنی رکاوٹیں بیان کررہے ہیں۔ پاکستانی تو یہ کہہ سکتے ہیں اور کہہ بھی رہے ہیں کہ ان کے ہاں جمہوریت کا تسلسل نہیں رہا ہے۔ سیاسی عمل کو دوام نہیں ملا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں اعتدال پسندی اگر مطلوبہ معیار اور مقدار میں نہیں ہے۔ تو اس کا جواز سیاسی عمل کا فقدان ہوسکتا ہے۔ لیکن بھارت میں تو سیاسی اور جمہوری عمل مستقل چلتا رہا ہے۔ سیاسی حکومتیں ہی فیصلے کرتی آرہی ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاں مسلمانوں کے خلاف نفرتوں اور تعصبات میں کمی کیوں نہیں لاسکی ہیں۔ پاکستان کے خلاف مخالفانہ جذبات کو کم کیوں نہیں کرسکے ہیں۔ اس کا جواب بھارتی صحافی نہیں دے پارہے ہیں۔ لیکن سب میں یہ خواہش موجود ہے کہ اب تنازعات طے کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔

ظہرانے کے بعد اب ٹاؤن میٹنگ کا انعقاد ہورہا ہے۔ شہر کے معززین بھی موجود ہیں۔ اس عام نشست میں دہلی ایئرپورٹ پر ہمیں تین گھنٹے روکے جانے کی بازگشت بھی سنائی دے رہی ہے اور بھارت کے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کی مذمت بھی کی جارہی ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ ایسے اقدامات سے پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات بڑھیں گے اور ان میں کمی نہیں آئے گی۔

سامعین میں تاجر بھی ہیں۔ دانشور بھی، سابق بیوروکریٹ، سفارت کار، سینئر صحافی بھی۔ سب کا زور اس بات پر ہے کہ دونوں ملکوں کے صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں کے درمیان رابطہ بڑھنا چاہیے۔ دونوں ملکوں کے عوام کو اقتصادی مسائل کا احساس دلایا جانا چاہیے۔ کیوں کہ تعلقات میں دوری اور خرابی ہمیشہ معیشت کو متاثر کرتی ہے۔

بار بار اس امر پر بھی اکثر شرکا نے زور دیا کہ دونوں ملکوں کے اخبارات و رسائل ایک دوسرے کے ملک میں دستیاب ہونے چاہئیں۔ ایک سینئر بھارتی شہری اقبال مسعود نے کہا ہے کہ اتوار کے اتوار یہاں پاکستانی اخبار 'ڈان' اور 'جنگ' کسی ایک اسٹال پر ملتے ہیں۔ ڈان کی قیمت ۲۷ روپے اور جنگ روپے ہے۔ جو بھارتی اخبارات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے خریدتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ میرے ساتھ دہلی ایئرپورٹ پر جو کچھ بھی ہوا۔ وہ ایک مخصوص ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن میں اپنی اس ذاتی توہین اور المیے کو پاک بھارت مفاہمت کے حصول کی کوششوں میں رکاوٹ نہیں بننے دوں گا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ بھارت کو اپنی بڑائی کے زعم سے نکلنا ہوگا۔ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر پاکستان کو اپنے ایک برابر کے خود مختار، مقتدر اور آزاد ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ امریکہ کو بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات دو کمیونٹیوں کے درمیان تنازعات نہیں ہیں۔ بلکہ وہ خود مختار قوموں کے درمیان تنازعات ہیں یہ ہندو مسلم تصادم نہیں ہے۔ بلکہ دو خود مختار قوموں کے درمیان معاملہ ہے۔

۴ مارچ ۱۹۹۷ء

اس ٹریولنگ سیمینار کے دوران کسی شہر میں دوسرے دن بھی نشستیں ہورہی ہیں۔ مسائل کی نشاندہی ہوچکی ہے۔ اب ان مسائل کے حل کے طریقے طے ہونے چاہئیں آج کا موضوع ہے۔ 'بہتر تعلقات کی طرف...... بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لیے تنظیمیں اور افراد (سیاسی جماعتیں۔ تاجر طبقے۔ مذہبی رہنما وغیرہ) کیا کرسکتے ہیں۔

قدرت اللہ چوہدری اور ریحانہ حکیم پاکستان کی طرف سے اقدامات تجویز کررہے ہیں۔ عملی تجاویز دی جارہی ہیں۔

جن میں سرفہرست دونوں طرف کے اخبارات میں مشترکہ صفحات کی طباعت ہے۔ میں نے 'جنگ' کی طرف سے یہ پیشکش کی ہے کہ ہم پاک بھارت تعلقات کے سوال پر دونوں ملکوں کے عوام کی رائے فون پر حاصل کر کے شائع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بھارت کا کوئی اخباری گروپ بھی اس میں ہمارا ساتھ دے۔ وہ بھارت کے عوام کے جوابات فون پر حاصل کر کے جنگ گروپ کو فراہم کرے۔ ہم پاکستان کے عوام کے جوابات فون پر حاصل کر کے اس گروپ کو فراہم کریں گے۔ اس طرح کسی ایک سوال پر دونوں ملکوں کے شہریوں کے جوابات ساتھ ساتھ شائع ہوں۔ تو صحیح اندازہ ہوگا کہ دونوں ملکوں کے عوام کی سوچ کتنی قریب ہے یا کتنی دور ہے۔ شرکا نے اس پیشکش کو بہت سراہا ہے اور سب منتظر ہیں کہ دیکھیں بھارت کا کون سا اخباری گروپ آگے آتا ہے۔

ٹیسٹا سٹیلواڈ کمیونلزم کمبیٹ سے وابستہ ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے ذہنوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے عملی کوششیں کر رہی ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے محفوظ مستقبل کے لیے دونوں ملکوں کے اسکولوں کے بچوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہی ہیں۔ بچوں سے ایک دوسرے کو خطوط لکھوائے جاتے ہیں۔ ذہنی آزمائشیں منعقد کی جاتی ہیں کوشش اصل یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے شہریوں میں بچپن سے جو نفرتیں اور تعصبات جاگزیں کیے جائے ہیں۔ انھیں دور کیا جائے۔ اس سلسلے میں ممبئی سے ایک اسکول اور ایک کراچی سے ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

ٹیسٹا اپنے اس پروگرام کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کر رہی ہیں اور تمام شرکاء سے تعاون کی اپیل کر رہی ہیں۔

ممبئی میں سیمینار کی آخری نشست کا موضوع ہے؟ 'میڈیا۔ طریق کار کی شناخت۔ مخصوص رکاوٹیں دور کرنے۔ تعمیری رویہ اختیار کرنے میں کیا تعاون کرسکتا ہے۔

پاکستانی اور بھارتی شرکاء نے اپنے اپنے اخبارات۔ اپنی ذات اور اپنے ملک کی طرف سے مختلف اقدامات تجویز کیے ہیں۔

ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔ ان کے اخبارات و رسائل جب مفاہمت کے لیے ہر روز کچھ نہ کچھ شائع کریں گے اور اشتعال انگیزی روکنے کے لیے کچھ کوششیں کریں گے۔ تو یقیناً اس کے اثرات تو مرتب ہوں گے۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہوگا کہ کیا سیمینار کے اختتام پر اپنے اپنے شہر واپس پہنچنے کے بعد بھی ہماری ذہنی فضا یہی رہے گی۔ یہی جذبات ہوں گے۔ یہی عزائم ہوں گے۔

شام ۵ بجے انڈین ایئر لائنز سے ہم دہلی روانہ ہو رہے ہیں۔

۵ مارچ ۱۹۹۷ء

ممبئی سے دہلی کے راستے میں یہی تذکرہ ہے کہ طے شدہ معاملات پر عملدر آمد کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ صفِ امن کے آغاز پر سب متفق ہیں۔ جو کچھ یہاں بحث مباحثے کے نتیجے میں سامنے آ رہا ہے۔ اسے عام لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم کی تجویز بھی پسند کی گئی ہے کہ پاکستان اور بھارت کی یونیورسٹیوں کے صحافت کے شعبوں کا آپس میں رابطہ بڑھایا جائے۔ اساتذہ اور طلبہ کا تبادلہ ہو۔ تحقیق میں ایک دوسرے سے تعاون ہو۔ امریکی محکمہ اطلاعات اس سلسلے میں رابطے کا کردار ادا کرسکتا ہے۔ پھر یہ تجویز آئی کہ امریکی یونیورسٹیاں بھی یہ ذمہ داری لے سکتی ہیں۔

ہلٹن ہوٹل میں ہونے والی نشست ساتویں ٹریولنگ سیمینار کی آخری نشست ہے۔

پہلے مجھے بولنا ہے: ہم ۲۴ فروری سے مسلسل مل رہے ہیں۔ لاہور، اسلام آباد، کراچی، پھر ممبئی، بند کمرے کی نشستوں کے علاوہ ٹاؤن میٹنگز بھی ہوئی ہیں۔ عجیب سا لگ رہا ہے کہ ہم جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہمسائے ہیں۔ ہماری آپس میں میٹنگیں کروانے کے لیے کتنے سمندر پار سے امریکہ والے آئے ہیں۔ تب ہم

ایک دوسرے کو ویزا دے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے شہروں میں جا رہے ہیں۔

کشمیر ہمارا سب سے بڑا تنازع ہے۔ اس پر ہم برسوں سے مذاکرات کر رہے ہیں لڑ رہے ہیں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔ اب نظریہ گجرال آ گیا ہے۔ عوام بنام عوام۔ لوگ آپس میں باتیں کریں۔۔ لیکن کیسے۔ ویزا ملے گا تو ملیں گے باتیں کریں گے۔ اخبارات یقیناً ایک موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دونوں ملکوں میں ایک سازگار ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ جو کسی حد تک کر ہی رہے ہیں۔ ویزے جاری کرنے میں آسانیاں ہونی چاہئیں۔ صحافیوں کو ویزے کی پابندی سے آزاد کر دیں۔ عام لوگوں کو منقسم خاندانوں کو ان کی درخواست پر جلد ویزے ملنے چاہئیں۔

میں یہ بھی کہہ رہا ہوں۔ کہ پاکستان کے بانی قائداعظم پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں بہت واضح خیالات اور عزائم رکھتے تھے۔ انھوں نے دونوں ملکوں کے درمیان برابری کی بنیاد پر تعلقات بڑھانے پر زور دیا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان تاشقند معاہدہ ہوا۔ جو روس کی میزبانی میں ہوا۔ شملہ معاہدہ دوطرفہ تعلقات کی ایک مستحکم تھا۔ کہ دو ملک جن کے درمیان کشیدگی رہی۔ خوفناک تصادم ہوا۔ ایک دوسرے کے علاقوں پر قبضہ کیا۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد بھارت کے پاس تھی۔ اس کے باوجود دونوں ملکوں کے سربراہ براہِ راست ایک دوسرے سے ملے۔ کوئی دوسری طاقت درمیان میں نہیں تھی۔ بڑی سوچ بچار۔ زدوکد کے بعد ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ایک دوسرے کو سفارتی طور پر تسلیم کیا گیا۔ علاقے واپس کیے گئے۔ جنگی قیدی اپنے اپنے گھر لوٹے۔ لیکن شملہ معاہدے میں جو کچھ طے ہوا۔ اس پر مکمل عملدرآمد نہیں ہوا۔ بہت سست رفتار سے چیزیں طے کی گئیں۔ اخبارات کی تقسیم، تبادلہ، اس معاہدے کا حصہ ہے لیکن عمل نہیں ہو رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان ٹیلی فون پر رابطے کو آسان کر اور ارزاں کیا جائے۔ بھارت کی معزز شخصیتیں موجود ہیں۔ سابق جنرل۔ سابق بیوروکریٹ بیگمات۔ این جی اوز کے نمائندے۔ سینئر صحافی۔ کالم نویس۔

میں انھیں بتا رہا ہوں کہ ٹریولنگ سیمینار کے بھارتی اور پاکستانی شرکا۔ اپنے اخباروں، رسالوں میں امن کے لیے صفحات مختص کرنے پر رضامند ہوئے ہیں۔ یہ بھی طے ہوا ہے کہ سیمینار کے شرکا بعد میں بھی رابطہ رکھیں گے ای میل۔ انٹرنیٹ سے سیمینار کا فالو اپ جاری رکھا جائے گا۔ دونوں ملکوں کی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے صحافت۔ پاکستانی اور بھارتی اخبارات کی اس حوالے سے۔ مانیٹرنگ کریں گے۔

کشمیر کے حوالے سے میں کہہ رہا ہوں۔ کہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے تجویز کیا تھا کہ دونوں طرف کے کشمیریوں کو ایک دوسرے سے ملنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ لائن آف کنٹرول پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اس پر کوئی عمل نہیں ہوا گجرال نظریہ بھی اسی تجویز کی ایک شکل ہے۔ میں نے دہلی ایئرپورٹ پر اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کو بھی دہرایا ہے کہ جب ایسے واقعات ہوں گے۔ قانونی ویزے کے باوجود دہلی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ گجرال صاحب کو اس پر آواز بلند کرنی چاہیے۔ میں یہ تجویز بھی پیش کر رہا ہوں کہ ٹریولنگ سیمینار سرینگر۔ جموں اور ادھر مظفرآباد میں رکھے جائیں۔ تو یقیناً یہ بامعنی اور نتیجہ خیز ہوں گے۔

ان دنوں حالات بہتری کے لیے سازگار ہیں۔ پاکستان کے وزیراعظم میاں نوازشریف بھی تعلقات بہتر چاہتے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم دیوگوڈا بھی اس کے حق میں ہیں۔ دونوں ملکوں کے شہری بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے سنگین مسائل کے حل کی راہ دوطرفہ پرامن تعلقات سے ہی نکلے گی۔ ٹریک II ڈپلومیسی اب تک کامیاب رہی ہے۔ وہ جو کہا جاتا رہا ہے کہ جنگ کے امور صرف جنرلوں پر نہیں چھوڑنے چاہئیں۔ اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈپلومیسی کے امور صرف ڈپلومیٹس پر نہیں چھوڑنے چاہئیں۔

دونوں ملکوں کو برابری۔ خودمختاری کی بنیاد پر بات کرنا ہوگی اور اس جذبے سے معاملات کو طے کرنا ہوگا۔

دونوں ملکوں کے عوام باشعور ہیں۔ سمجھدار ہیں۔ انھیں سوچنے دیں۔ فیصلہ کرنے دیں۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کو موقع دیں کہ وہ اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کریں۔ اخبارات ان خیالات کو من وعن شائع کریں۔ سروے کریں۔ اخبار، ٹی وی ریڈیو بھی دونوں طرف کے لوگوں کی آراء پیش کریں۔ اس طرح عوام ایک دوسرے کو سمجھیں گے۔

میں نے ان دنوں میں بھی دونوں طرف کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔ خیالات پڑھے ہیں۔ درد محسوس کیا ہے۔ لوگ امن چاہتے ہیں۔ ایک تصادم سے پاک، نفرتوں سے خالی پرسکون، خوشحال زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ جہالت، غربت، بیماریاں، لڑائیاں آخر جنوبی ایشیا کے لوگوں کا مقدر کیوں بنی ہیں''۔

میں اپنی بات پوری کر چکا ہوں۔ تالیاں بج رہی ہیں۔ شاید میں نے ایسی باتیں کی ہیں جو سب کو پسند آئی ہیں۔ اس سیمینار سے اور کچھ ہو نہ ہو مجھے بولنا آ گیا ہے۔ وہ بھی انگریزی ہیں۔

عام بحث شروع ہوئی ہے۔ سوالات بھی ہو رہے ہیں۔ کیرن ساہنی کہہ رہے ہیں۔ بھارت ایک بڑا ملک ہے۔ اسے پاکستان کے ساتھ فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ممبئی کا جناح ہاؤس پاکستان کو دینے سے اچھی مثال قائم ہوسکتی ہے۔ دونوں ملک باہمی روابط بڑھا لیں تو سارک کی مارکیٹ خوشحالی لاسکتی ہے۔

شاہد صدیقی کہہ رہے ہیں کہ لاہور اور دہلی میں آزادی کے میلے ہونے چاہئیں جس میں دونوں ملکوں کے فنکار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ ۱۴ اگست اور ۱۵ اگست کو دونوں ملکوں کی گولڈن جوبلی ہونی ہے اس کی تیاریاں ہونی چاہئیں۔ ٹیسٹا نے بھی اپنے خصوصی منصوبے پر بات کی ہے۔ پاکستان بھارت کے بچوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ان کی غلط فہمیاں دور کی جائیں۔ تاریخ اور دوسرے نصابی کتابوں سے ایک دوسرے کے خلاف زہر کو نکالا جائے۔ ریحانہ حکیم کہہ رہی ہیں دونوں ملکوں کی خواتین کے درمیان روابط بڑھنے چاہئیں۔ خواتین تنظیموں کو ایک دوسرے سے زیادہ ملنا چاہیے۔

جاوید اقبال نے امن کے لیے مختص صفحات۔ جنوبی ایشیا کے صحافیوں کے درمیان فعال رابطے پر زور دیا ہے۔ خالد احمد کہہ رہے ہیں۔ انگریزی اخبارات ورسائل زیادہ موثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ سابق بیوروکریٹ، جنرل آپس میں مل رہے ہیں۔ بھارتیوں کو پاکستان میں اپنے سابقہ علاقے یاد آرہے ہیں۔ پاکستانیوں کو بھارت میں سابقہ علاقے یاد آرہے ہیں۔

ایسی نشستیں کیا مسائل حل کرسکتی ہیں۔ پھر وہی سوال ہے۔ کیا صحافیوں کے پاس اتھارٹی ہے۔ بہت سے صحافیوں کے پاس تو اپنے اخبارات ورسائل میں بھی اتھارٹی نہیں ہے۔ یہاں سینئر صحافی پر ان چوپڑہ ہیں۔ بھارتی فوج کے سابق کمانڈر انچیف نرل وی این شرما۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل سیشل ناہیار۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل اے ایم وہرا۔ سینئر صحافی پران سبروال ہیں۔

'تنازعات طے کرنے میں میڈیا کا کردار'۔ آخری باقاعدہ نشست ہوچکی ہے۔

اب ہمیں اپنے اپنے طور پر دیکھنا ہے کہ ان دنوں کی کوششوں اور محنت کو نتیجہ خیز کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ رات میں غیر ملکی اخباری نمائندوں کے کلب میں استقبالیہ ہے۔ ایک ہجوم پرانے دوست مل رہے ہیں کیا ہو رہا ہے کیا سیمینار سے کچھ ہوگا اور بہت کچھ۔

۶ مارچ ۱۹۹۷ء

پاکستانی شرکاء کو آج ویمن پریس کور کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہ بھی ساتویں ٹریولنگ سیمینار کا ایک حصہ ہے۔ اسے آخری نشست سمجھ لیجیے۔ اخبار نویس خواتین۔ کئی کئی نسلیں یہاں موجود ہیں۔ کسی کے پاس صرف تلخ یادیں ہیں۔ کسی کے پاس صرف حسین تصورات۔ پاکستان میں خواتین کیا کر رہی ہیں۔ کیا

مسائل ہیں۔ ریحانہ حکیم جواب دے رہی ہیں۔ اتفاق رائے ہے کہ خواتین نمایاں کردار ادا کرسکتی ہیں۔ پاکستان اور بھارت کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتی ہیں۔

ٹریولنگ سیمینار انجام پا گیا ہے۔ پاکستانی شرکاء اپنے وطن واپس آرہے ہیں۔ پہلے لاہور۔ پھر کراچی۔

جاوید اقبال نے مجھے گھر چھوڑا ہے۔

دل اور ضمیر دونوں مطمئن ہیں کہ انسانیت کے عظیم مقاصد کی خاطر کچھ دن گزر گئے ہیں۔ دیکھیں یہ محنتیں کب بارآور ہوتی ہیں۔

☆☆☆

دہلی میں پہلی رات

''آپ نئی دہلی جارہے ہیں؟''

''پان امریکن کے کاؤنٹر انچارج نے میرا ٹکٹ دیکھا اور پھر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اسی حیرت میں ڈوبے ہوئے اس نے کہا۔

''اپنا پاسپورٹ دکھایئے۔''

پاسپورٹ پر سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانے کی طرف سے ہندوستان کے لیے ویزے کی مہر دیکھ کر اسے اطمینان ہوگیا، اور اس نے مجھے بورڈنگ کارڈ دے دیا۔

اِس زمانے میں واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک پاکستانی بھارت جارہا ہے، جبکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں، سرحدیں بند ہیں۔ خود جانے والا بھی کافی تذبذب کے عالم میں رہتا ہے۔ پرواز میں کچھ وقت باقی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک دشمن ملک میں وقت کیسے گزرے گا۔ پرواز کے لیے اعلان ہوتا ہے تو میں اپنا بیگ اُٹھا کر سامنے کھڑی بس میں جانا چاہتا ہوں، میں پہلا مسافر ہوں۔ بس کی کھڑکی میں سے میں دیکھتا ہوں کہ تمام مسافر حفاظتی بکس میں سے گزر کر آرہے ہیں۔ جائزہ لیا جارہا ہے کہ کوئی جہاز ہائی جیک نہ کرلے۔ میں اس بکس میں سے گزرے بغیر ہی چلا آیا ہوں، کسی نے روکا نہ ٹوکا۔ اتنے حفاظتی اقدامات پھر بھی بھول چوک ہوجاتی ہے، یہی بھول چوک بعض اوقات بڑے واقعات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ میں اپنا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہوں۔ میرا جہاز ہائی جیک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور میرے پاس اصلی تو کیا نقلی پستول بھی نہیں ہے۔

جمبو جیٹ کی وسعتیں میری منتظر ہیں۔ بیٹھنے کی ہی نہیں لیٹنے کو بھی وافر جگہ ہے۔ کافی وسعت اور اس کے ساتھ ساتھ ویرانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس وقت پی آئی اے کی یاد ستا رہی ہے۔ اپنا وطن پھر بھی اپنا وطن ہے۔ جہاز پرواز کا آغاز کرتا ہے تو اناؤنسر کی آواز بلند ہوتی ہے۔

''صبح بخیر۔ ہم ایک گھنٹہ 20 منٹ کی پرواز کے بعد دہلی میں جاپہنچیں گے۔''

صرف ایک گھنٹہ 20 منٹ کا فاصلہ..... کراچی اور دہلی کے درمیان..... پاکستان اور ہندوستان کے درمیان۔ کیونکہ میرے پاس خصوصی ویزا ہے۔ خصوصی اجازت ہے۔ ورنہ دہلی اور کراچی کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ کتنے خاندان بٹے ہوئے ہیں۔ مہینوں خیریت کی اطلاع نہیں ملتی ہے۔ میرے ساتھ کتنے ہی ایسے خاندانوں کے خطوط ہیں جو مجھے دہلی جاکر ڈاک کے حوالے کرنا ہیں، جن سے یکطرفہ خیریت کی اطلاع مل جائے گی، جانے کتنے دلوں کو سکون نصیب ہوجائے گا۔ یہ خاندان ایک عرصے سے منتظر ہیں کہ راستے کھلیں اور وہ اپنے خاندانوں کی خیریت جان سکیں، یا توفیق ہو تو خود بھی جاسکیں کتنے فاصلے ہیں۔ یوں صرف ایک گھنٹہ بیس منٹ کا فاصلہ..... جو پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ ہندوستان کتنا قریب ہے مگر کتنا دور ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فاصلے بڑھتے جارہے ہیں کچھ سیاسی مصلحتیں، کچھ سیاسی غلطیاں، کچھ بین الاقوامی طاقتوں کے مفادات کچھ بھارت کے حکمرانوں کی توسیع پسندی کا جنون۔ کچھ پاکستان میں جمہوریت کا فقدان۔ سب عوامل نے مل کر ان ہمسایوں کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ معاہدہ شملہ کے بعد ایک نیا باب شروع کرنے کی خواہش کی گئی ہے، لیکن ماضی کی تلخیاں

راہ میں بار بار دیوار بن رہی ہیں۔ ہندوستان کی خواہش ہے کہ اب کے پاکستان کو شکست ہوئی ہے، اب کے تمام اگلے پچھلے جھگڑے چکا لیے جائیں، اسی لیے پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرنے سے پہلے ہندوستان کی طرف سے مختلف شرائط عائد کی جا رہی ہیں۔ اسے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے فیصلے سے منسلک کیا جا رہا ہے۔ پاکستان بہر حال بنگلہ دیش کو ضرور تسلیم کرے گا، لیکن پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور دوسرے ملکوں کی طرف سے تسلیم کرنے میں بہت فرق ہے، اسی لیے اس میں تاخیر ناگزیر ہے۔ عجلت میں اور دباؤ کے تحت بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے برصغیر میں امن قائم نہیں ہوگا، کیونکہ مجبوری کے تحت کیے گئے فیصلے ہمیشہ عارضی اور وقتی ہوتے ہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم ہوں، پین ایم کی ایئر ہوسٹس چائے وغیرہ کے لیے پوچھتی ہے، میں شکریے کے ساتھ انکار کر دیتا ہوں، رات کے چار بجے بھی کوئی چائے پیتا ہے۔ امریکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بے چاری بھی تو اپنے اس مسافر کی خدمت اسی عرصے میں کر سکتی ہے۔ دہلی ایئر پورٹ آ گئی ہے جمبو جیٹ کے گیئر اچھی خاصی آواز پیدا کرتے ہیں، کپتان نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ گیئر کی آواز ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں شیشے میں سے دہلی ایئر پورٹ کو دیکھ رہا ہوں۔ آخر شب میں پالم ہوائی اڈے پر ہوں۔ آج 13 فروری ہے۔ مقامی وقت پانچ بج کر تیس منٹ ہے۔ کچھ مسافر ٹرانزٹ میں چلے گئے ہیں، اور ہمیں امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزرنا ہے۔ اتنے سارے مسافروں میں سے صرف ایک میں پاکستانی ہوں۔ مسافروں کے خیر مقدم کے لیے ان کے عزیز رشتے دار آئے ہوئے ہیں، اگر بھارت کے فارن آفس (وزارت خارجہ) والوں کو اطلاع مل گئی ہوگی، تو شاید کوئی آیا ہو۔ مگر یہاں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ میں نے آمد کا کارڈ پر کیا۔ خدشے اور وسوسے تو بہت ہیں صحت کے سرٹیفکیٹ دیکھنے والا امیگریشن افسر پہلا بھارتی ہے جس سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ بہت شائستگی سے پیش آتا ہے میرے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ فارن آفس کی طرف سے کوئی اطلاع تو نہیں ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں، یہاں انتظار کر لیجیے گا، امیگریشن کے مرحلے میں بہت تاخیر ہوتی ہے۔

مجھے کارڈ میں نیشنلٹی کے خانے میں پاکستان لکھتے ہوئے دہلی کے ایئر پورٹ پر جتنا فخر محسوس ہوتا ہے۔ شاید ہی زندگی میں کبھی ہوا ہو...... پاکستانیوں کے لیے امیگریشن کے فارم مختلف ہیں آج کل ان کی کبھی کبھار ضرورت پڑتی ہے، اس لیے افسر انہیں ساتھ رکھ کر نہیں بیٹھتے ہیں۔ مجھے امیگریشن افسر نے بیٹھنے کے لیے کہا ہے۔ اس پرواز کے علاوہ ایک اور پرواز کو نبٹانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں انہوں نے اپنی ساری فائلیں دیکھ لی ہیں، میرے بارے میں انہیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ کئی جگہ فون کیے، وقت گزر رہا ہے۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ میں کچھ فون کرنا چاہتا ہوں، ڈائریکٹری میں ایکسٹرنل پبلسٹی کے ڈائریکٹر جے این بھٹ کا فون تلاش کرتا ہوں۔ ڈائریکٹری 1971ء کی چھپی ہوئی ہے، اس میں ان کا نمبر نہیں ہے۔ اپنے ایک اور دوست کے نمبر ڈھونڈتا ہوں، وہ دہلی سے باہر گئے ہوئے ہیں پھر اپنے ایک اور دوست سن بالٹی مور کے بیورو چیف پران سبروال کا نمبر مل جاتا ہے، انہیں فون کرتا ہوں۔ بے انتہا خوش ہوتے ہیں میں صورتِ حال بتاتا ہوں، پوچھتے ہیں کہاں ہو۔

کسٹم کے مرحلے میں۔

"وہیں رکو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"

اس وقت پران سبروال میرے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ پران خالص پنجابی ہیں۔ میں کسٹم سے فارغ ہو کر باہر نکل آیا ہوں۔ ایئر پورٹ کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مجھے ڈالر انڈین کرنسی میں تبدیل کروانا پڑتا ہے ایک ڈالر کے سات روپے اسی پیسے ملتے ہیں۔ ایک ڈالر تقریباً 11 پاکستانی روپوں کا بلا بتایا گیا فرق

پڑ گیا ہے۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلتا ہوں، ٹیکسی ڈرائیور آ لیتے ہیں، صاحب چلیے۔ آپ کو ڈالر کے اچھے پیسے دلوادیں گے۔" اس کے بعد ایک اور ٹیکسی ڈرائیور آتا ہے، وہ بھی یہی پیشکش دہراتا ہے۔ پران کے آنے تک کافی ٹیکسی ڈرائیور یہ پیش کش کر چکے ہیں، ایئرپورٹ کا یہ حصہ کافی بے رونق ہے۔ ہندوستان کی بنی ہوئی ایمبیسیڈر گاڑیاں اور وہیں تیار شدہ فلیٹ کاریں، نظر آتی ہیں، پرائیویٹ بھی اور ٹیکسیاں بھی..... پران مجھے اشوکا ہوٹل لے گئے ہیں، یہاں کمرہ لینے کے بعد پران فارن آفس کو اطلاع دیتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہے، خیر بارہ بجے کے قریب فارن آفس سے ایک صاحب مسٹر سی ڈی شرما آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ساڑھے چار بجے مجھے بھارتی وزارتِ خارجہ کے شعبۂ پاکستان کے انچارج مسٹر اشوک چب سے ملنا ہے۔ میں آپ کو یہیں سے لے جاؤں گا۔ اسی عرصے میں پریس ایشیا انٹرنیشنل کے دیوان بریندر ناتھ اور ان کی بیگم منوراما دیوان بھی تشریف لے آتے ہیں۔ ان سے ملاقات رہتی ہے۔ پھر پران سبروال اور ان کے ایک دوست 'سیکولر ڈیموکریسی' کے ایڈیٹر مسٹر گوئل بھی آ گئے ہیں۔ سیکولر ڈیموکریسی ایک پرچہ ہی نہیں ایک تحریک ہے۔ کانگریس کے رکن پارلیمنٹ شری متی جوشی اس کی قائد ہیں۔ جن سنگھ ان کی سخت مخالف ہے۔ ان کے خلاف اخبر بیانات جاری کرتی رہتی ہے۔ گوئل صاحب سے ملاقات کے بعد پران مجھے فارن آفس لے چلے ہیں۔ دہلی کا سیکریٹریٹ انگریز کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک شکوہ ہے۔ برصغیر کے فنِ تعمیر کا 'مظہر' جدید دور کے سیکریٹریٹ اس طرزِ تعمیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بھارتی حکومت نے دفاتر کے لیے نئی عمارات بنائی ہیں، وہ ان کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ فارن آفس کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھے کنول بخشی سے ملاقات ہوتی ہے، وہ کراچی کے بھارتی ہائی کمیشن میں ہوتے تھے۔ بعد میں اشوک چب صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔ وزارت خارجہ کے جوائنٹ سیکریٹری اور شعبہ پاکستان کے انچارج سے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود مسائل پر بات کر رہا ہوں۔ گفتگو سے انتہائی خلوص جھلک رہا ہے اور باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعتاً پاکستان سے اچھے تعلقات کے خواہشمند ہیں ان کا زور اس بات پر ہے کہ آپس میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے رسل ورسائل اور ذرائع مواصلات کی بحالی ضروری ہے۔ کم از کم اخبارات اور رسائل کا تبادلہ ضروری ہے۔ تاکہ مسائل سے براہ راست آگاہی ہو سکے۔ میں اپنی معلومات کے مطابق ان کی بہت ہی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں، بنگلہ دیش کے مسئلے پر بات ہوتی ہے میں نے کہا کہ میں ذاتی طور پر بھی اور پاکستان کے لوگ بھی جنگی قیدیوں کی واپسی اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں کوئی ربط نہیں سمجھتے، دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور انتہائی بھی۔ بنگلہ دیش کے تسلیم کیے جانے کی بات چل رہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن سے جولائی میں صدر بھٹو کی ملاقات کی بات بھی ہوئی تھی، جس سے شیخ صاحب نے انکار کر دیا اور اس طرح سارا مسئلہ الجھ گیا، اسی لیے یہ مسئلہ پاکستان نے قومی اسمبلی میں پیش نہیں کیا۔ پاکستان کے عوام صدر بھٹو کے اس مؤقف کو حق بجانب خیال کرتے ہیں کہ شیخ صاحب سے صدر بھٹو کی ملاقات پہلے ہونی چاہیے کیونکہ بہت سے مسائل پر پہلے کچھ بات اور مفاہمت ہو جائے۔ جو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے بعد بھی تلخیوں کا سبب بنے رہیں گے اور اس دباؤ اور تلخیوں کے درمیان اگر پاکستان اسلام آباد سے ہی Recognitin کا اعلان کر دے، اس سے تلخی اور نفرت میں کمی نہ ہوگی، اس لیے ہندوستان کو پاکستان پر یہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے بات چیت اچھے دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ انگریزی، پنجابی اور اردو، تینوں زبانیں استعمال کی گئیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ کی طرف سے ایک بھی

تو خیر سگالی کا اظہار نہیں ہوا۔ آپ شہری قیدیوں کو ہی رہا کر دیتے' بچے ہیں، شیر خوار بچے، نوزائیدہ بچے، عورتیں اُن کا کیا قصور ہے۔ ہمارے صحافی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین ہیں پروڈیوسر ہیں۔ یہ تو اپنے ملک میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، صحافیوں کے ساتھ ہمیشہ اخلاقی طور پر کچھ ترجیحی سلوک ہوتا ہے۔ میں نے کہا اردو کے مشہور شاعر حفیظ ہوشیار پوری کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کی بیٹی عصمت، اپنے خاوند کے ساتھ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ہیں، مرتے دم ان کے منہ پر اس بچی کا نام تھا۔ آخر ان لوگوں نے کیا قصور کیا، اور ان کو یرغمال رکھ کر آپ کو کیا ملے گا۔ آپ کی طرف سے کچھ تو خیر سگالی کا مظاہرہ ہو۔

میں نے اپنی بات کہہ ڈالی ہے انہوں نے اپنی بات کہی وہ تو بہر حال سرکاری افسر ہیں، اس لیے سرکار کی ترجمانی ان کا فرض ہے۔ میں نے ایک پاکستان اخبار نویس کی حیثیت سے بات کی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ آپ ہندوستان میں گھومیے، پھریے لوگوں سے ملیے، دیکھیں آپ کیا تاثرات لے کر جاتے ہیں۔

میں اشوکا میں واپس چلا آیا ہوں۔ اب میں سرکاری مہمانداری میں ہوں۔ ہندوستان جانے والے صحافیوں میں بعض کو بھارتی حکومت نے براہِ راست دعوت دی ہے۔ اس میں روزنامہ 'ڈان' کے دو حضرات جو پہلے ہو آئے ہیں اور مزید دو صحافی ہیں، وہ بھی ڈان کے ہی ہیں۔ کچھ صحافیوں کے لیے انہوں نے حکومتِ پاکستان سے کہا کہ وہ کچھ لوگوں کو بھجوائیں۔ ان میں سے دو جا چکے ہیں۔ میں پہلا صحافی ہوں۔ جسے نہ بھارت سرکار نے بلایا ہے اور نہ حکومتِ پاکستان نے بھجوایا ہے۔ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ یہ بھارتی وزارتِ خارجہ کی صوابدید کہ انہوں نے میرے پہنچ جانے کے بعد فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ میرے لیے بھی سرکاری مہمانداری کا انتظام کریں اور یوں مجھے بھارت سرکار کو کافی مالی گزند پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ اشوکا پانچ ستاروں والا ہوٹل ہے۔ بھارت کی سیاحتی کارپوریشن کے زیر انتظام ہے۔ بہت بڑا ہوٹل ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ کمرے ہیں اور بے پناہ سہولتیں ہیں۔

دہلی میں یہ میری پہلی رات ہے، آج کوئی پروگرام نہیں ہے، اس لیے ہوٹل میں ہی رہتا ہوں، ہوٹل کی کھڑکی سے دہلی کی روشنیاں دیکھتا ہوں، جو خاصی مایوس کن ہیں۔ دہلی 'اپنے کو' کچھ جچ نہیں رہا ہے۔ یا یہ شہر کا سب سے ویران حصہ ہے۔

یہ نئی دہلی کی ویران روشنیاں ہیں۔

آج مجھے پرانی دلی میں جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے، اپنے ایک دوست کے عزیزوں کے ہاں کچھ خطوط اور سامان پہنچانا تھا۔ میں ایک ٹیکسی سے کوچہ بلی ماراں پہنچا ہوں۔ اس کے بعد پیدل چلنا ہے۔ یہ پرانی دلی ہے غالب و میر کی۔ یہی وہ کوچے ہیں جو اوراقِ مصور تھے، مسلمانوں کی تاریخ یہاں انگڑائیاں لے رہی ہے، اب یہاں کچھ مکانوں اور دکانوں میں ہندو بھی آ بسے ہیں۔ دلی کے ان کوچوں میں صدیاں سانس لیتی محسوس کی جا سکتی ہیں۔ میں اپنی تاریخ کے اوراق میں گم ہو گیا ہوں، ان کوچوں سے گلیوں سے، حویلیوں سے صدیاں سال، ماہ، دن لمحے کس طرح گزرتے رہے ہیں۔ ان تنگ تنگ کوچوں میں جو اپنائیت ہے، دیواریں جس طرح بغل گیر ہونے کو ہوں، دروازے جیسے نیم وا لب، کھلی اور بڑی سڑکوں جدید بنگلوں میں یہ لگاؤ کہاں ہے، یہاں ٹریفک رینگتا ہے۔ کاریں، ٹیکسیاں تو ادھر آ ہی نہیں پاتیں، سائیکل رکشے، سائیکل، اسکوٹر، ٹھیلے، ریڑھے اور انسان، سب رینگتے ہیں اور کبھی کبھی ایک ٹھہراؤ آتا ہے۔ سب رُک جاتے ہیں، چیخیں شور اور پھر روانی۔

مجھے وہ مکان مل گیا ہے۔ مکین نہیں ملا، امانت ہمسائے کے سپرد کر کے میں تاریخ کے ان اوراق کو تیزی سے الٹتا پھر بیسویں صدی میں لوٹ آیا ہوں، جہاں سے بھاگ رہے ہیں، ٹیکسیاں، گاڑیاں، بسیں۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد آئندہ ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(چوتھا حصہ)

دو پہر کا وقت تھا۔ اونگھتا دکان دار سر جھکائے بیٹھا دوپہر گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس گرمی میں کہاں لوگ کتابیں خریدنے آتے تھے۔ رخسار کے ذہن میں اسی وقت کتاب خریدنے کا خیال آیا تھا۔ سو وہ اسی وقت اردو بازار چلی آئی۔

''جی محترمہ فرمائیں'' دکاندار سیدھا ہو بیٹھا۔

''آپ کے پاس بچوں کی Rhymes کی کتب ہیں؟ رخسار نے پوچھا تھا۔

''جی، جی۔۔۔'' دکاندار بچوں کی کتابوں کے ریک کی طرف گیا تھا۔ ایک ڈھیر سا کتب کا تھا۔

''کتنی عمر ہے آپ کے بچے کی؟

''ساڑھے تین سال، نہیں چار سال'' ہونٹ کاٹتے ہوئے رخسار نے اپنی تصحیح کی تھی۔ سونی جب گم ہوئی تھی تب تین سال سات مہینے کی تھی۔ اب تین مہینے بعد جب وہ تین سال دس مہینے کی ہوگی (جانے ہوگی بھی کہ نہیں) چار سال کہنا درست تھا۔

''سکول جاتا ہے آپ کا بچہ؟''

رخسار نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر محترمہ، آپ ان بکس میں سے چند ایک لے جائیں۔ باتصویر Rhymes ہیں بچے با آسانی یاد کر لیں گے۔'' دکاندار نے چند کتب ڈھیر سے الگ کی تھیں۔ رخسار نے نظموں کی ایک کتاب کھولی۔ ساری کتاب دیکھ لی پر وہ نظم نہ تھی۔

''بھائی دراصل مجھے تتلی ہوں میں تتلی ہوں، ٹھنڈا پانی پیتی ہوں والی Rhyme چاہیے۔'' رخسار نے اب اصل مدعا بیان کیا تھا۔

دکاندار ہنسنے لگا۔

''باجی وہ تو لوکل نظم ہے۔ وہ بھلا کہاں کتابوں میں ملے گی وہ تو ویسے ہی ہر بچے کی زبان پر ہوتی ہے۔''

دکاندار ہنستا ہی رہا۔

''لوکل نظم مطلب؟ مجھے وہ ہی Rhyme چاہیے۔''

''نہیں سوری۔ وہ Rhyme کتابی شکل میں نہ ملے گی آپ ان بکس میں سے کوئی پسند کریں۔ بڑے نامور شعراء نے بچوں کی نفسیات اور پرورش کے اصول مدنظر رکھ کر یہ Rhymes تخلیق کی ہیں۔''

''اردو بازار میں کوئی ایسی شاپ جہاں سے یہ Rhyme مل جائے''۔ رخسار نے لڑکے کی بات کاٹی تھی۔

''نہ باجی۔ بچوں کی Rhyme کی بکس یہیں اردو بازار میں پبلش ہوتی ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں نہ

Rhyme آپ کو نہ ملے گی۔ آپ اپنے بچے کو ویسے ہی کیوں نہیں یاد کرواتیں۔ اس Rhyme کے لیے کتاب کی کیا ضرورت ہے بھلا؟"

رخسار نے دکاندار سے مزید کوئی بات نہ کی چپ کر کے دکان سے نکل گئی۔ لڑکے نے اچنبھے سے رخسار کو دیکھا اور کندھے اچکا کر رہ گیا اور پھر اس کے بعد رخسار نے اردو بازار کے ہر چھوٹے بڑے کتاب گھر سے پتا کیا۔ وہ دکاندار لڑکا صحیح دعویٰ کر رہا تھا۔ رخسار نامراد ہی رہی۔ شکستہ قدموں سے وہ جب اردو بازار سے باہر نکل رہی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سڑک کنارے رک کر اس نے مشرق و مغرب نگاہ دوڑائی تھی۔ شدید گرمی کا عالم تھا۔ پھر بھی لوگوں کے سمندر میں کمی نہ تھی۔ پلکیں جھپکیں تو وہ بھی گیلی ہو گئیں۔ "اس سمندر میں کہاں کھو گئی سونی" آنکھیں پونچھتے ہوئے رخسار سڑک پار کرنے لگی۔

کچھ رخسار نے دھیان نہ دیا اور کچھ گاڑی والا نوجوان اپنے دھن میں تھا۔ پتا بھی نہ چلا اور رخسار گاڑی تلے آ گئی۔ خون میں لت پت رخسار سڑک کے درمیان میں پڑی تڑپ رہی تھی۔ آگے پیچھے کی گاڑیوں نے یکے بعد دیگر بریک لگائے تھے۔ "یہ کیا ہو گیا تھا" جس لڑکے سے حادثہ ہوا تھا اسے آنکھوں دیکھے پر یقین نہ آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

گھر کا شیرازہ کس طرح بکھرا تھا۔ زوار بس خاموش تماشائی سے بڑا کردار ادا نہ کر سکے۔ بیوی جو شادی کے چند دنوں بعد ہی اس قدر محبوب ہو گئی تھی کہ خود سے زیادہ عزیز لگنے لگی تھی بھی ان کی آن میں رخت سفر پر چل دی تھی۔ بیوی کے کندھے کو جنازہ دیتے ہوئے زوار اس قدر روتے تھے کہ لڑکھڑانے لگتے۔

قبر میں اتارنے سے پہلے کفن کھول کر میت کا چہرہ



آخری بار دکھایا گیا۔ زوار نے دیکھا۔ رخسار آرام سے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ دنیا کی تو اسے پروا ہی نہ تھی۔

''آپ نے کبھی میری خوبصورتی کی تعریف نہیں کی'' ماضی کے دریچے وا ہوئے تھے۔

''تم نے بھی تو میری کبھی تعریف نہیں کی'' زوار نے دوبدو جواب دیا تھا۔

''لو بھلا بیوی بھی کبھی شوہر کی خوبصورتی کی تعریف کرتی ہے'' رخسار کا انداز روٹھا تھا۔

''تم کر دو گی تو گناہ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا بھی تو گناہ میرے ذمے۔۔۔۔'' زوار ہنس دیئے۔

''جایئے جناب میں آپ سے نہیں بات کرتی۔'' روٹھے روٹھے انداز میں رخسار اٹھ کر جانے لگی۔ زوار نے ہاتھ بڑھا کر رخسار کا ہاتھ تھام لیا۔

''سوتے ہوئے تم بہت خوبصورت لگتی ہو۔'' زوار کی نگاہیں پر شوق تھیں۔ ''سچ'' رخسار نے بے ساختہ کہا تھا اور پھر اسے خود ہی اپنی بے ساختگی پر شرم آنے لگی۔

''دوبارہ سے ڈھانپ دوں؟'' صفدر بھائی میت کا چہرہ ڈھانپنے سے متعلق پوچھ رہے تھے۔

''زوار نے ایک نظر چہرے پر ڈالی۔ مر کر تو رخسار اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ آنکھیں پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میت کو قبر میں اتارا گیا اور سب لوگ مٹھی بھر بھر کر مٹی ڈالنے لگے۔ محبوب بیوی کی قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے زوار نے کئی بار آنکھیں پونچھیں تھیں۔ قبرستان سے واپسی پر زوار لمحے بھر کو رک کے۔ مڑ کر دیکھا۔ رخسار کی قبر دور تھی۔

''کاش کہ سونی تو بھی رخسار کے ساتھ مر جاتی اور میں تجھے بھی دفنا کر آرہا ہوتا تب درد کچھ یوں تو نہ ہوتا'' آنکھوں کے کٹورے لمحے بھر میں پھر سے آنسوؤں سے لبالب بھر گئے تھے۔

☆......☆......☆

رخسار جس لڑکے کی گاڑی تلے آکر زندگی سے روٹھ چلی تھی۔ وہ امیر و کبیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بین الاقوامی یونیورسٹی سے اپنی مرضی کی ڈگری حاصل کرنے والے لڑکے کے والد محترم صوبائی اسمبلی کے رکن تھے۔

دونوں باپ بیٹے ایک پوری فوج کے ساتھ جنازے میں شریک ہوئے تھے اور اب رخسار کے سوئم کے بعد ہر ایک بار پھر سے زوار کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اثر ورسوخ والے تو وہ اس قدر تھے کہ اگر زوار ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا لیتا تو بھی کیس عدالت میں دوسری سے تیسری ساعت تک ہی پہنچ پاتا لیکن شکست وریخت زوار نے مقدمہ دائر ہی نہ کیا۔

اللہ کی رضا سمجھ کر بس تجہیز و تکفین کے معاملات ہی دیکھتا رہا۔

''جو کچھ ہوا نادانستہ ہوا۔ دانش اچھا ڈرائیور ہے محترمہ خود ہی گاڑی کے سامنے آگئی تھیں۔ پھر بھی دانش آپ سے معافی مانگنے آیا ہے۔ بھاری آواز والے ایم پی اے صاحب کہہ رہے تھے۔ گھنی مونچھوں کی تراش پر کافی محنت صرف کی گئی تھی، واسکٹ بھی کسی اعلیٰ درزی کی سلائی شدہ تھی۔

زوار نے بیزاری سے تمام بات سنی۔ کاندھوں پر لڑھکتے سر کو بمشکل تمام سہارا دیا بولنے کا دل نہ کرتا تھا پر بولنا تو تھا۔

''مجھے کوئی گلہ شکایت غرض نہیں۔ جو ہوا جس کی غلطی تھی کہ نہیں میں بس معاف کرتا ہوں'' زوار نے بات ایک فقرے میں ختم کر دی تھی۔ واسکٹ کی جیب میں چھ ہندسوں والا چیک جو ایم پی اے بطور قصاص لائے تھے لمحے بھر کو ان کا دل چاہا کہ چیک کو جیب میں ہی رہنے دیں۔ لیکن پھر انسانیت آڑے آگئی۔

''یہ آپ کے لیے۔۔۔۔'' صاحب نے چیک جیب سے نکالا تھا اور زوار کی طرف بڑھایا تھا۔ جھکے ہوئے سر والے زوار نے سر اٹھا کر ایک نگاہ چیک پر ڈالی اور دوبارہ سے سر جھکا لیا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ ساتھ لے جائیں۔''

ایم پی اے صاحب کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق تھا اور چند لمحوں بعد چیک دوبارہ سے جیب میں تھا۔

☆......☆......☆

فاخرہ ایک طرح دار لڑکی تھی۔ وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والی، زمانے کے تقاضے پورے کرنے والی۔ متوسط ورکنگ گھرانے کی لڑکی جو آرٹس سبجیکٹ پڑھنے یونیورسٹی جاتی تھی۔ آنکھوں میں ایک خواہش چھپی تھی کہ یونیورسٹی کا کوئی ہینڈسم امیر لڑکا پسند کرلے گا اور گھر رشتہ بھیج دے گا۔ ایسا ہی ہوا ایک ہینڈسم امیر لڑکے نے پسند کیا اور رشتہ بھی بھیجا۔ پر رشتہ فاخرہ کے لیے نہیں بڑی بہن صاعقہ کے لیے تھا۔ فاخرہ دل مسوس کر کے رہ گئی۔ چلو اس بار نہیں اگلی بار سہی۔۔۔۔۔۔ فاخرہ نے دل کو تسلی دی تھی پر قسمت کہ اگلی بار آئی ہی نہیں۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہوگئی۔

گھر بیٹھے ایک پرائیویٹ سکول جوائن کیا۔ بی ایڈ، ایم ایڈ ہوگیا۔ سرکاری سکول میں نشستیں آئیں۔ درخواست جمع کرائی۔ اور وہاں ملازمت مل گئی۔ عمر کی کتنی بہاریں گزر چکی تھیں۔ تبھی تو والدین نے ساجد کے لیے ہاں کر دی تھی۔

ساجد میٹرک پاس تھا۔ اچھا کھاتا کماتا تھا۔ پر فاخرہ کے دل کے مسند پر براجمان نہ ہو سکا۔ ساجد غصے کا تیز تھا تو فاخرہ مزاج کی تیز تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جو مقناطیس کے یکساں قطب قریب قریب لانے سے نکلتا ہے۔ جھگڑے اس قدر بڑھے کہ ڈیڑھ سال کے اندر طلاق ہوگئی اور فاخرہ ایک بار پھر میکے آن بیٹھی۔

ماں پریشان، صبح شام فاخرہ کے نصیب کے لیے دعا مانگتی۔ اٹھتے بیٹھتے فاخرہ کے لیے پریشانی کا اظہار کرتی۔ ایک دن فاخرہ نے تنگ آ کر ماں سے کہہ دیا۔

''کیا ہے امی۔ خود کماتی ہوں۔ اچھے برے کی پہچان ہے۔ مردوں کے شانہ بشانہ چل سکتی ہوں۔ آپ کو پتا نہیں کون سے وہم لاحق ہیں۔''

ماں جو پہلے ہی فاخرہ کے اطوار سے نالاں تھی انگشت بدنداں فاخرہ کو دیکھے گئی۔ حالانکہ یہ باتیں فاخرہ کوئی پہلی بار تھوڑی کر رہی تھی۔

''مردوں کے شانہ بشانہ چلنے سے عورت مرد نہیں بن جاتی۔ زندگی گزارنے کے لیے مرد کی چھاؤں ضروری ہوتی ہے۔'' ماں کی باتوں میں ساری زندگی کا تجربہ تھا۔

''ہونہہ'' فاخرہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

اور شاید یہ ماں کی دعاؤں کے طفیل ہی تھا کہ دور پار کی پہچان سے راشدہ زوار کا رشتہ لے آئیں۔ سلجھا ہوا مرد تھا۔ پی سی او کی نئی دکان کھولی تھی۔ آمدنی زیادہ نہ تھی پر کاروبار بھی تو نیا تھا۔ گھر ذاتی تھا۔ پہلی بیوی کے بعد غم زدہ تو تھا پر ایسے غم تو وقت کی گرد میں دب ہی جاتے ہیں۔

ماں تو سجدہ شکر ہی بجا لائیں۔ فاخرہ نے ناک بھوں تو چڑھائی پر پھر بھی اقرار کرلیا۔ آخر دل میں وہ بھی اس بات سے متفق تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے مرد کی چھاؤں ضروری ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

رخسار کی وفات کے بعد ابتداء میں تو راشدہ پورا مہینہ بچوں سمیت ادھر ہی بھائی کی دل جوئی کے لیے رہیں لیکن بالآخر گھر تو جانا ہی تھا۔ بھائیوں نے بھی بھاوجوں کے ساتھ قیام کیا۔ زوار سے کتنا اصرار کیا کہ ساتھ چلو پر نہ جہلم والے افسر بھائی قائل کر پائے اور نہ ہی اسلام آباد والے ملازم بھائی زوار کو ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ نتیجتاً زوار اکیلے اس گھر میں رہ گئے جوان کا آبائی گھر بھی تھا اور جس سے رخسار اور سونی کی یادیں وابستہ تھیں۔

دن رات میں ڈھلتا جاتا اور رات دن میں تبدیل ہو جاتی اور بس زندگی گزارے جاتے۔ گھر میں پڑے چھت کو تکتے رہتے۔ کبھی کبھی انھیں لگتا کہ رخسار باورچی خانے میں کھڑی کچھ بنا رہی ہے تو کبھی لگتا سونی صحن میں اپنا تین پہیوں والا سائیکل دھکیلتے ہوئے گا رہی ہے۔

تتلی ہوں میں تتلی ہوں۔

پر یہ سب تو سراب ہی ہوتا اور زوار اسی سراب کے دھوکے میں بار بار آجاتے۔ اس بار راشدہ آئیں تو گھر ایک بار پھر سے مٹی سے اٹا ہوا ملا۔ زوار کے کپڑے اس قدر میلے تھے کہ ان کی اصل رنگت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی آتے ہی کام میں جت جانے کی بجائے راشدہ بھائی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئیں اور رونے لگ گئیں۔

''آپا رو رہی مت۔'' کتنی دیر راشدہ روتی رہیں تب زوار کو خیال آیا اور راشدہ نے اسی پر اکتفا کیا کہ زوار خود سے تو بولے۔

''یہ کیا حال بنالیا ہے زوار۔''

''کیا ہوا میرے حال کو کچھ بھی تو نہیں'' زوار کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ آن ٹھہری۔ راشدہ تاسف سے بھائی کو دیکھتی رہ گئیں۔

''ایسے کیسے زندگی گزرے گی زوار۔''

''بس گزر جائے گی آپا'' زوار کو جیسے اس موضوع سے دلچسپی نہ تھی۔

''مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا زوار۔'' راشدہ تلخ ہونے لگی تھیں۔

''اور تم گم ہونے والوں کے ساتھ؟ ان کے ساتھ کیا نہیں کیا جاتا؟'' زوار دو بدو بولے تو راشدہ کے لہجے کی تلخی لمحے بھر میں منت میں بدل گئی۔

''ایسے مت کرو زوار۔ تمہارا یہ حال ہوتا ہے تو میرا دل ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ وہاں گاؤں میں بھی ہر وقت تمہارا غم ہی کھائے رہتا ہے۔ رات کو نیند بھی نہیں آتی۔'' راشدہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔ زوار بے تاثر چہرہ لیے راشدہ کو روتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کئی ثانیے ایسے ہی گزر گئے۔ راشدہ روتی رہیں۔ روتے روتے خود ہی چپ کر گئیں۔ زوار ٹس سے مس بیٹھے رہے۔

''بہن کے حال پر ہی رحم کرو۔'' راشدہ بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔ کافی دیر سے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے زوار اچانک ہی بولے۔

''بتائیں آپا کیا کروں؟'' انداز بہر حال ابھی بھی تاثرات سے عاری تھے پر راشدہ کو یہ بھی غنیمت لگا۔

''میں کپڑے نکال دیتی ہوں نہا دھو کر آؤ۔ مدت ہوئی اپنے بھائی کو سجا سنورا نہیں دیکھا۔'' راشدہ کپڑے نکال لائیں۔ زوار نے میکانکی انداز میں کپڑے پکڑے اور غسل خانے میں گھس گئے۔

بس پھر اسی طرح راشدہ تھوڑا تھوڑا آہستہ آہستہ زوار کو زندگی کی طرف مائل کرتی رہیں۔ بھائی بھی مسلسل رابطے میں رہے۔ مہ و سال کا سفر جاری رہا۔

راشدہ نے روزگار کی طرف بھی توجہ دلائی۔ زوار اب ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کوئی آسان سا کام کرنے پر رضامند ہوئے۔ باہمی مشورے سے یہی طے پایا کہ پی سی او کھول لیا جائے۔ چنانچہ پی سی او کھل گیا۔ کچھ آمدنی ہونے لگی تو راشدہ زوار کو دوسری شادی کے لیے راضی کرنے لگیں۔ شادی کے لیے قطعی طور پر ناں سے ہچکدار ناں اور پھر ہچکدار ناں سے ہاں تک کا سفر آسانی سے طے نہیں ہوا تھا اور پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب فاخرہ نے زوار کی دوسری بیوی بن کر اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھے تھے۔ زندگی کے سکے کا دوسرا رخ الگ رنگ لیے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

دروازے پر کھٹکے کی آواز زوار کو ماضی سے حال میں لے آئی۔ دروازہ کھول کر اندر آنے والا اسفر تھا۔ نظریں چراتا اسفر۔ شرمندگی اس کی ہر ہر حرکت سے واضح تھی۔ آرام کرسی پر جھولتے زوار نے شرمندہ سے بیٹے کو دیکھا جو کمرے کے وسط میں کھڑا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

''رک کیوں گئے ادھر آؤ۔'' زوار نے کرسی جھلانا بند کی۔ اسفر قدم قدم چلتا زوار کے سامنے پڑی چارپائی پر ٹک گیا۔

''ابو آپ سے معذرت کرنا چاہتا ہوں'' اسفر نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اسفر بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہنے کو جیسے الفاظ ہی نہ ملتے تھے۔

زوار دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اسفر کو دیکھتے رہے۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو شاید میں نے غفلت برتی'' زوار کی آواز مدھم تھی۔

''زندگی اتنی سیدھی نہیں ہوتی جتنی ہم سوچتے ہیں۔ وہ کچھ ہو جاتا ہے جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔'' زوار نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور پھر سے کرسی جھلانے لگے۔

سر اٹھا کر اسفر نے باپ کو دیکھا تھا۔ درد کی تحریر جیسے چہرے کی جھریوں کا حصہ تھی۔ اسفر کی شرمندگی

میں مزید اضافہ ہوا تھا۔
''سونی میری پہلی اولاد تھی۔ پہلی اولاد تو یوں بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ آج اسے کھوئے ہوئے کتنے سال گزر چکے ہیں۔ اتنے سال کہ بندہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ سوچتا ہوں کہاں ہوگی کیسی ہوگی، ہوگی بھی کہ نہیں۔۔۔۔'' زوار ربط بے ربط بولتے جاتے تھے۔
''اس حادثے نے مجھے کبھی سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ زمانہ بدل گیا۔ زمانے کے انداز بدل گئے۔ مگر میں زندگی کے اسی موڑ پر کھڑا رہا جہاں میری چھوٹی سی بیٹی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اور میں آئس کریم کھانے جائیں گے۔''
''میں نے زندگی کا سامان کرنے کے لیے پی سی او کی دکان کھولی تھی۔ وقت نے پی سی او کو موبائل شاپ میں بدل دیا۔ یہ تبدیلی وقت لایا میں تو بس وقت کے دھارے پر رہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو میرے ہوتے بھی تم نے یتیموں کی طرح زندگی گزاری۔''
آرام کرسی جھول رہی تھی۔ سر جھکائے بیٹھے اسفر نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو آنکھوں تک محدود رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پر کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی تو اسفر سسک کر رو پڑا۔ ''ابو مجھے معاف کردیں۔ اتنا بڑا بول بول گیا، آپ کا دل دکھایا'' زوار نے کرسی جھلانا بند کی۔ آگے کھسکے تھے۔ روتے ہوئے بیٹے کے آنسو خود ہاتھ بڑھا کر صاف کیے تھے اور کندھا تھپکا تھا۔
''چلو اٹھو پانی پیو۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔'' زوار نے ایک بار پھر کندھا تھپکا تھا۔ اسفر اٹھ کر جانے لگا تو پیچھے سے زوار کی آواز سنائی دی۔
''پانی پی کر ادھر ہی آنا اور مجھے بتانا کہ زندگی کے کون سے نشیب ہیں جنھوں نے میرے بیٹے کو تنگ کیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے میں اپنے بیٹے کی مدد کرسکوں گا'' اسفر لمحے بھر کو رکا۔ اثبات میں سر ہلایا اور پانی پینے کچن کی طرف چل دیا۔
پانی پی کر جب وہ دوبارہ سے باپ کے پاس آن بیٹھا تو بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں کہا۔ آخر باپ کو کیا بتاتا۔ کیا یہ جڑواں بہن کلاس میں اس سے آگے ہے جس کی وجہ سے وہ حسد اور احساسِ کمتری کا شکار ہے یا پھر جواد کا قصہ سناتا۔ یا پھر یہ بتاتا ماں بیٹی کو بیٹے پر فوقیت دیتی ہے۔ کچھ بھی تو بتانے لائق نہ تھا۔ آخر یہ باتیں کہاں کہی جاسکتی ہیں۔ یونہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔
''بتاؤ اسفر کیا مسئلہ ہے؟'' زوار کافی دیر اسفر کے بولنے کا انتظار کرتے رہے تھے۔ ''سوری ابو بس میرا دماغ خراب تھا۔ یونہی کہہ دیا کوئی مسئلہ نہیں''
''یوں بات نہ چھپاؤ۔ میں تمھاری مدد کرپاؤں گا''
''نہیں ابو کوئی بات نہیں'' اسفر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور زوار اسے دیکھ کر رہ گئے۔

☆......☆......☆

کالج کی رنگینی جوں کی توں تھی۔
زندگی میں اعلیٰ مقام لینے کے لیے طلباء پڑھائی پر خوب توجہ دیتے تھے پر ساتھ ساتھ زندگی کے مزے بھی لوٹتے تھے۔
کبھی کبھار لیکچر بنک کرلینا۔ کینٹین جاکر چھین جھپٹ کر سموسے کھانا، گھاس کے قطعے پر بیٹھ کر پڑھائی کے نام پر گھنٹوں باتیں کرنا۔ لڑکوں کا دھوپ میں کرکٹ کھیلنا اور لڑکیوں کا نئے فیشن ڈسکس کرنا۔ سب کچھ تو ویسے کا ویسا لگتا تھا۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ ہاں البتہ کلاس کے ابتداء میں بننے والا دو لڑکوں اور دو لڑکیوں پر مشتمل گروپ اب گروپ نہ رہا تھا۔
ایک دعا ہی تھی جو یوں اچانک گروپ کی unity ختم ہونے پر حیران بھی ہوئی اور وجہ ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ پر وجہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ اس نے گروپ کو پھر سے جوڑنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ پر ہر ٹوٹی ہوئی چیز کہاں جڑتی ہے۔
گروپ ٹوٹنے کے بعد بھی جواد اور سدرہ کی بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ کبھی لائبریری میں، کبھی گھاس کے کسی قطعے میں، کبھی آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر تو کبھی ڈسکشن ہال میں۔۔۔۔ کلاس میں چہ مگوئیاں بھی ہونے لگی تھیں۔ جواد اور سدرہ کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر دیگر فیلوز معنی خیز نظروں کا تبادلہ بھی کرتے پر سدرہ

اور جواد دونوں کو پروا نہ تھی۔ چپ چاپ اکیلا بیٹھا اسفر کتاب دیکھتا رہتا اور پڑھتا رہا۔ وہ پھر سے ویسے ہی اکیلا ہو گیا جیسے سکول کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

دعا نے پوری کوشش کی کہ ایک بار پھر سے پہلے کی طرح اسفر سے وہی بے تکلفی ہو جائے جو گروپ میں ہوتے ہوئے تھی۔ پر اسفر نے بھی دھیان ہی نہ دیا۔

''کیسے ہو اسفر؟'' دعا آتے ہی پرجوش سے انداز میں اسفر سے پوچھتی۔

اسفر بس اثبات میں سر ہلا دیتا۔ پتا نہیں اس طرح سر ہلانے کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

''اسفر کیا پڑھ رہے ہو؟'' دعا اسفر کی کتاب دیکھنے کی کوشش کرتی۔

''کچھ نہیں'' اسفر کچھ پڑھ بھی رہا ہوتا تو کتاب بند کر کے اٹھ کھڑا ہوتا اور دعا مایوس سی بیٹھی رہتی۔

گروپ بنا اور پھر ٹوٹ گیا۔ پر جواد اور سدرہ کی ہم آہنگی برقرار رہی۔ اسفر لاتعلق ہو گیا۔ کلاس میں چہ مگوئیاں بھی ہو رہی تھیں۔ دعا جب کڑیاں ملاتی تو تصویر تو پوری بن جاتی پر وہ خود ہی نظریں چرا لیتی۔

وقت یوں ہی سرکتا رہا۔ یہاں تک کہ امتحانات کے دن آ گئے۔ کالج میں چھٹیاں ہو گئیں اور طلبا گھروں میں بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرنے لگے۔

☆......☆......☆

ردا کو بچپن سے صحافت کا شعبہ پسند تھا۔ اسی لیے اس نے یونیورسٹی میں صحافت کا مضمون چنا تھا۔ جس کام میں انسان کو دلچسپی ہو یوں بھی وہ دلجمعی سے کرتا ہے۔ اسی لیے ردا یونیورسٹی میں نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی اور بیشتر سمسٹر میں پوزیشن اپنے نام کی۔

یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہوئی اور پروفیشنل لائف شروع کرنے کا وقت آیا تو والد صاحب نے خوب مخالفت کی۔ پچھلی حکومت میڈیا کو آزادی کا تحفہ دے گئی تھی۔ والد صاحب کی نظروں میں اب صحافت محفوظ شعبہ نہیں تھا۔

''نہیں بیٹا کرائم جرنلزم کو منتخب کرنے کے حق میں میں بالکل نہیں ہوں''

''کیوں ڈیڈ'' ردا اکتائی ہوئی تھی۔ یہ گفتگو باپ بیٹی میں کوئی پہلی دفعہ تھوڑی ہو رہی تھی۔

''تم جانتی ہو سب'' والد صاحب اپنے تئیں جیسے فیصلہ کر چکے تھے۔ ساتھ پڑا ریموٹ اٹھا کر سامنے دیوار میں نصب ٹی وی آن کی اور اپنا پسندیدہ نیوز چینل لگایا۔

ردا نے جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ اٹھ کر باپ کے سامنے پڑی گول میز پر آ بیٹھی۔

''ردا۔۔۔ نیوز دیکھنے دو۔''

ردا یوں ہی سامنے بیٹھی رہی۔

''ڈیڈ جب میں آپ کے پسندیدہ نیوز چینل پر بطور نیوز کاسٹر خبروں سے آگاہ کیا کروں گی تو آپ کیسا محسوس کریں گے'' ردا ہونٹ پھیلا کر کہہ رہی تھی۔ لہجے میں خوشامد کا عرق گھلنے لگا تھا۔

والد صاحب بھنویں سکیڑیں بیٹی کو گھورے گئے۔

''اور جب میرے ہوسٹ کیے ہوئے شوز کی دھوم ہو گی۔ لوگ حامد میر اور مبشر لقمان کے ساتھ میرا نام لیا کریں گے تب آپ کیسا محسوس کریں گے۔''

والد صاحب کی چتون تھوڑی اور تیز ہوئی تھی۔

''کیسے فخر سے آپ بتایا کریں گے ردا فاروق میری بیٹی ہے۔ انفیکٹ میرے نام پر ہی تو میری بیٹی کا سیکنڈ نیم فاروق ہے۔'' فاروق احمد یونہی چند ثانیے ردا کو گھورتے رہے اور پھر بولے۔

''شوبز بزنس رپورٹر بن جاؤ۔ وہ کتنا دلچسپ فیلڈ ہے۔ ینگ جنریشن تو یوں بھی سیلیبریٹیز کے لیے پاگل ہوتی ہے۔'' ردا کے مسکراتے لب سیکنڈوں میں بھینچ گئے۔ چہرے کے تاثرات ایسے ہو گئے جیسے کوئی کڑوی کونین کی گولی زبان پر رکھ دی ہو۔

''شوبز رپورٹر بھی کوئی رپورٹر ہوتا ہے۔ ہونہہ چیچہ گیری۔ مجھے نفرت ہے شوبز اور شوبز رپورٹنگ سے۔''

''کرائم فیلڈ لڑکیوں کے لیے اچھی نہیں'' فاروق سیدھے ہو بیٹھے۔

''کیا لڑکا لڑکی ڈیڈ، ہم سب انسان ہیں۔ آپ یہ پرانی صدی کی باتیں نہ کریں۔ لڑکیاں لڑکوں سے

کم نہیں ہوتیں۔''

''جب تم فیصلہ کر چکی ہو تو مجھے کیوں قائل کر رہی ہو۔'' اس باران کے لہجے میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''ڈیڈ آپ تو خفا ہو گئے۔'' ردا میز سے اٹھ کر باپ کے پہلو میں آ بیٹھی اور اپنا سر باپ کے کندھے سے ٹکا دیا۔

یہ شوق میرے بچپن کا Passion ہے اور آپ کی نیوز میں دلچسپی دیکھ کر ہی تو پیدا ہوا ہے۔ اگر اب جوائن نہ کیا تو ساری زندگی کسک رہے گی۔ پلیز ڈیڈ......''

ردا کے لہجے میں منت اتر آئی۔

اپنے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی بیٹی کا محبت بھرا لمس فاروق احمد کو موم بنانے کے لیے کافی تھا۔

''اور اگر خدانخواستہ میری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو......'' فاروق ردا کا سر تھپتھپا رہے تھے۔

''کچھ نہیں ہوتا ڈیڈ۔ آپ ہیں نا۔'' ردا نے سر اٹھایا۔ بچوں جیسا جوش اس کے چہرے پر عود آیا تھا اور فاروق احمد کے لب مسکرا اٹھے تھے۔

☆......☆......☆

با اعتماد تھی۔ دلچسپی رکھتی تھی۔ ٹیلنٹڈ تھی۔ اچھی سی صحافت کی ڈگری ہاتھوں میں تھی تو کیونکر چینل والے موقع نہ دیتے۔ چنانچہ ردا کو ٹرائل کے طور پر رکھ لیا۔ خوبصورت لب و لہجہ، با اعتماد انداز، آنے والے مہمان کی صرف ظاہری نہیں بلکہ دل سے عزت، کرنٹ افیئرز کے حل ڈھونڈنے کی کوشش۔ شو مقبول ہونے میں بہت زیادہ وقت نہ لگا اور ایک سال کے اندر وہ ٹاپ فائیو کے شوز کی ریٹنگ میں تھا۔ بلاشبہ ناقد ابھی ردا کے انداز کو بچگانہ قرار دیتے تھے لیکن بہر حال مقبولیت تو تھی۔

ردا خوش تھی ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کرتی اور کوشش کرتی کہ ہر شو میں نہ صرف ناظرین کے لیے کوئی اہم سبق ہو بلکہ خود بھی کچھ سیکھ کر جائے۔

چھٹی کے دن اس کی یونیورسٹی کی سہیلیوں نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ وہ رات کے وقت وہ ہوٹلنگ کے لیے شہر کے اس مشہور روڈ کی طرف چلے آئے۔

اس روڈ پر ایک سرے پر کچھ بنی سنوری عورتیں رات گئے کھڑی ہوتی تھیں۔ بچپن میں جب کبھی ادھر آنا ہوتا یوں عورتوں کا کھڑا ہونا ناقابل فہم ہی لگتا۔ لیکن جیسے جیسے شعور کی منزلیں طے ہوتی گئیں ادراک ہوتا گیا......

کھانا کھا کر جب سہیلیاں اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوئیں اور ردا بھی اپنی گاڑی میں آ بیٹھی۔ ابھی اس کی گاڑی رینگ ہی رہی تھی کہ اس نے فٹ پاتھ پر ایک منظر دیکھا۔

سرخ اور پیلے بلاؤز والی ساڑھی باندھے دراز قد لڑکی جس کا میک اپ چنچل سا تھا اسے ایک ڈیسنٹ سے لڑکے نے تھپڑ مارا تھا اور پھر اس کا گلا دبوچ لیا۔ ردا ٹریفک کی دوسری سمت میں تھی۔ لیکن اس نے کنارے پر گاڑی روکی۔

لڑکا کچھ دیر غراتا کہتا رہا اور پھر اپنی گاڑی میں یہ جا وہ جا۔ ردا چند ثانیے گلا سہلاتی لڑکی کو دیکھتی رہی جس کا پلو ڈھلکا جا رہا تھا۔

یقیناً وہ لڑکی Prostitute تھی اور اس کو یوں مار کر جانے والا کون تھا؟ ایک ناپسندیدگی کی لہر نے ردا کے گرد حصار بنایا تھا۔ تب پہلی بار اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اسے معاشرے کے اس پہلو پر کام کرنا چاہیے، ممکن ہے وہ کچھ کر پائے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح رزلٹ تھا جب آدھی رات کو اسفر کی آنکھ کھلی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے میٹرک کے رزلٹ سے پہلے والی رات کو کھلی تھی۔

سدرہ بھی ویسے ہی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بے آواز قدموں چلتا صحن میں آیا اور کرسی دھکیل کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر گول ٹکیہ سا ٹھنڈک بھری روشنی والا چاند آسودہ حال تھا۔ اسفر کو یاد آیا کہ میٹرک کے رزلٹ والی رات بھی پورا چاند تھا اور آج رات بھی۔''

میٹرک کے رزلٹ والی رات اٹھ کر اس نے تہجد ادا کی تھی اور آج رات......

آج رات اس نے تہجد ادا نہ کی۔ جیسے اسے معلوم

تھا کہ خدا اس کی دو رکعت تہجد کے بدلے اسے زیادہ مارکس نہ دے گا۔

صبح رزلٹ کے لیے وہ بورڈ کے دفتر کے باہر جا کر نہ بیٹھا۔ رزلٹ کو گھر نیٹ پر دیکھ لیا۔ ایف ایس سی فرسٹ ائیر کا رزلٹ میٹرک کے رزلٹ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ سدرہ کے نمبر نوے فیصد سے بھی زیادہ تھے اور وہ ستر فیصد تک ہی حاصل کر پایا تھا۔

کم نمبرز پر نہ رویا، نہ گڑگڑایا، چپ چاپ معمول کے کام جاری رکھے۔ دل میں جلن تو تھی لیکن وہ اس طرف دھیان ہی نہ دیتا تھا۔

''اسفر اتنے تھوڑے نمبرز تم نے مجھے مایوس ہی کیا ہے'' فاخرہ حد سے زیادہ مایوس ہوئی تھیں۔

اسفر کو شرمندگی تو ہوئی تھی پر اب کیا کر سکتا تھا۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ''زندگی ایک ریس ہے اور تم اس ریس میں بہت پیچھے ہو اسفر۔ یہی حال رہا تو آگے زندگی میں کیسے بڑھو گے۔''

''میڈیکل کالج میں داخلہ تو اب ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی اگر سیکنڈ ائیر میں نمبرز اچھے آگئے تو فرسٹ ائیر Repeat کر لینا'' فاخرہ کے لہجے سے اداسی عیاں تھی۔ بے دلی سے انھوں نے ریموٹ اٹھایا اور چینل پر چینل گھمانے لگیں۔

زوار بھی فون پر بچوں کے نمبرز پوچھ چکے تھے۔ شام کو آئے تو ساتھ کیک، مٹھائی اور دوسری میٹھی چیزیں لیتے آئے۔

''تم دونوں کو یہ کامیابی مبارک ہو'' زوار نے باری باری دونوں بچوں کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

''اسفر تم کم نمبروں پر پریشان مت ہونا۔ میں جانتا ہوں میرے بیٹے نے کم محنت نہیں کی۔'' زوار نے بیٹے کو ساتھ لگا لیا۔ اسفر جذبات سے عاری چہرہ لیے بیٹھا رہا۔

''نمبر کم ہونے پر میڈیکل میں ایڈمیشن نہ بھی ہوا تو کیا ہوگا اور بھی بہت سے اچھے پروفیشن ہیں۔'' زوار میں اب کافی تبدیلی آچکی تھی۔ اپنی ذات میں گم رہنا اور صرف سوئی کو سوچتے رہنا۔ اب یہ باتیں نہ تھیں۔ گھریلو معاملات خصوصاً اسفر کی باتوں میں وہ دلچسپی لیتے تھے۔

''لو زوار اب کیا کہوں! اسفر کے کم نمبرز پر تو میں جتنا افسوس کروں کم ہے۔ کتنی خواہش تھی دونوں بچوں کو ڈاکٹرز بناؤں گی لیکن۔۔۔۔۔'' فاخرہ نفاست سے کیک کھاتے ہوئے اپنے افسوس کا اظہار کر رہی تھیں۔ سدرہ اور اسفر بھی ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک کا چہرہ خوشی سے سرخ انار تھا تو دوسرے کا چہرہ کسی قسم کے احساسات سے عاری تھا۔

زوار کو فاخرہ کی بات اچھی نہ لگی۔ یوں اسفر کے سامنے فاخرہ کا بار بار کہنا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ فاخرہ کو کچھ نہ کہہ پائے۔

''اچھا اسفر اب سیکنڈ ائیر میں تھوڑے زیادہ نمبر لینا۔ میڈیکل کالج میں داخلہ نہ سہی یونیورسٹی میں کسی اچھی فیلڈ میں داخلہ ہو جائے اب یہ نہ ہو کہ تمہیں بھی اپنے ابو کی طرح دکان دار بننا پڑے۔'' کیک کا ٹکڑا فاخرہ سے پورا نہ کھایا گیا اور اس نے پلیٹ میں رکھ دیا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی فاخرہ نے نہ کرتے ہوئے بھی زوار کی تضحیک کر دی تھی۔

''ہائے ساری سیونگز خرچ کر کے تمہارا اس مہنگے کالج میں داخلہ کروایا تھا۔ سارے پیسے ضائع ہو گئے'' فاخرہ اب پیسوں کا غم منا رہی تھیں۔

باپ بیٹا خاموش تھے اور سدرہ فون پر میسج لکھتے ہوئے جواد کو شاندار نمبروں کی مبارکباد دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات کو دعا نے سدرہ کو فون کیا تھا۔

''مبارک ہو سدرہ''

''تمہیں بھی بہت مبارک ہو۔ میڈیکل کالج تمہارا انتظار کر رہا ہے'' سدرہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ مسکرا تو دعا بھی رہی تھی مگر اس کی مسکراہٹ میں وہ کاملیت نہ تھی۔

''اچھا سدرہ یہ بتاؤ اسفر زیادہ اداس تو نہیں'' دعا مدعے پر آئی تھی۔

''نہیں یار۔۔۔ ٹھیک ہے۔ فلیٹ رسپانس ہے۔ میٹرک کی دفعہ کی طرح اس نے واویلا نہیں مچایا، توڑ پھوڑ بھی نہیں کی۔'' سدرہ سر جھٹک کر بولی تھی۔

موبائل کان سے لگا وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

دعا چند لمحے خاموش رہی۔

''ویسے سدرہ اسفر کے ایسے کم نمبر بھی نہیں۔ خدا کی مرضی جس کے دامن میں جتنی نعمت دے۔ تم ان بچوں کو بھی دیکھو جو ایف ایس سی کر ہی نہیں پاتے۔''

دعا کی بات سن کر سدرہ کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آگئی۔ سمجھتی تھی کہ دعا اسفر کی کیوں وکالت کر رہی ہے۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو، پر اب آس پاس سب کے اچھے نمبر آتے ہیں ایک اس بے چارے کے کم نمبر آئیں تو بندے کو احساس کمتری تو ہوگی نا۔'' سدرہ نے جان بوجھ کر چن چن کر لفظ استعمال کیے۔

''سدرہ تھوڑی عقل سے کام لو تمہارا بھائی ہے۔ اس طرح مت کہو۔ یہ بے چارہ کیا ہوتا ہے ایسی باتیں کرو گی تو وہ نہ ہوا تو بھی احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا۔'' دعا نے سدرہ کو تھوڑا سمجھایا تھا۔

''ہونہہ'' سدرہ نے پہلو بدلا تھا۔

''اچھا دعا میری جواد سے بات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسی فیصد سے زیادہ مارکس لینے والے فیلوز کو وہ گھر بون فائر پر بلائے گا تم چلو گی نا.....''

''یہ نمبر کی بنیاد پر انوائٹ کرنا مجھے سمجھ نہیں آیا۔ کیا اسفر کو نہیں بلائے گا وہ دونوں تو دوست ہیں۔'' دعا کو عجیب لگا۔ حالانکہ ایسی باتوں کو ایک سال سے زیادہ ہو چکا تھا اب تک اسے عادی ہو جانا چاہیے تھا۔

''پتا نہیں۔ تم اپنی بات کرو تم جاؤ گی نا۔''

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اچھا سدرہ پھر بات کروں گی۔'' دعا نے بددل ہو فون بند کر دیا۔

موبائل ہاتھ میں لیے وہ غیر مرئی سوچوں میں الجھی کتنی دیر یونہی بیٹھی رہی تھی۔

☆......☆......☆

روا چنبیلی سے ملنے اس کے گھر آئی تھی۔

تنگ تاریک گلیوں والے علاقے میں اکثر و بیشتر گھروں کی کھڑکیوں کے دونوں کواڑ وا تھے۔ کھڑکیوں سیا ہر لٹکے رنگیلے باریک پردے ہوا کے دوش پر لہراتے تھے۔

چنبیلی کا گھر چھوٹا تھا۔ سیل سے اٹا ہوا۔ ایک بساندتی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی۔ روا نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان لوگوں کو احساس نہ ہو کہ وہ بو محسوس کر رہی ہے۔

چار لڑکیاں اور ایک خواجہ سرا بھی گھر پر تھے۔

رانی نے یوں استقبال کیا جیسے عموماً گھر کے بڑے کرتے ہیں۔ چندہ اور چنبیلی نے روا کو اپنے کمرے میں بٹھایا۔ سیفی کو بازار دوڑایا۔ سیفی سامان لے کر آیا تو چھوٹی سی میز سموسوں، پیسٹریوں اور نمکو سے بھری پلیٹوں سے سجا دی گئی۔

چندہ اور چنبیلی بار بار اسے اصرار کرنے لگیں کہ روا کچھ لے۔

ایک تو حفظان صحت کے اصولوں کا مسئلہ تھا۔ وہ چیزیں باسی اور جراثیم سے آلودہ لگ رہی تھیں اور دوسرا پتا نہیں کس کمائی سے خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔

روا اس لیے احتراز کر رہی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں باجی آپ یہ کیوں نہیں کھا رہیں۔ سوچتی ہوں گی کہ کس طرح غلط کمائی کے پیسوں والی چیزیں کھائیں۔'' چنبیلی ہنس کر کہہ رہی تھی۔

''نہیں نہیں ایسی بات نہیں.....'' پھیکے لہجے میں کہتے ہوئے روا نے ایک سموسہ اٹھا لیا اور کھانے لگی۔ سموسے کی Filling میں نمک زیادہ تھا۔

''چلو باجی تم نے ہمارے خلوص کا تو مان رکھا۔'' چنبیلی نے کہا تھا۔

''یہ گھر کس کی ملکیت ہے؟'' روا نے سوال کیا تھا۔

''ملکیت کا کیا کہیں باجی۔ نوید کے نام تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے نام کروایا تھا۔ بڑے جھگڑے ہوئے تھے۔ تب تو ہم چھوٹے تھے پر تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔'' روا سر ہلا کر ایک بار پھر جائزہ لینے لگی۔

''نوید کے مرنے کے بعد ابھی تک ملکیت کی کبھی بات تو نہیں ہوئی ویسے نوید کو مرے ہوئے کونسی صدیاں ہوئی ہیں ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے۔''

''تو یدا کون تھا؟'' ردا نے پوچھا تھا۔

''وہ جو ہماری زندگی اس طرف لایا۔''

''کیسے؟؟''

''سب بتائیں گے باجی سب، اتنی جلدی نہ کرو۔''

اتنے میں سموسہ ختم ہوگیا اور ردا نے شکر ادا کیا کہ اسے Vomit نہ ہوا۔

''اور تمہاری وہ سہیلی سونی جس کی لاش۔۔۔۔۔''

''ہاں باجی اب سونی بہت یاد آتی ہے۔ بڑی سیدھی لڑکی تھی۔۔۔۔''

یوں کچھ بے ربط باتیں ہوئیں اور پھر چنبیلی نے اپنی داستان سنانا شروع کی۔ وہاں سے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

کیمسٹری کی لیب میں چھوٹی بڑی شیشیوں میں پڑے رنگ برنگے محلولوں کی بہتات تھی۔ ٹیچر نے ہاتھ میں پکڑے محلول کو نیچے شعلے کی آنچ پر پڑے محلول میں گرایا۔ شوشو کی آواز پوری لیب میں گونجنے لگی۔ ساتھ ہی ایک ناگوار بو ہر طرف پھیل گئی۔

ٹیچر دونوں کے محلول خواص بتانے لگے اور ان دونوں کے کیمیائی عمل سے بننے والے مرکب کی اہمیت کے بارے میں بتانے لگے پیچھے کھڑے اسفر نے اپنا وزن ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں کو منتقل کیا تھا۔

پریکٹیکلز عموماً گروپس میں ہوتے تھے۔ صد شکر کہ اس کے گروپ میں سدرہ اور جواد نہ تھے۔ فرسٹ ائیر میں کم نمبر لینے کے بعد پڑھائی سے جیسے اس کا دل ہی اٹھ گیا تھا۔ سو اب وہ دل و جان سے محنت نہ کرتا تھا۔ بس پڑھ لیا تو پڑھ لیا ورنہ گزارا کرلیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب اس کے مزید کم نمبر آنے لگے تھے ٹیچر ابھی بھی کچھ سمجھا رہا تھا لیکن ان کی توجہ کا محور آگے کھڑے ہوئے ذہین طلباء ہی تھے۔ وہ طلباء!! جن میں سے بیشتر کا نام بورڈ آف آنرز پر لکھا جانے اولا تھا اسفر جیسے متوسط طلباء سے ٹیچرز کو کہاں دلچسپی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے طلباء کا نظرانداز ہونا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی۔

جب اسفر یوں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا اور یہ بے کار کا پریکٹیکل ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔ اسفر کی اکتاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ ٹیچر کچھ اٹھانے کے لیے مڑا۔ طلباء کی طرف اس کی پشت ہوئی تو لیب کا دروازہ بھی پاس ہی تھا۔ اگر وہ نکل لیتا تو قوی امکان تھا کہ ٹیچر کو پتا نہ چلتا۔ دبے پاؤں چلتا وہ دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل آیا۔

چہرہ جھکائے قدم قدم لیب کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے یہ نہ دیکھا کہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کون آرہا ہے۔ پر سیڑھیاں چڑھ کر آنے والے جواد نے اسفر کو دیکھ لیا تھا اور اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اسفر دیکھ چکا ہے۔

جب دونوں آمنے سامنے بالمقابل ہوئے تو جواد رک گیا۔ تبھی اسفر نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو سامنے جواد تھا۔

جینز کی پینٹ اور جینز کی شرٹ، بالوں کا ہیر اسٹائل ایسا کہ عام لڑکا بنا ہی نہ پائے۔ مدت بعد دونوں لڑکے یوں آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ اسفر نے نگاہوں کا زاویہ تبدیل اور چپ چاپ اترنے لگا۔

''اسفر'' اسفر ابھی دو تین قدم ہی نیچے اترا تھا کہ پیچھے سے جواد نے آواز لگائی تھی۔ اسفر رک گیا۔

''یار ایسی بھی کیا بے رخی، ہم دوست رہ چکے ہیں اور ممکن ہیں کہ رشتہ دار بھی بن جائیں۔''

جواد کے والدین ایک بار سدرہ کے لیے اسفر کے گھر چکر لگا چکے تھے۔ یوں تو وہ لوگ کم عمری میں رشتہ طے کرنا اچھا تو نہیں سمجھتے تھے پر لاڈلے کی بات مانے بغیر چارہ نہ تھا اسفر نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ دیکھنے کا دل ہی نہ چاہا۔ اور نہ کوئی جواب دینے پر دل آمادہ ہوا۔ مزید کچھ کہے سنے وہ چپ چاپ سیڑھیاں اترنے لگا۔

''سالا'' زیر لب جواد نے کہا تھا۔ اس ذومعنی لفظ میں سے جانے کون سا مطلب جواد کے ذہن میں تھا؟ سر جھٹک کر جواد سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

منظر کچھ تاریک سا تھا۔ ایسے جیسے اولین وقت کی

رات ہو۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس لڑکا پشت کیے کھڑا تھا۔ تاریک منظر میں بھی وہ لڑکا واضح تھا۔ سر پر چھتری تانے وہ کتنی دیر کھڑا رہا۔ اور پھر اسے اس نے رخ موڑا وہ لڑکا اسفر تھا۔

ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سجی تھی۔ آنکھیں بھی ہونٹوں کی مسکراہٹ کا ساتھ دیتی تھیں۔

''ادھر کیوں کھڑی ہو۔ پاس آؤ۔'' جب دعا یونہی ساکت کھڑی رہی تو اسفر نے اسے پکارا۔ دعا جھجکتی ہوئی قدم بڑھانے لگی۔ ابھی وہ اسفر سے دور تھی کہ آسمان سے بارش ہونے لگی یہ پانی کے قطروں کی بارش نہ تھی۔

سفید ایسے جیسے سچے موتی اور نرم ایسے جیسے روئی کے گالے۔ روئی کے گالوں سے بنے موتی آسمان سے اترتے رہے اور پیروں میں ڈھیر ہونے لگے۔

''آ بھی جاؤ۔'' اسفر نے دعا کو ایک بار پھر رکتے دیکھا تھا تو پکارا تھا۔ دعا ایک بار پھر قدم اٹھانے لگی۔ تب پہلی بار اس کا دھیان اپنے لباس کی طرف گیا تھا۔ اس کا لباس بھی سیاہ تھا اور قدرے قدیم طرز کا تھا۔ روئی سے بنے موتی اس کے لباس پر ٹکتے جا رہے تھے۔

دعا قریب آئی تو اسفر نے چھتری بڑھا کر دعا کو بھی چھتری تلے لے لیا۔

''اتنا آہستہ کیوں چلتی ہو؟'' سیاہ لباس میں ملبوس وہ دونوں سیاہ چھتری تلے کھڑے تھے۔

''دیکھو لباس کیسا ہو گیا؟'' اسفر دعا کی توجہ لباس کی طرف دلانا چاہ رہا تھا لیکن دعا یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ایسے جیسے پلک تک نہ جھپک سکتی ہو۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

دعا پھر بھی کچھ نہ بولی۔ چند ثانیے یونہی خاموشی چھائی رہی۔

اور اس کے بعد دعا بولی تو گویا طلسم ہی پھونکا تھا۔

''اسفر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' الفاظ بمشکل اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔ چھتری دور جا گری۔ جانے اسفر نے چھتری کو خود ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیا تھا یا پھر ہوا کے دوش سے دور جا گری تھی۔

روئی کے گالوں جیسے موتی آسمان سے متواتر گر رہے تھے آمنے سامنے کھڑے دعا اور اسفر اس موتیوں کی بارش کا حصہ ہی لگ رہے تھے۔

یہ کوئی پونے تین بجے کا وقت تھا جب دعا کی آنکھ کھلی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کمرے کے خاموش ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ دعا کچھ دیر یونہی لیٹی سائیڈ لیمپ کو تکتی رہی۔ لیمپ کی روشنی کمرے کے فسوں کا باعث تھی۔ پھر وہ اٹھی کمرے کا دروازہ کھولا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کچن میں آئی۔ فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔

شیشے کا گلاس پانی سے بھرنے کے بعد وہ کچھ دیر شفاف گلاس میں موجود بے رنگ پانی کو دیکھتی رہی اور پھر گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ ایک گھونٹ پانی پینے کے بعد ہی اس نے گلاس شیلف پر رکھ دیا اور گویا ہوئی۔

''ہاں اسفر میں تم سے محبت کرتی ہوں اور بے حساب کرتی ہوں۔'' اور اعتراف محبت کرتے ہوئے دعا کے چہرے سے الوہی خوشی عیاں تھی۔ محبت ایسی الوہی خوشی تو دیتی ہے۔

☆......☆......☆

وقت جب گزر رہا ہوتا ہے تو ایسے لگتا ہے اس کی رفتار کچھوے کی رفتار سی ہے اور جب گزر جاتا ہے تو احساس ہوتا یہ تو خرگوش سے بھی کہیں تیز تھا۔

سیکنڈ ائیر کا رزلٹ شاندار تھا تو انٹری ٹیسٹ کے رزلٹ نے تو جیسے چار چاند ہی لگا دیے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج۔ وہ کالج جہاں تعلیم حاصل کرنا، طب میں دلچسپی رکھنے والے ہر طالب علم کا خواب ہوتا ہے۔ سدرہ اور جواد دونوں ہی اس منزل کو پہنچ چکے تھے اور بے حد خوش تھے۔

اسفر کے ایف ایس سی کے مارکس بے حد کم تھے۔ بلاشبہ وہ انٹری ٹیسٹ میں بیٹھ سکتا تھا لیکن انٹری ٹیسٹ دینا ایسے تھا جیسے وقت ضائع کرنا اور اسفر نہ خود وقت ضائع کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی فاخرہ نے کرنے دیا۔

''لو اسفر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔'' فاخرہ کے لہجہ میں قلق تھا۔ (جاری ہے)

توشہ خاص، رنگ رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، دلچسپ سامانِ عبرت، زرنگار حکایتیں

لاہور سے پہلی حکایت

بھوک



اعجاز احمد فکر ال

دیارِ غیر سے ایک قیدی دوشیزہ کی آبلہ پائی'

بھوک سے بچنے کے لیے آخر وہ کیا کرتی......

مزنہ سن بلوغت کی حدیں کراس کر چکی تھی۔ بے حد سنجیدہ اور روائتی عرب عورتوں کی طرح پردہ دار لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اکثر بڑے موتیوں کی تسبیح ہوتی اور سوائے آنکھوں کے سر سے پاؤں تک جسم کو سیاہ بُرقعے سے ڈھانپا ہوتا۔ نرگسی آنکھوں نے اس کے رخشندہ چہرے پر ایک مسحور کن دلکشی پیدا کردی تھی۔ اس کی نظریں جان لیوا تھیں۔ میرے پاس جب بھی آتی آنکھوں سے دل کو موہ لینے والے انداز اپناتی۔ مزنہ آواز و انداز اور دلرُبا عادات کی وجہ سے ہر دلعزیز لڑکی تھی۔ اس کی جوانی نقطہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ جب بھی وہ سکارف پہن کر نکلتی تو دعوت نظارہ جوانی اس کا چہرہ اور بھی پُرکشش بنا دیتی۔ مجھے اس کا جسم سیاہ برقعے میں بھی شیشے کی طرح نظر آتا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ہمارے ملنے پر پابندی نہیں تھی۔ وہ مہکتے پھول جیسے چہرے کے ساتھ زیادہ تر محبت کے موضوع پر باتیں کرتی۔ اس کی ساحرانہ میٹھی باتوں سے میرے جسم میں پھلجڑیاں روشن ہونے لگتیں۔

ایک مرتبہ اس نے مجھ سے سوال کیا: "مرد بھوکی نظروں سے عورتوں میں کیا تلاش کرتے ہیں؟ اف کتنی بھوکی نظریں ہوتی ہیں مردوں کی، مجھے تو ان کی نظریں چبھنے لگتی ہیں۔"

میں نے جواب دیا: "بناؤ سنگھار کر کے عورت کی مرد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ مرد کا حسن زیادہ عورتوں کو اور عورتوں کا حسن زیادہ مردوں کو متوجہ کرتا ہے۔ عورت ایسی مخلوق ہے جس کے حسن و جمال کو مرد کا دل بہلانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ خدا نے عورت کو دیکھنے کے لیے ہی بنایا ہے۔ مرد اگر عورت کو والہانہ طور پر نہیں دیکھے گا تو کس کو دیکھے گا اور دونوں کی پیدائش میں ہم آہنگی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دُنیا میں ایک دوسرے کے لیے ہے کیا، جس کو بالآخر حاصل کرنا لازم و ملزوم ہے اور ظاہری حسن شکل و صورت کا حسن ہے جبکہ انسان کا کردار بھی اس کو حسین بناتا ہے اور زیادہ خوبیاں ہونے کی وجہ سے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں مگر تمہارا حسن زہرہ جیسا اور جسم گورا چاندنی جیسا ہے اور باطنی حسن نہ ورغلائے جانے والا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر مست مسکان پھیل گئی اشرم سے سمٹ گئی اور گال کانوں تک سرخ ہو گئے۔ غضب کی کشش کے ساتھ نچلے ہونٹ کو دانتوں کے نیچے دبا لیا۔ باتوں باتوں میں تکلف بے تکلفی میں بدل گیا۔ مزنہ نے ہونٹوں پر تخیلاتی مسکراہٹ نمودار کی اور والہانہ انداز گفتگو سے پوچھنے لگی "شادی سے پہلے عورت کا باکرہ (کنوارہ) ہونا کیوں ضروری ہے، مرد کیلئے کیوں ضروری نہیں؟"

میں سن کر چونک پڑا۔ کوئی جواب نہیں بن رہا تھا۔ ایک خیالی اسرار میرے دماغ پر چھا گیا، پسینے چھوٹنے لگے، شرم سے نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اپنی کم عقلی کو چھپانے کیلئے جواب دیا: "تم عقل کی کچی ہو۔

مزنہ نے ایک مختصر وقت کیلئے چنچل آنکھوں میں خفگی پیدا کی اور مسکرا دی۔

کچھ عرصہ محبت کی باتیں چلتی رہیں۔ چند روز بعد ہماری شادی کی بات پکی ہوگئی۔ انتظار کی لذت کے واسطے ملاقاتوں پر پابندی لگ گئی۔ شادی کی خوشی نے مزنہ کے چہرے کا رنگ یاقوت کی مانند کر دیا۔ پابندی کی وجہ سے پیار خلاؤں میں لٹک گیا۔

ایک دن کویت اور عراق کے سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔ عراقی افواج نے بغیر اعلان جنگ کے بین الاقوامی جرم کی ابتداء کر کے کویت پر قبضہ کر لیا۔ بین الاقوامی قانون میں لاقانونیت کی وجہ سے کویت جیسی چھوٹی ریاست اپنا دفاع ہی نہ کر سکی۔ جنگ شروع ہوگئی۔ عوام سب کچھ چھوڑ کر مہاجر بن کے دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ صرف کمزور اور خارجی رہ گئے۔ انھوں نے عراقی افواج کے ساتھ مل کر

عراقی افواج نے پٹرول کے کنوؤں کو آگ لگا کر فضاء کو کئی سال کیلئے سیاہ کر دیا اور پانی کے ٹینکوں میں زہر کی آمیزش کر دی۔ نوادرات چوری ہونے لگے۔ شہری آبادی بھی غیر محفوظ ہوگئی۔ روزانہ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی اغواء کی خبریں سننے میں آ رہی تھیں۔ اسلحہ کی بو سے گھروں میں مقید رہ کر ہمارا دم گھٹنے لگا۔ ہمارے لئے کویت چھوڑنا مشکل ہو گیا۔

دوسری طرف عالمی سپر طاقت اور کویت کی بھگوڑہ حکومت نے اعلان کر دیا کہ جو غیر ملکی کویت میں ٹھہرے رہیں گے، کویت آزاد کرانے کے بعد ان کو نیشنلٹی دی جائے گی۔ اس اعلان پر بھی بہت سے خارجیوں نے کویت نہ چھوڑا اور لوٹ مار بدستور جاری رکھی۔

اتحادیوں نے عراق کے ساتھ تجارتی تعلقات کالعدم قرار دے دیئے۔ عراق کا کویت پر قبضہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ سیاستدانوں کے جارحانہ سیاسی بیانات سے فضاء دن بدن



جنگ میں سب جائز ہے کی پالیسی اپنائی اور بنکوں سٹوروں اور مال و جائیداد کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس دوران میری مزنہ بھی کھوگئی۔

طاقت کا کیا کہنا اس سے بگاڑ تو روز پیدا ہوتا ہے توازن کبھی نظر نہیں آیا اور فوجی کو حکم ماننے کی تنخواہ دی جاتی ہے اس کو اپنے ملک کے جائز و ناجائز موقف کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ طاقت اور کمزوری میں گرم پانی اور آگ کی طرح دشمنی ہے۔ دونوں میں کبھی جیت نہیں ہوئی۔ آگ پر جوش کھانے والا پانی اگر آگ پر گر جائے تو اس کو بجھا دے اگر کمزور متحد ہو جائیں تو طاقتوروں پر غالب آ جائیں۔

عراقی افواج نے پورے کویت کی ناکہ بندی کر دی۔ مختصر کویتی افواج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان کو کیمپوں میں منتقل کر کے جنگی قیدی بنا کر نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔

آلودہ ہوتی جا رہی تھی۔ یو این او کی عراق کو کویت چھوڑنے کی دی ہوئی ڈیڈ لائن کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اتحادیوں نے عراقی افواج پر اسلحہ کے مہلک ذخائر ختم کرنا شروع کر دیئے۔ شفاخانے تو پہلے ہی برباد ہو چکے تھے۔ مرنے والے بے گور و کفن پڑے تھے۔ بجلی و پانی کئی مہینے سے بند تھا۔ لاقانونیت کے راج کی وجہ سے سرکاری اداروں کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ انسانی حقوق کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔

انسان اشرف المخلوقات ہے مگر تمام انسانوں میں ایک بھی خوبی مشترک نہیں بلکہ ہم ایک دوسرے کو مار کر نقصان پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے مار مار کر نہیں جیا جا سکتا۔ اگر انسانیت پرست دنیا پر غالب آ جائیں تو وحشت پرست جہلاء کا کیا بنے گا۔

یہ دنیا ہماری نہیں لیکن ہم اس کے پیچھے پیچھے کیلئے ایسے

لڑتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوئی تو ہم زندہ نہ رہ سکیں گے۔ ہم پھر بھی زندہ نہیں رہتے۔ یہ زمین ویسے کی ویسے ہی رہ جاتی ہے تو پھر ہماری دنیا کون سی ہے جسے ہم اپنا کہیں یا ہم استحصال کا مظاہرہ کر کے سرمایہ اکٹھا کرنے کیلئے محنت کریں۔ یہ زمین ہم پر بوجھ نہیں بنتی بلکہ ہم اس پر بوجھ بنتے ہیں۔ جنگ جائز ہے یا ناجائز اس بات کا فیصلہ بھی طاقت ہی کرتی ہے۔ طاقت کتنی بری ہے اس کا اندازہ ایک بے طاقت قوم سے پوچھو۔

لوگوں کے گھروں اور بازاروں سے اجناس ختم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں کو کھانے کیلئے پتے اور پینے کا صاف پانی بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں دن بھر مارا مارا متوحش حال شہر میں گشت کرتا رہتا تا کہ کہیں سے راشن مل جائے اور بھوک کے پیٹ کی دوزخ کی آگ بجھا سکوں۔ میرے فاقوں کا مسلسل تیسرا دن تھا۔ جسم میں سوئیاں چُبھ رہی تھیں۔ کمزوری اور نقاہت مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

مجھے ایک دوست نے خفیہ اطلاع دی کہ شہر سے باہر ایک شخص کے پاس خوراک کا ذخیرہ پڑا ہے۔ سامرہ سے لایا ہے اور بہت مہنگی بیچ رہا ہے۔ میں نے سوچا خیر مل تو جائے گی۔ میں نے امید کی کرن کے ساتھ چند سو دینار کمر بیلٹ کے خفیہ خانے میں چھپائے اور جنگلی خنجر لے کر اس ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔

اسٹور کی چھت پر اور دائیں بائیں فوجی بندوقیں تانے پہرہ دے رہے تھے۔ وہاں کچھ مرد اور عورتیں سکڑے شکم اور کربناک چہروں کے ساتھ گھٹتا ہو کر گیٹ کیپر سے گڑگڑا کر خالی ہاتھ اور ہاتھوں میں دینار تھامے راشن کی بھیک مانگ رہے تھے۔ عورتوں کے سینوں کے ساتھ بچے چمٹے بلک رہے تھے۔ کچھ عورتیں آہ زاری کر رہی تھیں کہ ہمیں روٹی کے بدلے خرید لو۔ یقیناً اس دنیا کی مصیبتیں بھوکوں نے نہیں بھرے ہوئے پیٹ والوں نے پیدا کی ہیں۔

بڑی طاقتوں کے جنگی جنون اور جنگ کی تباہ کاریوں نے عام لوگوں کے ذہنی معیار کو کس قدر پست کر دیا اس کا اندازہ بھوکے کے علاوہ بھلا کون کر سکتا ہے۔ سٹور کے پاس ہی ایک جگہ کونے میں دو لاشیں بڑی تعفن چھوڑ رہی تھیں۔ شاید ان کے زیادہ واویلا اور راشن کیلئے ہاتھا پائی کی وجہ سے موت تک نوبت آ گئی تھی۔ لوگ بکھرے ہوئے خون اور بُو سے بے نیاز فوجیوں کی منتیں کر رہے تھے کہ راشن دے دو۔

میں نے ایک طرف کھڑے فوجی کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر قمیض کے نیچے کمر بیلٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''مجھے راشن چاہئے۔'' فوجی نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

جونہی میں اندر داخل ہوا۔ میری نظریں شرجیل کویتی سے دوچار ہوئیں۔ شرجیل کویتی میرا پرانا دوست تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور پھیکی مسکراہٹ سے گلے ملے۔

شرجیل کویتی نے پوچھا ''کدھر آئے ہو شہزاد۔''

''راشن چاہئے۔''

''کتنا؟''

''ایک آٹے کا تھیلا، گھی کا ڈبہ اور ایک کلو دال۔''

''تمام چیزیں سو سو دینار کی ملیں گی۔'' شرجیل نے جواب دیا۔

حیرت سے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

''دوست عام دنوں میں آٹے کا تھیلا دو دینار میں مل جاتا ہے۔ آج تم سو دینار کا دے رہے ہو۔''

''مجبوری ہے، جنگ کے دنوں میں یہی ریٹ چل رہا ہے۔''

''مگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''اگر مگر کو چھوڑو، تم آٹے پر ناراض ہو رہے ہو۔ میرے پاس اور بھی بہت کچھ ہے، آؤ تمہیں دکھاؤں۔''

وہ میرا بازو پکڑ کر ایک کمرے کی طرف چل پڑا۔ میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر شرجیل کویتی نے ایک لائٹ آن کی۔ یہاں کچھ خوبصورت لڑکیاں کمزور نڈھال چہرے مردہ اور بے جان لبوں کے ساتھ بنی ٹھنی بیٹھی اور لیٹی تھیں۔ میں نے سب کا بغور سر سے پاؤں تک جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ان میں ایک میری منگیتر مزنہ بھی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے جیسی رنگینی اور جاذبیت نہیں تھی۔ جسم بے رس معلوم ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے تو میں سکتے میں آ گیا۔

شرجیل نے کہا ''یہ سب خوبصورت عورتیں میرے پاس جسم فروشی کے بدلے میں ایک وقت کی روٹی کیلئے مقیم ہیں اور باہر جو عورتیں تمہیں نظر آ رہی ہیں وہ کچرا اور لاٹ کا مال ہے۔ ان میں خوبصورتی کا فقدان ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کا مال میں نے ان میں سے چُن لیا ہے۔''

میں نے مزنہ سے پوچھا ''تم یہاں کیسے۔''

تو اس نے روتے ہوئے اکھڑا سا جواب دیا۔ ''تم ہی بتاؤ! اس عالم دہشت اور جنگی ماحول میں مجھے بھوک سے بچنے کیلئے کیا کرنا چاہئے۔''

☆☆.....☆☆

وادیٔ مہران سے دوسری حکایت

گھوٹ



ارم ناز

تہذیب یافتہ سوسائٹی کے منہ پر ایک طمانچہ ارم ناز کے قلم سے

رشیدہ بیگم بڑی اکڑ والی خاتون تھیں۔ پیشے کے لحاظ سے گورنمنٹ ٹیچر، اسکول کے بچوں پر سختی کرتے کرتے عادت ایسی ہوگئی تھی کہ ہر کسی کے ساتھ سختی سے پیش آتیں۔ کوئی ذرا جو آگے سے بولتا تو بری



طرح جھڑک دیتیں۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ان سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔

رشیدہ بیگم کے شوہر عبدالسمیع ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتے تھے۔ عبدالسمیع بھی رشیدہ بیگم کے آگے بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ شوہر ہوتے ہوئے بھی بیوی کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ وہ صلح جو قسم کے مرد تھے اور بیوی سے دبنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رشیدہ بیگم کی انکم ان سے زیادہ تھی اور نوکری بھی سرکاری تھی۔ گھر میں رشیدہ بیگم کی حکومت چلتی تھی۔ ان کے دو بچے تھے، بڑا پندرہ سالہ سمیر اور چھوٹی تیرہ سالہ سمیرہ۔ بچے ماں سے ڈرے سہمے رہتے البتہ باپ سے قریب تھے۔ رشیدہ بیگم کو یہ زعم لے ڈوبا کہ وہ کلاس کے تمیں بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی تربیت بھی بہترین طریقوں سے کر رہی ہیں۔

مہنگے انگریزی اسکول میں ایڈمیشن کرا کے وہ اپنے ماں ہونے کے فرض سے سبکدوش ہوگئی تھیں۔ انھیں اس بات سے قطعی غرض نہ تھی کہ بچے سارا دن انٹرنیٹ پر کن سرگرمیوں میں مشغول ہیں اور یہ سمیرہ وقت سے پہلے اتنا فیشن کیوں کرنے لگی ہے۔

پندرہ سال سمیر اسکول کے دوستوں کے ساتھ سگریٹ پیتا تھا اور ہر وہ کام کرتا تھا جس سے وہ برگر فیملی کا فرد سمجھا جائے۔ بچوں کے پاس جدید ماڈل کے موبائل تھے۔ ماں باپ تو پیسے بنانے کی مشین بنے ہوئے تھے۔ پیچھے بچے کیا کر رہے ہیں یہ خبر اماں ابا کو نہ تھی۔

رشیدہ بیگم شوہر نامدار کی ڈیوٹی جانے کے بعد اسکول کے لیے نکلتی تھیں۔ ان کے اسکول جانے کے بعد بچے بھی وین میں اسکول چلے جاتے اور گھر کو تالا لگ جاتا۔ بچوں کی واپسی دو بجے ہوتی جبکہ رشیدہ بیگم ساڑھے تین بجے آتیں۔ کبھی جب ساتھی ٹیچرز کے ساتھ شاپنگ پہ چلی جاتیں تو واپسی چھ بجے سے پہلے نہ ہوتی جبکہ عبدالسمیع صاحب رات آٹھ بجے گھر میں گھستے۔

کبھی کبھی بچوں کے اسکول جانے سے پہلے مدثر صاحب کی گھر میں آمد ہو جاتی تو گھر کو تالا نہ لگایا جاتا بلکہ مدثر صاحب گھر کے چوکیدار بن بیٹھتے۔

مدثر صاحب عبدالسمیع کے بہنوئی تھے کیونکہ اکلوتی بہن کے شوہر تھے تو ان کی بڑی ناز برداری ہوتی۔ وہ اکثر سالے صاحب کے گھر ہی پائے جاتے۔ مدثر صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ وہ ان مردوں میں سے تھے جن کی بیویوں کو ان سے ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ مگر باقی تمام عورتیں ان سے بہت خوش رہتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ رشیدہ بیگم انھیں بہت پسند کرتی تھیں۔ وہ رشیدہ بیگم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اور رشیدہ بیگم اپنی تعریف سن کر چنے کے جھاڑ پہ چڑھ جاتیں۔

مدثر صاحب بڑے واہیات مذاق کرتے تھے اور عبدالسمیع کی غیر موجودگی میں رشیدہ بیگم سے ہاتھ مار مار بات کرتے۔ رشیدہ بیگم ان کی کسی بات کا بُرا نہ مناتی تھیں۔ مدثر صاحب بچوں کی موجودگی کا بھی خیال نہ کرتے بلکہ اسی طرح بے باکی سے بات کرتے۔

اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ رشیدہ بیگم اسکول چلی جاتیں عبدالسمیع بھی گھر پہ نہ ہوتے سمیر بھی اسکول چلا جاتا مگر سمیرہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے چھٹی کر لیتی۔ تمام لوگوں کی غیر موجودگی میں مدثر صاحب سمیرہ سے بھی اسی طرح واہیات مذاق کرتے۔ اب تو سمیرہ کو یہ باور کرانے لگتے تھے کہ وہ اب بچی نہیں رہی۔ سمیرہ کے نزدیک یہ کوئی معیوب بات نہ تھی کیونکہ یہی سب تو مدثر صاحب اس کی ماں کے ساتھ بھی کرتے تھے۔

جو ماں کے لیے جائز ہے وہ بیٹی کے لیے ناجائز کیسے ہوسکتا ہے؟

سمیرہ ابھی ناسمجھ تھی، قصوروار تو ماں تھی جس نے بیٹی کو زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کو ایجوکیشن، نیٹ، کیبل، ان سب نے مل کر سمیرہ کا حجاب کھول دیا تھا۔ رہی سہی کسر موبائل اور گھر کے ماحول نے پوری کردی۔ تعلیم ان کے دماغ میں داخل ہوتی تو وہ مہذب ہو جاتے مگر تعلیم تو ان کے اوپر سے

گزر گئی تھی اس لیے وہ ماڈرن ہو گئے تھے۔

ماڈرن لوگ دین سے اتنے ہی دور ہوتے ہیں جتنی زمین آسمان سے۔ ہوش تب آتا ہے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔ مدثر صاحب نے جوان ہوتی سمیرہ کو جوانی کے اسرار و رموز سے آشنا کرا دیا تھا۔

رشتے میں وہ سمیرہ کے پھوپا تھے مگر شیطان کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا، وہ تو بس شیطان ہوتا ہے۔ ہم اپنی بچیوں کو باہر کے بھیڑیوں سے تو محفوظ کر لیتے ہیں مگر گھر میں بسنے والے ملعون سے غافل رہتے ہیں۔

بچیوں کے معاملے میں قریبی رشتوں پر بھی خاص نظر رکھیے لڑکیوں کی تربیت دینی احکامات کے مطابق کیجیے۔

مدثر صاحب کا کھیل سمیرہ کا راضی بہ رضا ہونے پر چلتا رہا آخر ایک دن تو کسی نہ کسی کو خبر ہونا ہی تھی۔

سمیرہ کی اسکول سے چھٹیاں زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ ایک دن سمیر نے آدھے دن کی چھٹی کر کے سمیرہ کو مدثر کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

اب آپ کا کیا خیال ہے۔ سمیر نے ہنگامہ کیا ہوگا، ماں باپ کو بتایا ہوگا مگر یہ آپ کی غلط فہمی ہے، سمیر نے دھمکی دے کر مدثر صاحب کو بھگا دیا مگر ماں باپ کو بتا دینے کی دھمکی دے کر بہن سے فائدہ اٹھانے لگا۔

☆☆☆

یہ کھیل زیادہ دن نہ چل سکا اور بھانڈا پھوٹ گیا۔ ایک صبح سمیرہ کی حالت دیکھ کر رشیدہ بیگم نے اسے خوب مارا۔

''حرافہ ہماری دی ہوئی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ بتا کس کا گناہ لے کر گھوم رہی ہے۔''

مدثر صاحب گھاگ آدمی تھے وہ اس کھیل کے ماہر تھے۔ سمیر ٹھہرا اناڑی۔ ماں کی مار کھا کر سمیرہ نے بھائی کا نام لے لیا۔ پڑوسن اپنی چھت پہ کھڑی سارا منظر دیکھ رہی تھی اب مشہوری کو کون روک سکتا تھا۔

اتنی تیزی سے ٹی وی پر آنے والا اشتہار مشہور نہیں ہوتا جتنا رشیدہ بیگم کی اولاد مشہور ہو گئی۔ جس نے سنا تھو تھو کیا۔ بے غیرتی کی ایسی مثال آج تک

اللہ کو نہ ماننے والوں کا انجام

☆فرعون دریائے نیل میں ڈوب کر مرا۔ کیوں کہ وہ چھپ چھپ کر ویرانوں میں جا کر اللہ سے ہی مدد مانگتا تھا۔ ایک رات وہاں جبرئیل علیہ السلام آئے انسان بن کر۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے انھیں لکھ کر دیا کہ جو اللہ کو نہیں مانیں گا وہ نیل میں ڈوب کر مرے گا۔

☆شداد جنت میں داخل نہ ہو سکا۔

☆نمرود مچھر کے کاٹنے سے ہلاک ہوا۔

☆نمرود اور ابو جہل میں ایک مماثلت تھی۔ دونوں دم نکلنے تک اللہ اور اس کے آخری نبی کو نہ مانا۔

☆قارون بادشاہ تھا۔ حضرت موسیٰ پر اس نے بدکرداری کی تہمت لگائی۔ لہٰذا اللہ نے اسے مال و اسباب سمیت دفن کر دیا۔

حسنِ انتخاب۔ رازِ عدن۔ بحرین

سننے میں نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

جب سمیرہ نے مجھے یہ سب بتایا تو کچھ وقت کے لیے میں بھی سناٹے میں آ گئی۔ بعد کی کہانی سمیرہ نے کچھ یوں بیان کی۔

اس گناہ سے امی نے چھٹکارا دلوا دیا۔ سمیر کو فوری طور پر ماموں کے پاس سعودیہ بھیج دیا گیا۔ اس محلے سے گھر بیچ کر ہم ایک دوسرے علاقے میں آ گئے۔ امی نے اس اسکول سے اپنا ٹرانسفر ایک دوسرے اسکول میں کروا لیا۔

رشیدہ بیگم کی تربیت میں کھوٹ تھا۔ حاملہ خواتین اللہ سے ہمیشہ بیٹا یا بیٹی کے لیے دعا کرتی ہیں اپنی ان بہنوں کو میری ایک صلاح ہے خدا سے نیک اور صالح اولاد مانگیں پھر وہ چاہے بیٹا ہو یا بیٹی۔

☆☆☆

کراچی سے تیسری حکایت

کیسے کیسے لوگ!

کنول عمران

ہاسپٹل میں ملی وہ ماں مجھے آج بھی یاد آتی ہے

آج مجھے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونا تھا۔ کل صبح چھ بجے میرا آپریشن تھا۔ یہ میری دوسری ڈلیوری تھی۔ پہلے میری ایک بچی ہے۔ اس لیے میں شام میں ہاسپٹل چلی گئی۔ تمام فارمیلٹیز پوری کرنے کے بعد مجھے بھی پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ یہ شہر کا ایک مشہور نجی ہاسپٹل تھا۔ وہاں وارڈ میں آٹھ بیڈ تھے صاف ستھرے۔ وہ میرے بالکل سامنے والے بیڈ پر تھی۔ عمر یہی کوئی پچیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ نازک سی، چھوٹے سے قد کی، سانولی رنگت دیکھنے میں وہ اچھے خاندان کی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی امی تھی۔ جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھیں سوجی اور روئی روئی لگیں۔ جیسے بارش کے بعد مطلع صاف ہو مگر پھر بھی موسم میں ابر باقی ہو۔ خیر سب سے علیک سلیک ہوئی۔ تقریباً چار بیڈ خالی تھے اور چار فل تھے۔ ڈاکٹرز راؤنڈز پر آنے اور تمام مریضوں کا چیک اپ کر کے چلے گئے۔ اور جن کا صبح آپریشن تھا انھیں ہدایت کی گئی کہ رات بارہ بجے کے بعد کچھ نہیں کھانا پینا۔ اس لیے ہم نے وقت پر اپنا کھانا پینا کر لیا۔ پھر ہم اپنے اپنے بیڈ پر ہی بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے تھے۔ میرے ساتھ میری نند تھی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ اس لڑکی کا نام وفیزہ ہے۔ وہ ہم سب کی باتیں سن کر ہنس رہی تھی تو اس کی امی مجھے مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

''سوہا بیٹی تمہارے آنے سے میری بیٹی کی مسکراہٹ واپس آگئی ورنہ تو یہ روتی ہی رہتی تھی۔''

''وہ کیوں آنٹی! ایسا کیوں؟'' مجھے حیرت ہوئی تو آنٹی اس کی طرف دیکھ کر چپ ہوگئیں۔ مجھ سے صبر نہ ہوا تو میں آہستہ آہستہ اٹھ کر اس کے بیڈ پر آگئی۔ اور اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''بتاؤ وفیزہ کیا بات ہے؟ میں جب سے آئی ہوں دیکھ رہی ہوں تم اداس ہو۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ پھر سے رونے لگی۔

''ارے یہ کیا؟'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''رو کیوں رہی ہو۔ جو بات ہے وہ بتاؤ۔ بتانے سے غم کم ہوتا ہے۔'' میری ہمدردی نے اس کے دکھ کو تازہ کر دیا اور اس نے اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی۔

میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ ہمارے گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ امی ابو بھائی سب مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور میری چاروں بھابیاں بھی بالکل بہنوں کی طرح ہیں۔ لاڈ پیار کی وجہ سے میں ہر فیشن اور ہر طرح کا وہ کام کرتی جو حد میں رہ کر میرا دل کرتا تھا۔ کپڑے پہننا، جینز شرٹ پہننا بالوں کو نئے نئے طریقوں سے ڈائی کرنا۔ جو میری خوبصورتی کو اور بڑھاتے تھے۔ میں نے اپنی

بھابی کے ساتھ مل کر گھر کے ساتھ ہی ایک پارلر بھی کھولا ہوا تھا۔ مل کر کام کرتے تھے۔ ہر سال دبئی جانا اور خوب شاپنگ کرنا معمول تھا۔ غرض ہمارے گھر کا ماحول بے مثال تھا۔ اور میں خواہشوں کے جھولے میں جھول رہی تھی کہ اچانک ایسی تیز آندھی چلی کہ میں جھولے سمیت گر پڑی۔

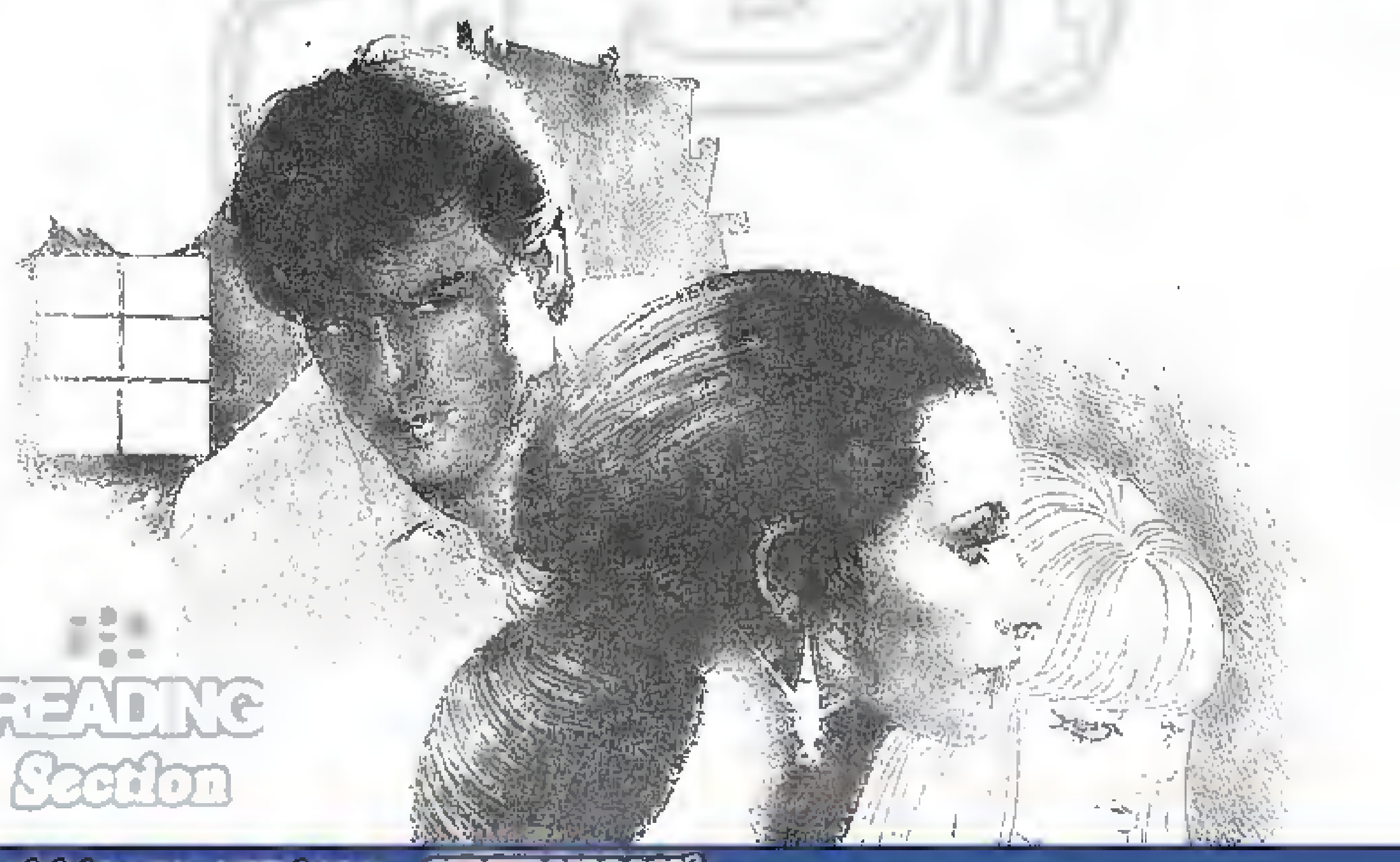
ہوا یوں کہ میری خالہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے میرا رشتہ لے کر آ گئیں۔ وہ بھی اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر ان کے گھر کا ماحول ذرا مذہبی تھا۔ میرے خالو پردے کے پابند تھے۔ اور خالہ بھی پردہ کرتی تھیں۔ اور ان کا ماحول ہمارے گھر کے ماحول سے کافی مختلف تھا۔ ہم رات کو دو دو بجے تک باہر ڈرائیو پر جاتے، گھومتے، ہوٹلنگ کرتے پارٹیز کرتے مگر وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ تو سب کو لگا کہ میں وہاں ایڈجسٹ نہ کر پاؤں گی۔ تو امی نے خالہ سے بات کی۔

''آپا ہمارے گھروں کا ماحول کافی مختلف ہے اور آپ کو پتا ہے ویزہ کس طرح کے ماحول کی عادی ہے۔ وہ شاید وہاں ایڈجسٹ نہ کر سکے۔'' تو خالہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''ارے بہن! آج کل تو ساری ہی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ اب کیا کریں زمانہ ہی موا ماڈرن ہو گیا ہے۔ اور پھر بندہ اپنوں کے آگے ہی ہاتھ پھیلاتا ہے نا کہ غیروں کے آگے اور تمہارے بہنوئی ہم پر ہی حکم چلا سکتے ہیں۔ بہو پر تو اس کے میاں کا حق ہو گا۔ جیسے چاہے رکھے اور تمہیں پتا ہے کہ احمد آج کے دور کا لڑکا ہے۔''

غرض خالہ نے سب کو رام کر لیا اور پھر احمد سب کا دیکھا بھالا بھی تھا۔ احمد کے علاوہ خالہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بینک میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ تو زیادہ حیل وحجت نہ کی گئی۔ میری پسند ناپسند کا کوئی عمل دخل نہ تھا یہ فیصلہ میں نے اپنے والدین پر چھوڑ رکھا تھا۔ تو یوں سب کی خوشی اور رضا مندی سے میں ویزہ احمد بن گئی۔ شروع میں تو سب ٹھیک تھا مگر چند ماہ بعد ہی بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ خالہ کو میرے ہر کام میں کیڑے نظر آنے لگی۔ بات بات پہ طعنے دینے لگی تھیں۔

''ڈھنگ کے کپڑے پہنا کرو۔ یہ کیا تم ہر وقت گھر میں مردنی پھرتی رہتی ہو۔'' انھوں نے میرے ٹراؤزر پر وار کیا۔ پہلے پہل تو میں بھی مذاق کر رہی ہیں مگر جب طعنوں کے تیر اندھا دھند برسائے جانے لگے تو مجھے لگا کہ اب حالات سازگار نہیں۔ میری ہر ہر چیز پر انھیں تنقید تھی۔



پھر میں نے بھی سوچا کہ اب میں شادی شدہ ہوں تو میں نے خود کو تبدیل کر لیا۔ میں مکمل طور پر چینج ہو گئی۔ میں نے شلوار قمیض پہننا شروع کر دی۔ اپنے گھر پر کبھی کوئی کام نہ کیا تھا مگر یہاں گدھوں کی طرح کام میں جتی رہتی۔

سسر صاحب تو کچھ نہ کہتے مگر ان کی قائم کردہ فضا کا اثر اب خالہ پر جم چکا تھا۔ اور وہ اس کا بدلہ مجھ سے نکال رہی تھیں۔ احمد بھی ماں کا غلام تھا۔ احمد کے کہنے پر میں نے برقعہ بھی پہننا شروع کر دیا۔ غرض میں نے ان کی خوشی کے لیے ہر کام کیا۔ مگر صلہ ندارد۔ میری امی بہن سے کہتیں۔

''یہ تم نے کیا ہے کیا بنا دیا میری بیٹی کو۔''

پردے کو وہ برا نہیں کہتی تھیں مگر خالہ کے ہر وقت کے کوسنے اور طعنوں سے میں نے بہت اثر لیا تھا۔ اپنا خیال رکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دل ہی نہ کرتا تھا کچھ پہننے اوڑھنے کا اب تو...... احمد کہیں سے بھی نہ لگتا کہ پڑھا لکھا ہے۔ جاہلوں کی طرح ذرا سی بات پر ہاتھ اٹھاتے۔ میں انھیں کہتی آپ کس جرم کی سزا دے رہے ہیں مجھے۔ تو کہتے شادی سے پہلے تو تم منہ نہ لگاتی تھیں مجھے ہر وقت اپنے ہی زعم میں رہتی تھی۔ مگر میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ تمہیں مزہ چکھاؤں گا۔''

'اف خدایا! یہ انسان اپنے اندر کتنا زہر چھپائے بیٹھا ہے۔' میں یہ سوچ کر کانپ جاتی۔ اسی دھوپ چھاؤں میں میں امید سے ہو گئی۔ تو امید کی ایک کرن جاگی کہ شاید اب میری تکلیفیں کچھ کم ہوں۔ مگر ابھی آزمائشیں بہت تھیں اور جب میں نے ساس صاحبہ کا فرمان سنا تو حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ساری دنیا بیٹی کے لیے بہو پر ظلم وستم کرتی ہے اور بیٹا پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ مگر میری ساس نے کہا کہ ہمیں بیٹے چاہیے۔ مجھے بیٹی بہت پسند ہے اور تمہارے احمد کو بھی۔''

اب یہ بھی قسمت ہے جہاں عورتیں بیٹے کے لیے دعاگو ہوتی ہیں میں بیٹی کی دعاگو ہوئی۔ میری ساس نے کہا بیٹی نہ ہوئی تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔ اور میں خدا کی خدائی پر حیران تھی کہ کیا یہ سب حیرت انگیز حالات میری ہی قسمت میں لکھے ہیں۔ ان نو ماہ میں ساس اور احمد میرے ساتھ کچھ بہتر ہی تھے۔ اور میں بھی خدا سے رو رو کر بیٹی کی دعا کرنے لگی۔ اور پھر خدا کو اس بار مجھ پر ترس آ ہی گیا اور میں بیٹی کی ماں بن گئی۔

احمد اور ساس تو یہ خبر سنتے ہی خوشی سے پاگل ہو گئے۔ میں ابھی لیبر روم میں ہی تھی کہ ڈاکٹرز بچی کو لے کر فوراً باہر کی طرف بھاگے۔ میں حیران تھی کہ خدا خیر کرے کیا ہوا۔ میں نے پاس موجود نرس سے پوچھا۔

''سسٹر کیا ہوا میری بچی کو۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ لیٹی رہیے! اس کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ابھی ڈاکٹر آ کر آپ کو بتاتے ہیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔''

اس نے مجھے دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا۔ مگر میرا دل بے چین تھا۔ خدا خدا کر کے ڈاکٹر آئی تو پتا چلا کہ میری بچی کو انکوبیٹر میں رکھا گیا ہے۔

''آپ کی بچی کی گردن کے گرد آنول نال بری طرح پھنسی ہوئی تھی جس کی وجہ سے بچی کی گردن پر دباؤ پڑا ہوا تھا اور کچھ نسیں دب گئی ہیں اور بچی کو سانس لینے میں مسئلہ ہو رہا تھا۔ اس لیے ہم نے اس کو I.C.U میں رکھا ہے۔ جب ٹھیک ہو جائے گی تو آپ کے پاس لے آئیں گے آپ فکر نہ کریں۔''

ڈاکٹر صاحبہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔ مگر میں کیسے فکر نہ کرتی۔ مجھے اپنا سانس گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ یا خدایا یہ کیسی آزمائش ہے ایک مسئلہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ میں بچی کو دیکھنے گئی تو دیکھا ننھا سا پھول شیشے کے بند ڈبے میں کتنی ہی نلکیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ میں برداشت نہ کر سکی اور بے آواز رونے لگی۔ ہم اپنی اولاد کو اپنے پیٹ میں ہر طرح سے محفوظ سمجھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

اے خدایا! مجھے میری بچی کی زندگی بخشش دے۔ میری گود کو بھرنے سے پہلے ہی سونی نہ کرنا۔ اور میں نہ جانے کب بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹرز نے آ کر اٹھایا اور وارڈ میں لائے۔

ساس اور شوہر بھی آ کر مجھ پر برسنے لگے کہ تم نے اپنا خیال نہ رکھا۔ اگر میری بچی کو کچھ ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' بجائے مجھے حوصلہ دینے کے وہ مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہے تھے مگر اس وقت مجھے ان کے کوسنے اور طعنوں کی کوئی پروا نہ تھی کیوں کہ مجھے ان سے اسی طرح کی امید تھی میں بس اپنی بیٹی کی زندگی کی دعائیں کر رہی تھی۔ بس سو یا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، آج کا ایک ہفتہ ہوگیا میری بیٹی میری گود میں نہیں آئی۔ مشینوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ کبھی ٹھیک ہو جاتی ہے اور پھر فوراً ہی نیلی پڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں کدھر جاؤں۔''

اس کی کہانی سن کر میں بھی رونے لگی اور اسے تسلی دینے کے بعد اپنے بیڈ پر آ گئی۔ اور دل میں اس کی بیٹی کی زندگی کی دعائیں کرنے لگی۔ کیونکہ میں بھی ایک ماں تھی اور اولاد کا دکھ سمجھتی تھی۔ پھر صبح چھ بجے مجھے آپریشن کے لیے لے جایا گیا جہاں میں نے ایک اور خوب صورت سی بیٹی کو جنم دیا۔ وارڈ میں شفٹ ہونے کے بعد، روبیزہ جلدی سے میرے پاس آئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''بیٹی۔'' میں نے بتایا تو اس نے دل سے مبارک دی۔ اور جب بچی کو نرس لائی تو اس کے ہاتھ سے لے کر کافی دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ وہ اپنی بچی کو میری بچی میں ڈھونڈ رہی تھی۔

شام میں اچانک ڈاکٹرز آ کر اسے کچھ کہہ کر چلے گئے وہ بھی فوراً بھاگی۔ میں بھی پریشان ہوگئی کہ نہ جانے کیا ہوا۔ جب وہ واپس آئی تو آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگی کہ اس کا ایک دم سے سانس بند ہونے لگا تھا۔ پھر اب ٹھیک ہے۔''

اللہ کی قدرت

حضرت یوسفؑ نے زندان مانگا، عطا ہوا۔ حضرت یوسفؑ بیماری اور مصائب اور حضرت داؤدؑ نے بھی مشکل مانگی تھی۔

☆ حضرت داؤدؑ کی قوم کو ہفتے کے دن شکار کرنے پر اللہ نے بندر بنا دیا تھا۔

☆ حضرت داؤدؑ لوہے کو ہاتھوں سے موڑ کر زرہ بکتر بنالیا کرتے تھے۔ حضرت لقمانؑ بھی آپ ہی کے دور میں آئے۔

حسن انتخاب۔ افشاں چوہدری۔ لندن

احمد نے اور روبیزہ کے بھائی اور ابو نے بھی کافی ہنگامہ کیا تھا کہ اتنے دن ہو گئے بچی کا ٹھیک ہونا ہی نہیں ہو رہا اور وہ ہاسپٹل تبدیل کرنے کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ حالانکہ یہ شہر کا نامی گرامی ہاسپٹل تھا۔ بڑے بڑے کیس الجھنے کے بعد یہاں لائے جاتے تھے مگر خدا کی مرضی کہ اس کی قسمت میں تکلیف سہنا لکھی تھی۔ ہم نے بھی اسے مشورہ دیا کہ یہاں سے شفا نہیں مل رہی تو کہیں اور دیکھ لو۔ پھر مجھے چھٹی ملنے تک تو وہ وہاں پر ہی تھی کیونکہ ڈاکٹرز کے اور ان کے مذاکرات ہی چل رہے تھے۔

جاتے وقت وہ میرے گلے لگ کر بہت روئی۔ اپنا فون نمبر وغیرہ دیا مجھے۔ مگر گھر آنے کے بعد بچی کی وجہ سے میں اتنی مصروف ہوگئی کہ نہ جانے وہ نمبر کہاں کھو گیا ہے؟ وہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔

جب بھی اس کی یاد آتی ہے تو سوچتی ہوں کہ نہ جانے کیا ہوا ہوگا اس کی بیٹی کا۔ آج بھی وہ بے اختیار یاد آ گئی تو سوچا اس کے ساتھ گزارا وقت اور اس کی کہانی آپ کے ساتھ شیئر کروں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی یہ کہانی پڑھ لے۔ اور اگر روبیزہ تم یہ کہانی پڑھو تو پلیز مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔

☆☆☆

شہرِ قائد سے چونکتی حکایت

وہ سب کی سنتا ہے



آصف اقبال

اس شخص کی حکایت، جو رب کی رضا پہ راضی تھا

لاہور کے ایک معروف بازار میں میری دکان ہے۔ پچھلے دنوں کاروباری دورے پر میرا بیرونِ شہر جانا ہوا۔ تو وہاں ایک شخص سے کافی دوستی ہوگئی۔ اُس شخص کی زبانی اس کی کہانی معلوم ہوئی۔ میں بہت متاثر ہوا۔ فہیم کی کہانی اُسی کی زبانی سنیے۔

میرے والد محکمہ ڈاک میں ملازمت کرتے ہیں۔ وہ ایک پیکر (پورٹر) ہیں۔ جملہ دیگر الاؤنسز کے ساتھ ان کی تنخواہ بمشکل چھ سو روپے بنتی تھی۔ جس سے گزارا ہونا ناممکن تھا۔ وہ سستے زمانے تھے مگر پھر بھی دس افراد کے کنبے کے لیے چھ سو روپے بالکل ناکافی تھے۔ میرے دادا ریلوے کے ریٹائرڈ ملازم تھے۔ اور ان کی پنشن صرف ساٹھ روپے تھی۔

یوں امی کی کوششوں سے میری تعلیم جاری رہی تنگدستی اور بدحالی کی وجہ سے ابا نے دفتر کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں بھی ملازمت کرلی جس سے حالات تھوڑے بہت سدھرے مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دن جاری نہ رہ سکا۔ کسی طرح ابا کے دفتر میں یہ بات کھل گئی اور یوں ان کے سپرنٹنڈنٹ نے انہیں معطل کروا دیا۔

یہ خبر سارے گھر میں بجلی بن کر گری تھی، ابا نیم پاگل سے ہوگئے ہر وقت خیالوں میں بڑبڑاتے رہتے۔ نہ جانے کیا کیا کہتے رہتے، ربط سے الفاظ، غیر مبہم ہم پہلے ہی غم معاش کے ستائے ہوئے تھے یہ نئی مصیبت سہارنی مشکل ہوگئی تھی۔ آخر ایک روز امی کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ ابا کے دفتر جا پہنچیں اور ان کے پوسٹ ماسٹر صاحب سے ملاقات کی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب اچھے نیک اور رحم دل انسان تھے۔

انہوں نے ابا کو بحال کردیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تحریری طور پر معذرت کریں اور یہ لکھیں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ابا تو بحال ہوگئے لیکن بدحالی نے چاروں طرف سے ہمیں جکڑ لیا تھا۔

میری ماں انتہائی سلیقہ شعار اور صابر عورت تھی۔ انہوں نے کبھی بھی کپڑوں یا کسی بھی چیز کی فرمائش نہیں کی، جو روکھی سوکھی مل جاتی تھی وہ اسی پر صابر و شاکر تھی۔

میں ابھی چھوٹا ہی تھا کہ ابا نے مجھے کام پر لگانے کا سوچا مگر امی کی سخت مخالفت کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ہم روکھی سوکھی کھائیں گے مگر فہیم کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ یہ بڑا ہوکر افسر بنے گا اور ہمارا نام اونچا کرے گا۔



اس دوران میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ میں فارغ اوقات میں ٹیوشن وغیرہ پڑھایا کرتا تھا اور امی نے گھر میں سلائی کڑھائی کا کام شروع کردیا تھا۔ اس طرح وقت گزرتا رہا۔ ماں باپ کی حوصلہ افزائی سے میں نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ مگر میں گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ اس لیے مجھے بہنوں کی شادی اور چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ کہیں ملازمت کی جائے اور ساتھ ہی تعلیم بھی جاری رکھی جائے۔ لہٰذا میں نے نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور دن میں ملازمت کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ اس طرح سال بھر کی انتھک جدوجہد کے بے اثر ہونے پر آخر کار میں نے چپکے چپکے پوسٹ آفس کے اشتہار پر ملازمت کی درخواست دے دی۔ جہاں سے دو ماہ بعد انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور یوں میں پوسٹ آفس میں ملازم ہو گیا۔

ایک ماہ بعد جب میں نے یہ خبر گھر والوں کو سنائی تو سب دنگ رہ گئے۔ سب خوش تھے کہ اب شاید گھریلو حالات بہتر ہو جائیں گے۔ مگر امی کا غم صاف نظر آرہا تھا۔ وہ مجھے بڑا افسر بنانا چاہتی تھیں۔

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ہم جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں اس کے کوئی ذرائع و وسائل نہیں ہیں نہ ہی اس کی ترقی کے کوئی امکانات ہیں۔ میں ڈیڑھ سال سے ملازمت کے لیے پریشان تھا اور اب مجھے خیر سے نوکری مل گئی ہے اور یہ کیا کم تھا کہ میرا باپ پورٹر تھا میں سارٹر ہوں۔

قارئین! آپ سے التماس ہے کہ دعا کریں میرے ساتھ وہ سب نا ہو جو میرے والد صاحب کے ساتھ ہوا تھا۔ میں خدا کی رضا میں خوش ہوں۔

☆......☆......☆

کتنی محبت باقی ہے



عظمیٰ شکور

اُس دیوانے کا قصہ عجب جسے محبت نے کہیں کا نہ چھوڑا

میں نے خود کو بھی کوئی ارفع مخلوق نہیں سمجھا۔ میں بھی عام انسانوں کی طرح جذبات واحساسات رکھنے والا انسان ہوں۔ ہاں مگر محبت کے بارے میں میرے خیالات ذرا مختلف ہیں۔ میں جنونی محبت کا قائل ہوں۔ چاہتا تو ٹوٹ کر چاہتا اور سب قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار۔ محبوب کو روح کی گہرائیوں میں اتار لیتا اور اس کی یاد میں تارے گنتا، اور بدلے میں بھی ایسے ہی بے تحاشا محبت کی خواہش تھی میرے دل میں۔

مگر اب تک میں اس جذبے سے ناآشنا تھا یا وہ اب تک ملا نہیں تھا کہ جس کو نگاہیں ڈھونڈتی تھیں۔ پڑھائی میں اس قدر گم تھا کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا میرا۔ بس ایک ہی دھن کہ اچھے مارکس لے کر ایف اے پاس کرلوں۔ اور پھر بی اے کی طرف پوری توجہ دینا چاہتا تھا۔

ہم گاؤں کے لوگ یونہی دھن کے پکے ہوا کرتے ہیں۔ جس بات کے پیچھے لگ جائیں اسے پا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ میں نے ایف ایس سی اچھے نمبروں میں پاس کر کے بابا کی ساری محبتیں سمیٹ لی تھیں۔

ہم زمین دار لوگ تھے۔ گرنہ بھی پڑھتے تو اتنا تھا کہ ہماری نسلیں آرام سے کھالیتیں مگر میں زور بازو پر ایمان رکھتا۔ جب ہی آگے سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے کچھ وقت فارغ گزارنے کے بعد پھر سے کالج میں قدم رکھا اور بی اے کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔

بہار کے ابتدائی دن تھے۔ ننھی ننھی کونپلوں نے پھولوں کو جنم دیا تھا۔ ہرے بھرے پودے پھولوں سے بھرے بہت حسین دکھتے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں جب میرا ماتھا چومتیں تو قدرت پہ پیار آ جاتا۔ کہ بہار موسم ہی ایسا ہے۔

میں ہمیشہ کی طرح اپنی پڑھائی میں مصروف تھا کہ موبائل کی ٹون نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے کال پک کی تو دوسری طرف کوئی نسوانی آواز تھی۔ ''جی کون'' میں اسی قدر کہہ پایا۔ مگر وہ محترمہ تو جیسے بولنے میں ماہر تھیں۔ شروع ہوئیں تو چپ ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

جی آپ بلی کے بھائی ہو، پر بلی نے نمبر تو یہی دیا تھا۔ یہ بلی بھی نا ملے تو پوچھوں گی۔'' وہ بولے جا رہی تھی اور میں چپ چاپ، بہار میں بجنے والے ساز کو سن رہا تھا۔

وہ اردو خاصی روانی سے بول رہی تھی لگتا تھا جیسے وہ کراچی کی ہے۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس نے بول بال کر فون بند کر دیا۔ اور ادھر اس کی کال بند ہوتے ہی جیسے میرے دل کی دھڑکنیں بھی مدھم ہونے کو تھیں۔ آنکھوں میں اک نئی سی چمک تھی۔ ہونٹوں پہ دبی دبی مسکراہٹ ہلکی ہلکی مونچھوں پر پھیلی دکھ رہی تھی۔

''ارے یہ کیا۔ کیا ہو گیا مجھے۔'' میں نے خود کو ڈانٹا اور پھر کتاب کی طرف دھیان دیا۔ مگر یہاں تو موڈ ہی نہیں تھا، اب پڑھنے کو۔ کتاب کو بہت پیار سے بند کر کے میں بیڈ پر لیٹ گیا۔

اور آنکھیں بند کرلیں اس کی آواز سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔ اور انہی خیالوں میں، کب سو گیا پتا ہی

نہیں چلا۔ صبح بیدار ہونے پر ایک بار پھر مجھے رات کی کال یاد آ گئی۔ میں مسکرا دیا۔

دن بھر میں اِک انجانی خوشی میں خوش تھا۔ اور کیوں خوش تھا بس وجہ نہیں معلوم۔ دن بھر کالج میں پڑھائی کے بعد میں شام کو دوست کی طرف چلا گیا۔ خاصی گپ شپ رہی۔ میں نے اسے رات کی فون کی کال کا بتایا تو وہ ہنس دیا۔

''یار اگر اتنی ہی یاد آ رہی ہے تو فون کر لے۔'' اس نے مشورہ دیا۔ مگر میں ہمت نہیں کر سکا۔

''یہ لڑکیوں سے بات کرنے کا میرا کوئی خاص تجربہ

ویسے۔'' وہ بولے جا رہی تھی اور میں چپ اُسے سنے جا رہا تھا۔ آخر ہمت کر کے میں بولا۔

''جی وہ اصل میں، میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ وہ بات یہ ہے، وہ ہوا یوں......'' اور پھر سے میں چپ ہو گیا۔

''اے مسٹر مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ۔'' وہ غصے میں بولی۔

کیا میں کچھ دیر آپ سے بات کر سکتا ہوں۔'' میں گویا ہوا۔

''جی بولیے کیا بات۔'' وہ ہمدردی سے بولی جیسے



نہیں۔'' میں نے اسے کہا تو اسے یوں قہقہہ لگایا جیسے میں نے لطیفہ سنایا ہو۔

☆☆☆

رات کو میں بنا کھائے اپنے روم میں چلا گیا۔ اسٹڈی کرنے کو کتاب کھولی مگر جیسے جی نہیں چاہا۔ موبائل کو اٹھایا اور اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔ یہ سب میں نے اتنی جلدی میں کیا کہ بس۔ ادھر سے اس کی وہی مترنم آواز، کہ جس نے میرا سکون چھین لیا تھا۔

''جی بولیے، ارے جب کال کی تو بولیں حد ہی

میں کسی مشکل میں ہوں۔

''وہ میں پڑھتا ہوں۔'' میں نہایت سنجیدگی سے بولا۔

''تو'' وہ پوچھنے کے انداز میں بولی۔

''کیا میں آپ سے کبھی کبھار بات کر سکتا ہوں۔'' میں نے پھر بات بنائی۔

''جی مسٹر میں اتنی فارغ نہیں۔'' آپ اپنے کام سے کام رکھیں او کے۔'' اور کال کاٹ دی اس نے۔ میں اتنے میں ہی خوش تھا۔ اور پھر میں دو ایک کالز کے بعد وہ مجھ سے دوستی پر آمادہ ہو گئی اور جیسے مجھے تو سب

بھی بول گیا ہو میں بہت خوش تھا۔ اب ہماری روز ہی بات ہونے لگی۔ اس کا نام "مہک" تھا۔ اپنے نام کی طرح حسین تھی وہ۔ اور یہ دوستی کب محبت میں بدلی تھی نہ میں جانتا تھا۔ میں نے اُسے اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ چاہا تھا۔ میری محبت ایسی تھی جو اس پر اثر انداز ہوئی تھی اور وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی۔ محبت میں، میں نے پڑھائی کو ایک سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

وہ جو کہتی میں اُس کام کو کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا۔ اسے ایسا چاہا تھا کہ جیسے چاہے جانے کا حق تھا۔ اس کے دل میں میری کتنی محبت تھی میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ میری ہے، میرے لیے بنی ہے۔ اس محبت کا گواہ تھا میرا دل، میرا رب تھا۔

میں اُسے اپنانا چاہتا تھا مگر ابھی میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی پڑھائی پوری ہوئی تھی۔ اس کی یاد، اس کی محبت نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ہر وقت بس یہی خیال دل میں رقص کیا کرتا کہ کسی طرح اس سے بات ہو جائے۔ بات ہوتی مگر دل نہ بھرتا۔ دل اس کو نگاہوں کے سامنے جانے کو بے چین ہو جاتا۔

چند دن سے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے مہک مجھ سے دور ہو رہی ہے۔ وہ بات ہی کرنا نہیں چاہتی۔ مگر میں نے اس کو اپنا وہم گردانا، اور جھٹک دیا اس خیال کو۔

چند روز مزید گزرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ جو میں محسوس کر رہا تھا وہ واقعی سچ تھا۔ مہک جیسے مجھ سے اکتائی اکتائی تھی۔ کبھی کبھی تو میرا فون کاٹ دیتی۔ میرا دل دھڑکنا بھول جاتا یہ سب واقعی ہو رہا تھا۔ میں وجہ نہیں جان پایا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا تو صاف ٹال گئی۔ اب ہماری بات روز نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ہفتے میں بس دو بار ہوتی۔ میری پڑھائی تو پہلے ہی ڈسٹرب ہو چکی تھی اب زندگی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ ان دنوں میں اِک عذاب میں مبتلا تھا۔ کس سے کہوں اپنا دکھ، کس کو حال سناؤں میں۔ جینے سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔

اب مہک نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ میری حالت وہ تھی کہ نہ مردوں نہ جیتوں میں۔ اِک لاش بن گیا تھا جیسا۔ میری محبت بے کفن لاش کی مانند میرے سامنے پڑی تھی۔ کہاں دفن کروں اسے اندر سے آواز آئی۔

'مہک میرا قصور تو بتایا ہوتا۔' میں آنسوؤں سے تر لہجے سے کہتا۔ مگر کون تھا جو میری آہیں سنتا کوئی بھی تو نہیں۔

میں جب بھی اسے کال کرتا وہ مجھے گالیاں دیتی برا بھلا کہتی، پر میں نے کیا کیا۔

خدا جانے اس کی کہیں اور شادی ہو رہی تھی یا کوئی اور اس کی زندگی میں آ گیا تھا نہیں معلوم مگر میری زندگی تو تباہ ہو گئی تھی۔

میں نے مہک کو جنون کی حد تک چاہا تھا مگر جواب میں اس کی بے وفائی نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ ڈپریشن کا مریض بن گیا تھا۔ نیند اور بھوک ختم ہو گئی تھی۔ بڑھی شیو چہرے پر پژمردگی، آنکھوں کے گرد حلقے عجیب حالت بنائی تھی میں نے۔ پڑھائی چھوڑ دی، کیا محبت اتنی اذیت ناک ہوتی ہے میں نے سوچا۔

'مہک تم نے کیا کر دیا میرا حال، تمہیں بددعا بھی تو کیسے دوں کہ تمہیں چاہا ہے میں نے پوری سچائیوں کے ساتھ۔' دل آہیں بھرا کرتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب وہ بھی واپس نہیں آئے گی۔

دوستوں کے مشورے پر میں نے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی مگر اس کی یاد آنسو بن کر آنکھ میں چمکا کرتی۔ میں جتنا بھی اس کی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اتنا ہی میں ڈوب جاتا اس کے غم میں۔

ایک رات نیٹ پر ایک لڑکی سے بات ہوئی۔ وہ مجھے خاصی ہمدرد محسوس ہوئی۔ میں نے دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ مگر دل میں عہد کیا کہ وہ بس میری بہن ہے اس کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں اس سے۔

اس نے بڑی محبت سے مجھے سمجھایا، زندگی کو گزارنے کا قرینہ سکھایا۔ اور مجھے اس غم سے نکلنے میں مدد کی۔ اور مجھے اپنے خیالات، احساسات جذبات لکھنے کو کہا۔ اور مزید رسالے کا بھی بتایا کہ یہاں بھیجوں۔

اور میں نے اپنی بہن کے کہنے پر ہی اپنی تحریریں بھیجی۔ آج میں کافی حد تک مطمئن ہوں۔ پرسکون ہوں۔ اس کی یاد پھانس بن کر دل میں چبھتی ضرور ہے مگر تکلیف میں افاقہ ہے۔ مجھے بس اپنے دوستوں سے یہی کہنا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے اپنے مقصد نصب العین سے کبھی نہ ہٹنا۔ اور وفا کے طلب گار نہ بننا ان دو رنگوں میں وفا نہیں۔

☆☆☆

کراچی سے بھیجی حکایت

آشنا نا آشنا

سعدیہ عابد

عین مایوں والے دن بھی کوئی سہاگن، طلاقن ہوئی ہے کیا......؟

زارا ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ ابھی محض میٹرک میں ہی تھی کہ رشتے آنے لگے۔ خاندان کی بھی کتنی ماؤں کی دلی آرزو تھی کہ وہ زارا کو اپنی بہو بنائیں کہ وہ صورت ہی نہیں سیرت میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ والدین کی اکلوتی اولاد جسے نازو نعم دیا گیا۔ اتنی کم عمری میں زارا کے بابا اس کی شادی کے لیے قطعاً راضی نہ تھے اس لیے باہر کے ہی نہیں رشتے داروں کے بھی کسی پرپوزل کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور زارا نے انٹر بھی امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔

ایک کزن کی شادی میں اس کے دوست علی احمد نے زارا کو دیکھا تو اس کی من موہنی صورت پر دل ہار گیا۔ اور اگلے ہی ہفتے اپنے والدین کو زارا کا رشتہ لے کر بھیج دیا۔ علی پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا۔ اور دبئی کی ایک کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ زارا کو رشتوں کی کمی نہ تھی اس لیے اس کی ماں اس کی شادی پاکستان سے باہر کرنے کو ہرگز بھی راضی نہ تھیں۔ لیکن علی کے اصرار پر اس کے والدین نے زارا کے گھر کی چوکھٹ پکڑلی تھی۔ اور اس کی اتنی محبت اور اس کے گھر والوں کی چاہت دیکھتے ہوئے علی کا رشتہ منظور کرلیا گیا۔

اس سارے قصے سے زارا یوں انجان تھی جیسے معاملہ اس کی زندگی کا نہ ہو کہ کیوں اس نے اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار اپنے والدین کو دیا ہوا تھا۔ زارا اور علی کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

علی کی طرف سے فون پر بات کرنے پر اصرار تھا مگر اس نے علی سے منگنی کے بعد بھی بات نہیں اور منگنی کے تین ماہ بعد علی دبئی واپس چلا گیا۔ زارا کا گریجویشن میں ایڈمیشن ہوگیا۔ چھ ماہ بعد ہی علی کے گھر والوں نے شادی پر زور ڈالنا شروع کردیا۔ زارا اور علی کے والدین نے متفقہ فیصلے سے نکاح کی تاریخ مقرر کردی تاکہ زارا کے دبئی جانے کے انتظامات شادی سے پہلے ہی ہوجائیں۔

☆☆☆

علی کی پاکستان واپسی ہوئی۔ اور ایک شاندار تقریب میں علی نے زارا کے تمام حقوق اپنے نام کروالیے۔ وہ بہت مسرور تھا اور وہ اپنی خوشی اور محبت کا اکثر و بیشتر زارا سے اظہار کرنے لگا تھا۔ کہ نکاح کے بعد وہ علی کے ساتھ آؤٹنگ وغیرہ کے لیے تو کبھی نہیں گئی تھی۔ البتہ فون پر بات کرنے لگی تھی۔ اور اس پر بھی علی کی خوبیاں کھل رہی تھیں۔ وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ اور اپنے والدین کے فیصلے پر پہلے

ان کی خوشی کے لیے راضی تھی اب اس میں اس کی خوشی بھی شامل ہونے لگی تھی۔

نکاح کے اگلے ہی ماہ علی واپس چلا گیا۔ اور وہیں اکثر زارا کو ہی نہیں اس کے والدین کو بھی کال کر کے خیریت معلوم کر لیتا تھا۔ علی کی والدہ شوگر پیشنٹ تھیں۔ اس لیے اکثر طبیعت اَپ اینڈ ڈاؤن ہوتی رہتی تھی۔ انہیں بھی زارا سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اور زارا صرف ان کی خوشی اور ضد سے مجبور ہو کر اکثر ان کے گھر جانے لگی تھی۔ جبکہ اس کے والدین کو یہ بات مناسب نہیں لگتی تھی کہ ان کی بیٹی رخصتی سے قبل اپنے سسرال جائے۔ لیکن وہ علی کی والدہ کی محبت کے آگے مجبور ہو گئے تھے۔ زارا کی علی کی بہن جو شادی شدہ تھی اور چھوٹے بھائی جو میٹرک کا طالب علم تھا سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی علی کے گھر جاتی کچن سنبھال لیتی تھی۔ اور علی کے والدین اسے دعائیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ اور اسی طرح ہنسی خوشی، ہنستے ہنستے، مستقبل کے خواب سجائے ڈیڑھ سال گزر گیا تھا۔ اور دونوں گھروں میں رخصتی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔

تاریخ جو فکسڈ ہوئی تھی عین مایوں کے دن اس کا بی کام کا لاسٹ پیپر تھا۔ اس نے کزنز کے نرغے میں رہ کر بڑی مشکل سے پیپر کی تیاری کی تھی۔ اور پیپر دینے کالج چلی گئی۔ وہ اس بات سے قطعاً انجان تھی کہ جب لوٹ کر آئے تو سب کچھ اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہوگا۔ اس کی خوشیاں اس سے روٹھ گئی ہوں گی۔

......☆☆☆......

وہ جس وقت گھر میں داخل ہوئی تھی ہال کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایک ایک کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی اس کی نگاہ اپنی ماں کے چہرے پر ٹھہری گیا تھی اپنے اندر اضطراب سمیٹ لائی تھی۔ اور وہ تقریباً دوڑ کر پہنچی تھی۔ اور انہوں نے اُسے خود سے لگاتے ہوئے یوں رونا شروع کیا تھا کہ کمرے میں موجود ہر شخص آبدیدہ ہو گیا تھا۔ اور وہ



پریشانی سے باپ کو دیکھنے لگی تھی۔ جو آج اسے بوڑھے محسوس ہوئے تھے۔ اور وہ سب سے وجہ پوچھ پوچھ کر ہارنے لگی تھی۔ مگر کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی اسے اس پر ٹوٹنے والی قیامت سے آگاہ کرتا کہ وہ یکدم چیخ پڑی تھی۔

''کوئی مجھے بتائے گا بھی کہ کیا ہوا ہے؟ سب اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

وہ اپنے بابا کے سامنے آن رکی تھی۔ ان کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اور زارا کے ماموں نے بہت حوصلہ کر کے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھایا تھا۔ کہ لب سے کچھ کہہ پانے کی ان میں سے کسی میں بھی ہمت ہوتی۔ اسے اب تک اپنے ہر سوال کا جواب مل چکا ہوتا۔

اس نے آزردہ نظر آتے ماموں کے ہاتھ سے کاغذ لیا تھا۔ اور قدرے سی نگاہ کاغذ پر پھیلی تھی۔ اور بے یقینی و کرب سمیٹ لائی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اس کی موت کا پروانہ تھا۔

طلاق نامہ دیکھ کر اس کا ذہن و دل مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا تھا۔ اور وہ اپنے پورے قد سے زمیں بوس ہوتی چلی گئی تھی۔

مصیبت ہی مصیبت تھی۔ غم ہی بڑا نہ تھا کہ یہ افتادان کی اکلوتی بیٹی زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ ڈاکٹروں کی گیارہ گھنٹوں کی محنت شاقہ کے بعد وہ موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ دھیرے دھیرے زندگی معمول پر آنے لگی تھی۔ مگر زارا آج تک یہ سمجھ نہیں پائی کہ علی نے ایسا کیوں کیا؟

قارئین آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ عین مایوں کی دوپہر کو کوریئر کے ذریعے طلاق نامہ موصول ہوا تھا۔ اور علی کے اس قدام سے علی کے والدین بھی انجان ہی تھے۔ وہ صبح سے علی کے غائب ہونے پر پریشان تھے۔ اور زارا کے نروس بریک ڈاؤن کا سن کر ہاسپٹل پہنچے تھے۔ تو انہیں پتا چلا تھا کہ علی نے جسے بہت چاہت و مان سے اپنایا تھا۔ اسے بلا جواز چھوڑ دیا ہے۔ اس واقعہ کو تقریباً سات سال گزر گئے ہیں۔ اور ان سات سالوں میں ایک بار بھی علی نے کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ آج تک یہ بات معمہ بنی ہوئی ہے کہ آخر علی نے طلاق کیوں دی؟ اور وہ چلا کہاں گیا؟ ایسی کون سی وجہ تھی کہ اس نے اپنے والدین تک سے رابطہ نہیں کیا؟ علی کی نیک فطرت کے سبب کچھ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ وہ کسی مصیبت کا شکار ہوا ہے۔ اور کچھ علی کو زارا کی زندگی برباد کرنے کا سزاوار سمجھتے ہیں۔ لیکن زارا کے والدین نے کبھی علی کے لیے ایک لفظ بددعا کا منہ سے نہیں نکالا۔

علی کے والد کا تقریباً دو سال قبل انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ کافی بیمار رہنے لگی ہیں۔ وہ زارا سے بے حد شرمندہ ہیں۔ ان کے والدین سے کتنی ہی بار معافی طلب کر چکی ہیں۔ اور ان کی آنکھوں میں بیٹے کا انتظار بس گیا ہے۔ دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔

اس سب میں زارا کا کافی نقصان ہوا۔ زندگی یکدم کانٹوں کی راہ گزر بن گئی۔ کہ ملنے جلنے والوں کے سوالات نے اُسے گوشہ نشین ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کے والدین نے اس پہاڑ جیسے دکھ سے خود کو ہی نہیں بیٹی کو بھی نکالا۔ اور اس کا تعلیمی سلسلہ پھر سے جوڑ دیا۔ اس نے ماسٹرز کی ڈگری لی۔ اور ایک پرائیوٹ بینک میں جاب کر لی۔ آج سے تین ماہ قبل اس کی اپنے ماموں کے بیٹے سے منگنی ہو گئی تھی۔ اور دسمبر میں اس کی شادی ہے کہ زندگی اس پر پھر سے مہربان ہونے لگی ہے۔ اسے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں مگر یہ بات اسے سکون نہیں لینے دیتی کہ علی نے ایسا کیوں کیا؟

قارئین آپ سے التماس ہے کہ آپ زارا کے لیے دعا کریں اور علی کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔ اور ممکن ہے کہ اُسے دعاؤں کی ضرورت ہو کہ دعا کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔

☆☆☆

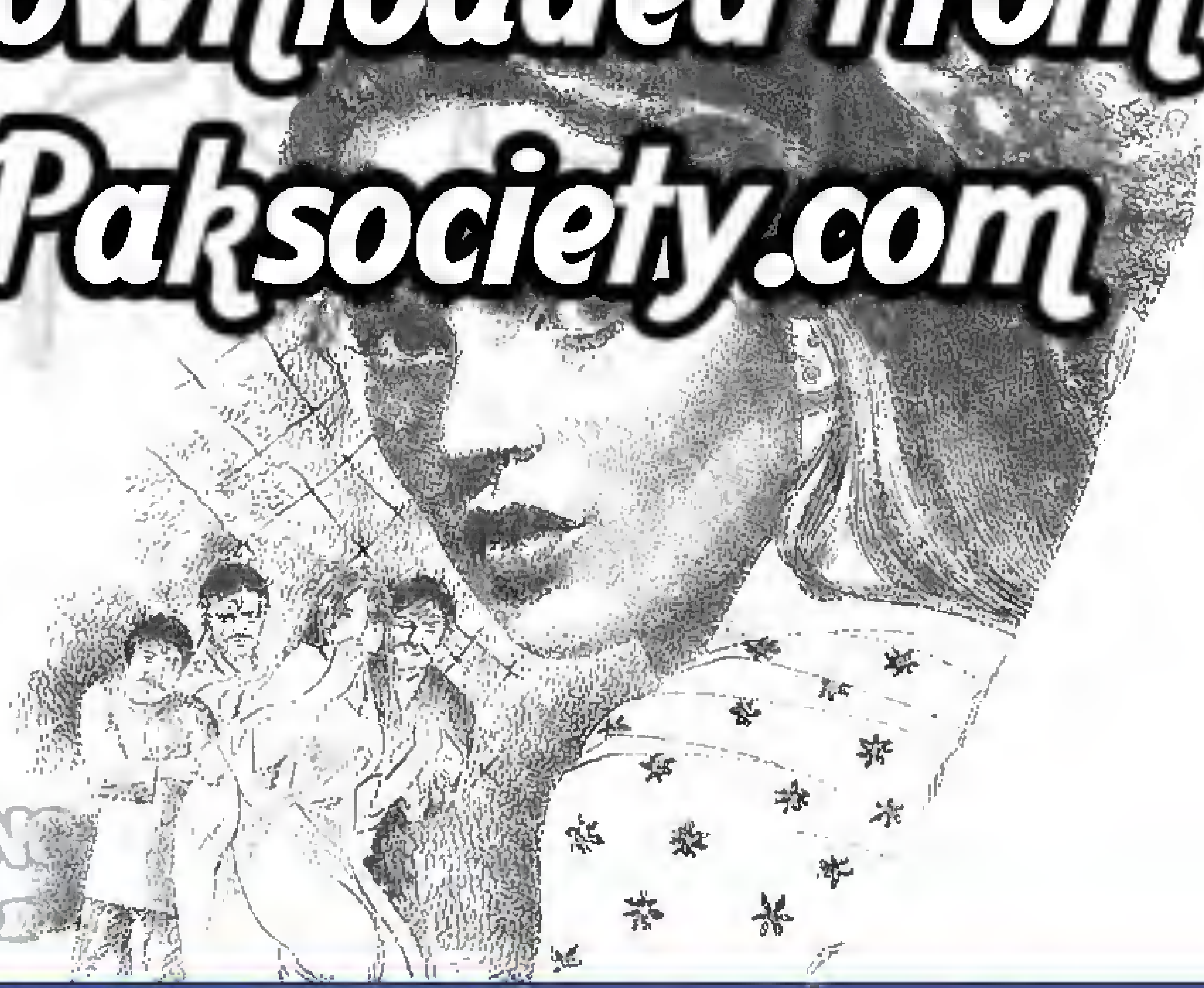
شہر عروس البلاد سے ساتویں حکایت

محلے کی بیٹی

اُم عادل

یہ اُس وقت کی بات ہے جب دوسرے کی عزت اپنی عزت سمجھی جاتی تھی، مگر......

یہ غالباً 88یا 89ء کی بات ہے۔ ان دنوں ہم مارٹن کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ میں نے اور میری بہن نے میٹرک پاس کر کے اکٹھے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ میرے خیال میں یہ وقت انسانی زندگی کا سنہری دور ہوتا ہے۔ امنگوں بھرے دل میں ایک ہی وقت میں بہت کچھ کرنے، بہت سی کامیابیاں حاصل



کرنے کا جذبہ اس عمر کے بچوں کو کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اس وقت ٹی وی تو تھا مگر آج کے دور کی طرح طالب علموں کے پاس نہ تو کیبل تھی اور نہ کمپیوٹر اور نہ ہی یہ دردِ سر موبائل فون۔ اس لیے پوری لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو وقت بچتا اُسے دیگر ہنر جیسے کوکنگ سلائی، ایمبرائڈری، فلاور میکنگ وغیرہ سیکھنے کا عام رواج تھا۔ کالج سے آ کر اپنا وقت اِدھر اُدھر کی باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے ہم دونوں بہنیں بھی پی آئی بی کالونی میں موجود ایک سینٹر بیدل کٹنگ اور ایمبرائڈری سیکھنے جایا کرتی تھیں۔ مارٹن کوارٹر سے پی آئی بی سبزی منڈی کی بیک سائیڈ جہاں ہمارا سینٹر تھا خاصا طویل فاصلہ ہے مگر ہمارا روزانہ پیدل ہی سینٹر آنے جانے کا معمول تھا۔ باتیں کرتے راستہ کٹ جاتا۔ اور فاصلہ زیادہ محسوس نہ ہوتا۔ سہ پہر کے تین بجے سخت دھوپ گرمی یا پھر سردی برسات کا کوئی بھی موسم ہمارے عزم کے جوش میں رکاوٹ نہ بنتا۔ ہماری مستقل مزاجی کو ہمارے سینٹر کی ٹیچر بھی سراہتی تھیں۔

ایک دن کالج میں میری دوست طوبیٰ نے جو پی آئی بی کالونی میں ہی رہتی تھی نے مجھے بتایا کہ آج میں اپنی والدہ سے کہہ کر آئی ہوں۔ لہٰذا آج میں کالج سے چھٹی کے بعد تمہارے ساتھ، تمہارے گھر چلوں گی۔ پھر جب تم دونوں بہنیں تین بجے اپنے سینٹر کے لیے جاؤ گی میں تمہارے ساتھ اپنے گھر چلی جاؤں گی۔

''میں یہ اطلاع پا کر خوش ہوگئی کیونکہ میں طوبیٰ کو اپنے گھر بلانے کے لیے کئی دن سے اصرار کر رہی تھی۔

کالج سے چھٹی کے بعد ہم تینوں تقریباً ڈیڑھ بجے گھر آئے۔ امی سے دوست کا تعارف کروایا۔ امی نے طوبیٰ کو دعا دی اور کہا چلو جلدی سے تم چینج کرو میں تمہارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔''

''امی جان آج پکا کیا ہے؟'' میرا سوال سن کر امی مسکرائیں۔

آج پلاؤ بنا ہے۔ ارے واہ۔'' ہم واقعی خوش ہوگئے۔ اچھا ہے کوئی دال یا سبزی کا سالن نہیں بنا۔ ہماری امی جان نہایت لذیذ پلاؤ بناتی ہیں۔ پلاؤ کے ساتھ سلاد اور رائتہ بھی تھا۔

طوبیٰ کو بھی کھانا بہت پسند آیا۔ پھر ہم تینوں لڑکیاں اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر تھوڑا آرام کرنے کے ساتھ باتیں بھی کرتی رہیں۔ اسی دوران بہن چپکے سے اُٹھی اور چائے بنا لائی۔ ہم چائے پی کر فارغ ہوئے تو تین بج چکے تھے۔ یہ مئی کی ایک تپتی دوپہر تھی ہم تینوں گھر سے امی کو خدا حافظ کہہ کر نکلے، اپنی دھن میں مگن باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ سخت گرمی کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ ہم جس راستے سے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک گلی سے ایک خاتون بدحواسی سے چلاتی چلی آ رہی تھیں۔

''ہائے بچے کو جان سے مار دیا۔'' وہ تقریباً دوڑتی ہوئی نزدیک ہی ایک دوسری گلی میں مڑ گئیں۔

ہم تینوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہوا کیا ہے؟ خاتون اتنی بدحواس کیوں تھیں؟ میں نے سوچا شاید کچھ بچے آپس میں جھگڑ پڑے ہوں گے اور کوئی بچہ زیادہ زخمی ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خاتون اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔ ہم اس خاتون کے بارے میں کوئی تبصرہ نہ کر پائے اور چلتے ہوئے گلی کے سرے تک آگئے جہاں پی آئی بی کالونی کی مین سڑک گزرتی ہے۔

جیسے ہی ہم موڑ مڑ کر سڑک پر پہنچے سامنے کے منظر نے ہمارے قدم ساکن کر دیے۔ ہم تینوں خوف کے مارے تقریباً چپک کر ایک کے ساتھ کھڑی ہوگئیں۔ ہم سے چند ہی قدم کے فاصلے پر 19-18 سالہ کا نوجوان لڑکا جس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور نرخرے سے خون کے فوارے کی صورت بلند ہو رہا تھا۔ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ لڑکے کی نہ صرف گردن پر وار کیا گیا تھا بلکہ اس کا پیٹ بھی چاک تھا اور آنتیں تقریباً باہر پڑی تھیں۔ منظر اتنا ہیبت ناک تھا کہ وہاں سے بھاگ جانے کی خواہش

کے باوجود ہمارے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے اور ہم تینوں بت بنے جم کر وہیں کھڑے تھے۔ آس پاس کی تمام دوکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ بند ہونا شروع ہو گئے۔ دکاندار بجائے اس مرتے ہوئے کی مدد کرنے کے پولیس کی تفتیش سے بچنے کے لیے ادھر اُدھر ہو گئے۔ لیکن دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اچانک ایک رکشے والا کہیں کسی گلی سے نکل آیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو فوراً رکشہ روکا اور لڑکے کو اٹھا کر رکشے میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ تنہا اُسے اٹھانا پار ہا تھا۔ کہیں سے کوئی اور شخص اس کی مدد کو آنکلا دونوں نے مل کر لڑکے کو اٹھایا۔ اٹھانے کے عمل سے لڑکا تہہ سا ہو گیا۔ کیونکہ گردن کی طرح اس کا پیٹ بھی کمر تک کٹ چکا تھا۔ مگر وہ ابھی زندہ تھا۔

جب رکشہ چلا گیا تو کچھ لوگ ادھر اُدھر سے سڑک پر نکل آئے مگر ہم تینوں اب بھی ویسے ہی چپک کر کھڑی تھیں۔ ہماری ٹانگیں گویا خوف سے سن ہو گئی تھیں۔ جب کچھ حواس بحال ہوئے تو ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور نا جانے کس طرح چل کر سینٹر پہنچے کیونکہ وہاں سے سلائی سینٹر کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ سینٹر سے پہلے والی گلی میں طوبیٰ کا گھر تھا وہ اپنی گلی میں مڑ گئی۔ سینٹر میں سب نے ہمیں اتنا بدحواس اور گھبرایا ہوا دیکھ کر وجہ پوچھی ہم نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آنکھوں کا دیکھا حال بتایا۔

انھوں نے ہمیں بٹھایا پانی پلایا تو ہمارے حواس بحال ہوئے۔ واپسی میں گھر ہم راستہ بدل کر آئے۔

☆☆☆

گھر آکر ہم نے گھر والوں کو بھی تمام واقعہ بتایا۔ امی تو بہت ہی پریشان ہو گئیں۔ اس نوجوان کی زندگی کی دعائیں کرنے لگیں۔

اس واقعے کے بعد آنے والی پہلی رات ہم دونوں بہنوں نے تقریباً جاگ کر گزاری۔ سونے کے لیے جیسے ہی آنکھیں بند کرتے اس بے چارے لڑکے کے نرخرے سے نکلتا خون اور تڑپتا وجود ہمیں

تم گئے تو اور کچھ نہیں ہوا

تم گئے تو اور کچھ نہیں ہوا
دل اعتماد گھٹ گیا مرا
میں جو دل کے پیچھے اس کے نقش پا پہ
پاؤں رکھ کے چلتا تھا
چلتے چلتے دیکھا تو نشان ختم ہو گئے
تم گئے تو اور کچھ نہیں ہوا
دل سے اعتبار اٹھ گیا مرا
شاعر: گلزار

گھبرا کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتا۔

جیسے تیسے رات گزری صبح اخبار آیا۔ اخبار کے فرنٹ پیج پر کل والے واقعے کی نمایاں خبر تھی۔ اس وقت آج کے دور کی قتل و غارت گری اتنی عام نہ تھی جیسی کہ اب ہے۔ قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی چیونٹی کو مسل کر پھینک دینا۔ کوئی ایک قتل کی خبر بھی شہ سرخی کے ساتھ فرنٹ پیج پر جگہ پاتی تھی۔ تفصیلات کے مطابق لڑکا ہسپتال پہنچ کر مر چکا تھا۔ بے چارے کا اپنا کوئی ذاتی مسئلہ نہ تھا۔ ہمارے سینٹر سے دو تین گلیاں چھوڑ کر وہ لڑکا رہتا تھا اور کچھ ہی دور ایک گرلز اسکول تھا۔ دوپہر ایک بجے اسکول کی چھٹی ہونے پر کچھ بدمعاش لڑکے لڑکیوں کو تنگ کرنے لگے یہ مقتول بلکہ میں تو شہید کہوں گی۔ لڑکا وہاں سے گزر رہا تھا اس نے دیکھا اُس کے محلے کی لڑکیوں کو بدمعاش لڑکے پریشان کر رہے تھے۔ اس نے ہمت کر کے انھیں روکا بلکہ ہٹایا۔

جاتے جاتے وہ اس سے نپٹ لینے کی دھمکیاں دینے لگے۔

دو ہی گھنٹوں بعد یعنی تین بجے وہ کہیں کام سے جا رہا تھا۔ ظالموں نے دو موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر دائیں بائیں سے چھریوں سے اس پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں قوم کا ایک روشن ستارہ اور ایک بے قصور خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔

☆☆☆

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 15

ڈاکٹر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ شرجیل کی سانسیں چل رہی تھیں اور وہ واقعی زندگی کی طرف تیزی سے لوٹ رہا تھا۔

''لیکن یہ کیسے ہوا؟'' ڈاکٹر بری طرح الجھ چکا تھا۔ اسی الجھن میں اس کی نظریں ان مشینوں کی طرف خود بخود اٹھ گئیں۔

''تو کیا مشینیں خراب ہو چکی ہیں'' اس نے سوچا۔ کچھ دیر پہلے اسے سو فیصد یقین تھا کہ شرجیل مر چکا ہے۔ بالکل اسی طرح کا یقین جیسے وہ خود زندہ تھا اور اس کا ثبوت اس کی چلتی ہوئی سانسیں تھیں۔ اسی طرح شرجیل کی سانسیں رک چکی تھیں اور مزید پر یقین ہونے کے لیے اس نے مشینوں کی طرف دیکھا مشینیں بھی یہی بتا رہی تھیں کہ شرجیل مر چکا ہے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس ہسپتال کی شہرت سے سارا شہر واقف تھا۔ یہاں کسی ایسی فاش غلطی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہر چیز ہر روز چیک کی جاتی تھی پھر بات صرف مشینوں کی نہیں تھی اس کا اپنا بھی سالہا سال کا تجربہ اسے یہ بتا چکا تھا کہ مریض جہانِ فانی سے کوچ کر چکا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ ایک مرا ہوا پیشنٹ پھر سے اسی طرح زندہ ہو گیا کہ...... اس وقت مشینیں بھی وہی کہہ رہی تھیں جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے شرجیل کی نبضیں چیک کیں اور اس کے زندہ ہونے کا سارا طبی جائزہ لیا۔ شرجیل کا جسم ہر جگہ سے گرم تھا اور وہ اتنی تیزی سے زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا کہ ڈاکٹر بجائے خوش ہونے کے مسلسل پریشان ہوتا رہا...

اس کا ذہن یہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی دنیا میں اب بھی معجزے ہوتے ہیں۔ کسی مریض کا چلتا ہوا علاج اور یکایک اس کی حالت میں بہتری آتے تو اس نے کئی بار پہلے بھی دیکھی تھی اور اسی ایک بات سے وہ اللہ کے ہونے اور اس کی قدرت کی عظمت کو ماننے پر مجبور تھا بلکہ وہ اچھا خاصا مسلمان تھا جسے اپنے خدا پر کامل یقین تھا اور اس ایک یقین میں اسے کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ آج اس کے سامنے اللہ نے اسے ایک ایسے معجزے سے روشناس کرایا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا فوری طور پر اس معجزے پر یقین کر لے یا اس کے ذہن میں جو سوالات ابھر رہے تھے جن میں سب سے زیادہ زور شور سے یہ سوال گونج رہا تھا کہ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' لیکن اس کا ذہن کتنے ہی سوال کر لے اور ان کے جوابات اسے چاہے نہ ملیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے سامنے جو



پیشنٹ لیٹا ہوا تھا جسے کچھ دیر پہلے اس نے آپریشن ٹیبل پر موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور جس کی اطلاع وہ اس کے لواحقین کو دینے گیا تھا۔ کہ وہ مر چکا ہے اور اچانک ایک نرس آ کر اس کے کان میں کہتی ہے کہ پیشنٹ زندہ ہو رہا ہے۔

اس کی ساری دانائی' اس کا سارا تجربہ اس وقت اس معجزے کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ معجزہ کہتے بھی اسی کو ہیں جس کے سامنے عقل دنگ رہ جائے اور عقل ماننے سے انکاری ہو۔ اس نے دل ہی دل میں بے دلی سے شکر ادا کیا کہ ابھی وہ مریض کے لواحقین کو یہ بتانے نہیں پایا تھا کہ ان کا پیشنٹ مر چکا ہے۔ اور نرس اسے بلانے آ گئی۔ ڈاکٹر جس کا نام عابد تھا۔ نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے معجزے کے اظہار کے وقت اس کی عزت کا بھی خیال رکھا ورنہ وہ اگر پیشنٹ کے لواحقین کو یہ بتا چکا ہوتا کہ ان کا پیشنٹ مر چکا ہے اور وہ بعد میں زندہ ہوتا تو اس کا لائسنس کینسل ہو سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا پیشنٹ کوئی غریب یا لاوارث نہیں ہے بلکہ وہ ایک بہت بڑے بزنس مین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جس کے لیے کسی بھی ڈاکٹر کی غلط بیانی یا غلطی کرنے پر اسے ڈاکٹری کے پیشے سے نکلوا دینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا۔ صنوبر اور شرجیل کے ماں باپ اس کی طرف لپکے۔ وہ جاننے کے لیے شدت سے بے چین تھے' جس وقت سے ڈاکٹر' نرس کی کسی اطلاع پر واپس چلا گیا تھا اس وقت سے صنوبر کی سانسیں بے ترتیب ہوئی پڑی تھیں۔ گھبراہٹ تو شرجیل کے ماں باپ پر بھی طاری تھی اور وہ مسلسل دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ یا رب ان کا بیٹا خیریت سے ہو۔ اس کی جان کو کچھ نہ ہو۔ شرجیل کی ماں نے تو کتنی ہی منتیں بھی مان لی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اس طرح کھونے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ڈاکٹر عابد نے انھیں جب یہ بتایا کہ شرجیل اب خطرے سے باہر ہے۔ اور چند ہی گھنٹوں میں وہ ہوش میں آ جائے گا۔ آپ اس سے مل سکیں گے حتیٰ کہ دو چار دنوں میں اسے اپنے ساتھ بھی لے جا سکیں گے۔ شرجیل کی ماں اسی وقت سجدہ ریز ہو گئی۔ اس نے خدا کا انگنت بار شکریہ ادا کیا اور صنوبر کی مارے خوشی کے چیخیں نکل گئیں۔ وہ اپنی ماں درشہوار سے اتنی زور سے چمٹی کہ درشہوار کو لگا اس کی کوئی نہ کوئی پسلی ضرور چٹخ گئی ہو گی۔ لیکن اس وقت وہ اپنی بیٹی کی خوشی کو دیکھ کر اپنا ہر درد بھول چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے اور جب درشہوار کو شرجیل کی ماں کو مبارک باد دینے کا خیال آیا تو شرجیل کی ماں بھی خوشی سے کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ بھی خوشی کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ درشہوار اس کے پاس مبارک باد دینے گئی تو وہ درشہوار سے اس طرح چمٹ گئی جیسے دونوں ایک دوسرے کی بہت پرانی سہیلیاں یا بہنیں ہوں۔ درشہوار نے انھیں والہانہ مبارک باد دی تو رخسانہ ملک بجذب سے کہا۔

''یہ سب آپ کی بیٹی کی کوششوں سے ممکن ہوا۔ صنوبر وقت پر پہنچ کر شرجیل کی مدد نہ کرتی تو آج.....''

اس سے زیادہ وہ کہہ نہیں سکیں۔ صنوبر ان کے نزدیک ہی کھڑی ہوئی تھی اسے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اب یہ سب جو شرجیل کو دل کی گہرائیوں سے زندہ دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی اپنی جان شرجیل کی سانسوں میں اٹکی ہوئی تھی سب اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کے مشتاق تھے۔ درشہوار نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بولی۔

''یہ حماد کہاں چلا گیا۔ اچھا ہوتا وہ یہاں ہوتا تو کہیں سے مٹھائی خرید لاتا۔ میں شرجیل کے والدین کو اس خوشی میں مٹھائی کھلانا چاہتی تھی۔'' اس بات کو سن کر سرفراز ملک نے پہلی بار ایک ایسی نظر سے درشہوار کو دیکھا جن میں ممنونیت اور احسان و شکر کے رنگ موجود تھے۔

عورتیں ہمیشہ ایسے موقعوں پر یہ یاد نہیں رکھ پاتیں کہ مرد جو باپ ہے اس کے سینے میں بھی اپنی اولاد کے لیے ایک ایسا دل دھڑکتا ہے جو دنیا کے سارے مردوں سے مختلف ہے۔ باپ بھی اپنی اولاد کو ماں سے کم محبت نہیں کرتے بس مرد ہونے کی وجہ سے انھیں لاشعوری طور پر یہ خیال رکھنا ہوتا ہے کہ وہ ماں کی طرح بین نہیں کر سکتے آنسو نہیں

بہا سکتے اور چیخ و پکار نہیں مچا سکتے۔ ایسا ہی سرفراز ملک کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ شرجیل کے حادثے کا سن کر ان کے پیروں تلے بھی زمین نکل گئی تھی۔ انھوں نے کبھی خواب میں نہیں سوچا تھا ان کا اکلوتا بیٹا کبھی اس قسم کے حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان کا دل بھی خوب تڑپا۔ عجب نہیں تھا کہ اس صدمے سے ان کا دل چلنا ہی چھوڑ دیتا۔ انھوں نے خود کو کمال حوصلے سے کھڑا رکھا اور دل کو یہ یقین دلاتے رہے کہ ان کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا وہ ضرور بچ جائے گا۔ اور جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا۔ تاہم اس دوران جب آپریشن چل رہا تھا وہ بھی اندر ہی اندر پھوٹ پھوٹ کے روئے تھے۔ پہلی بار انھوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ کوئی ایسی طاقت ہے جسے خدا کہتے ہیں جو اس وقت ان کی مدد کر سکتی ہے۔ اور ان کا روپیا پیسا اس وقت کچھ بھی کام نہیں آ سکتا۔ انھوں نے بھی اپنے اللہ کو دل سے پکارا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شرجیل ان کی ساری زندگی کی ایک ہی متاع ہے اگر یہ لٹ گئی تو وہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ انھوں نے اندر ہی اندر ہزاروں سجدے کیے۔ بے شمار دعائیں مانگیں ہر سانس کے ساتھ اللہ کو پکارا، غریبوں کو کھانا کھلانے اور ان کے تن ڈھانپنے کی منتیں مانیں۔ اور اب ان سب کو جو شرجیل کو دل سے چاہتے تھے یہ خوشخبری مل چکی تھی کہ شرجیل زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے۔

''ہو سکتا ہے وہ گھر چلا گیا ہو ماما۔'' صنوبر نے ماں کی پریشانی دیکھ کر کہا۔ درشہوار کو یاد آیا کہ وہ واقعی گھر چلا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اسے بہت دیر سے نہیں دیکھا تھا۔ اور وہ کہاں جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اس لڑکے کا کچھ پتا بھی تو نہیں چلتا۔ ایک بار پہلے بھی انھیں کچھ بھی بتائے بغیر کئی دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا کہیں ایسا ہی پھر تو نہیں کیا اس نے۔ پھر خود ہی انھوں نے اپنے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے سوچا کہ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی سیلری کے دن قریب ہیں اور یہ کہ شاگرد پیشے کے لوگ اپنی سیلریز کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ سارا مہینا سیلری کا انتظار کرتے ہیں۔ انھیں اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ ان کے سب ہی ملازم مہینے کا پہلا ہفتا ختم ہوتے ہی اپنی اپنی تنخواہوں کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ حماد بھی ایک ملازم ہے اور وہ تو یوں بھی اوروں سے زیادہ غریب ہے۔ اسے تو اپنی تنخواہ کے پیسے اپنے ماں باپ کو گاؤں بھیجنے ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنی سیلری چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ انھوں نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا کہ وہ ضرور گھر ہی گیا ہوگا۔ پھر ساتھ ہی ایک حیرت اور تشویش نے ان کے دل میں سر اٹھایا کہ یہ ہسپتال تو گھر سے کافی دور تھا وہ گھر گیا کیسے ہوگا؟ اس سوال کا وہ خود کو تسلی بخش جواب نہیں دے سکیں۔

البتہ صنوبر کو کوئی اور وقت ہوتا یا شرجیل کی زندگی کی خوشخبری نہ ملتی تو حماد پر بہت غصہ آتا کیونکہ اس وقت اس کی ہسپتال میں کچھ بھی لانے اور کسی بھی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے اشد ضرورت تھی۔ اور وہ غائب تھا۔ لیکن وہ اس طرح سوچنے کے بجائے مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ شرجیل کو بچانے اور وقت پر اس کی مدد کرنے میں حماد نے جو کردار ادا کیا تھا اس کے لیے وہ ساری زندگی بھی اس کا شکریہ ادا کرتی رہے تو کم ہوگا۔

دوسری طرف جب فارس رحمٰن کو یہ خبر ملی کہ ہسپتال میں شرجیل کی زندگی اب خطرے سے باہر ہے تو اس نے پہلے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ زندہ بچ گیا۔ اسے پہلے ہی صابو کی اس حرکت پر غصہ آیا ہوا تھا کہ اس نے شرجیل کو تقریباً جان سے مار ہی دیا تھا۔ اور جس یقین سے صابو نے کہا تھا کہ وہ مر چکا ہے اس کے بعد فارس کو ایک فیصد بھی امید نہیں رہ گئی تھی کہ شرجیل زندہ بچ سکے گا۔ لیکن اب جو اسے یہ خبر ملی تو اسے بے اختیار خوشی ہوئی کہ شرجیل زندہ تھا۔ اس نے اسی کیفیت میں جہانی کو فون ملایا۔

☆☆☆

درشہوار نے سرفراز ملک کے ڈرائیور سے مٹھائی منگوائی تھی اور اب وہ مٹھائی سارے ہسپتال میں تقسیم کروا رہی تھیں۔ شرجیل کے والدین اور صنوبر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے اور شرجیل مسلسل صنوبر کو دیکھے جا رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ شرجیل کے جسم میں سلمان جن گھسا ہوا ہے جو اب یہ سوچ

یہ فیصلہ کر کے صنوبر کو ایک بڑے صدمے سے تو بچا لیا ہے مگر خود کو بہت بڑی مصیبت کے حوالے کر دیا ہے۔ عشق میں واقعی کیسے کیسے ناقابل یقین امتحانات دینے پڑتے ہیں۔ اب اسے شرجیل بن کے رہنا ہوگا۔ اور سلمان اور حماد کو بظاہر غائب ہو جانا ہوگا۔ سلمان سے بھی زیادہ اس وقت سب سے پہلے حماد کی ڈھنڈیا مچے گی اور وہ کسی بھی طرح اب حماد کو پھر سے نہ تو بچا سکے گا اور نہ ہی اب شاید کبھی بھی وہ حماد بن کر صنوبر اور اس کے گھر والوں کے سامنے آ سکے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یہ فکر بھی لاحق ہو چکی تھی کہ شرجیل کے ماں باپ اور دیگر گھر والے جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اب ان سب کے درمیان اسے مسلسل رہنا ہوگا اور انہیں شرجیل بن کے دکھانا ہوگا۔

یہ سوچ سوچ کر اس کی روح ہلکان ہوئے جا رہی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ یہ اس کے لیے پسندیدہ بھی نہیں تھا اس نے جو یہ اتنا بڑا فیصلہ کیا تھا کہ اپنی ہستی شرجیل کے وجود میں گم کر دی اور اپنی ہر پہچان سرے سے مٹا دی تو یہ شرجیل یا اس کے گھر والوں کے لیے نہیں کیا تھا اس کا کارن صرف اور صرف صنوبر تھی۔ جسے وہ کسی بھی قیمت پر اس بہت بڑے صدمے سے بچانا چاہتا تھا۔ بظاہر اس نے صنوبر کے چہرے کی مسکراہٹ کو بجھنے سے بچا لیا تھا مگر آگے کیا ہونے والا تھا کیسے عذابوں سے اس کا واسطہ پڑنے والا تھا یہ سب وہ جانتا نہیں تھا لیکن اس بارے میں سوچ سوچ کر تشویش میں ضرور مبتلا ہو چکا تھا۔ سب سے بڑا دکھ تو اسے یہ تھا کہ اب وہ صنوبر کے اتنا نزدیک نہیں رہ سکے گا جتنا وہ حماد بن کے رہا کرتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل اس بات پر خوشی سے سرشار ہوئے جا رہا تھا کہ کچھ بھی ہو اب صنوبر اس سے محبت کرے گی۔ بظاہر وہ اپنے شرجیل سے محبت کر رہی ہوگی مگر بباطن وہ سلمان کو اپنی محبت کے آب زم زم میں نہلا رہی ہوگی۔ اور یہ خیال ہی سلمان کے لیے ساری دنیا کی پریشانیوں اور فکروں کا منہ موڑنے کے لیے بہت کافی تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اسے سوچتے دیکھ کر صنوبر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... بس تمہیں دیکھ رہا ہوں.....'' وہ رکا پھر بولا۔ ''جس وقت وہ سب مجھے مار رہے تھے تو ایک پل کو تو مجھے ایسا لگا جیسے میں اب تمہیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا لیکن مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ اور میں بچ گیا۔ تمہارے سامنے ہوں۔ دل چاہتا ہے بس تمہیں دیکھتا رہوں۔''

سلمان نے کہا تو صنوبر کی نظریں ایکا ایکی شرجیل کے ماں باپ کی جانب اٹھ گئیں۔ شرجیل سے وہ اتنی بے باکی کی توقع نہیں کر رہی تھی اور ویسے بھی شرجیل ایسا تھا بھی نہیں۔ لیکن موت کے منہ سے واپس آنے کی بے پناہ خوشی نے شاید اسے ایسا بنا دیا ہے۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ شرجیل نہیں سلمان ہے اور سلمان اور شرجیل کے مزاجوں اور شخصیت میں کچھ تو فرق تھا۔ جسے اب سلمان کو ختم کرنا تھا، صاف معنوں میں اسے سلمان کو ایسے بھول جانا تھا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور اس کا راز ہمیشہ راز ہی رہے۔ اپنے عشق کی خاطر وہ کیا کچھ کر چکا تھا اور ابھی پتا نہیں کیا کچھ کرنا باقی تھا۔ صنوبر نے شرجیل کے ماں باپ کی طرف دیکھا تو اسے بھی اس طرف دیکھنا پڑا اور تب اس کی سمجھ میں آیا کہ صنوبر اس کی اس بات کو سن کر حیران ہو رہی ہے اور اسے شاید شرم بھی آ رہی ہے۔ وہ سمجھ گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اب احتیاط سے کام لے گا۔

☆☆☆

''لیکن صابو تو کہہ رہا تھا کہ وہ لازمی مر جائے گا۔'' جہانی نے ایسے کہا جیسے اسے اس بات سے کوئی خوشی نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے لہجے میں کچھ کچھ مایوسی کا غلبہ محسوس ہوتا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فارس سے ناراض تھا جو اسے صابو کے پاس چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس کے بعد سے فارس نے اس سے کئی بار معافی مانگ لی تھی لیکن جہانی کے دل سے یہ داغ دھل نہیں سکا اور وہ چاہتا تھا کہ شرجیل اگر مر جاتا تو اچھا ہوتا اس طرح فارس کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملتی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اگر شرجیل کی موت یا قتل کی تفتیش ہوتی تو وہ بھی اس میں پھنس سکتا تھا کیونکہ وہ فارس کے سبھی منصوبوں میں یا تو شریک ہوتا تھا یا ان سے باخبر ہوتا تھا۔ لیکن غصے اور ناراضگی میں انسان کچھ

سوچنے کی صلاحیت سے کب محروم ہو جاتا ہے اسے خود خبر نہیں ہو پاتی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ غصہ صرف سامنے والے کو ہی نقصان نہیں پہنچاتا وہ غصہ کرنے والے کو بھی کافی نقصان پہنچاتا ہے۔ انسان کو یہ بات کتنی ہی کیوں نہ سمجھا دی جائے۔ وہ اپنے غصے کو کبھی قابو نہیں کر سکتا کیونکہ انسان کے اختیار میں ہر چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑی کڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے جو ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

''اچھا ہوا یار وہ بچ گیا نہیں تو خوامخواہ لوچا ہو جاتا'' فارس نے جہانی کے لہجے کی مایوسی اور تلخی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو یہ سوچ کر حیران ہوں کہ اسے بچایا کس نے۔ اور بچانے والے کو یہ کیسے پتا چلا کہ صابو نے اسے کہاں پھینکا ہے۔ یہ بات تو خود تم کو بھی نہیں معلوم تھی پھر کسی اور کو کیسے پتا چلی۔ کہیں صابو ڈبل کراس تو نہیں کر رہا کہ اس نے ہی کسی کو فون کر کے شرجیل کو مدد فراہم کرنے کا کہا ہو؟''

فارس کو فوری طور پر یہ بات اچھی تو نہیں لگی کیونکہ اسے یقین تھا کہ صابو ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اسے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ شرجیل کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن جہانی کی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ کسی بھی بچانے والے کو اس جگہ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا کہ شرجیل زخمی حالت میں کہاں پڑا ہے۔ اس طرح کی باتیں سوچنے کے بعد بہر حال اس نے اپنے ذہن کو زیادہ الجھنوں کا شکار نہیں ہونے دیا اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ کچھ بھی ہو۔ وہ بچ گیا تھا یہ زیادہ اچھی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی اس وقت وہاں سے اتفاقیہ گزر رہا ہو اور اس نے شرجیل کو بچا لیا ہو۔

''کچھ بھی ہو اب اس کمینے کو یہ تو پتا چل چکا ہے کہ صنوبر کے راستے سے میں آنا اسے کتنا بھاری پڑ سکتا ہے۔'' فارس نے ایک قسم کے غرور سے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے.... مگر یہ تو اس کے ٹھیک ہونے کے بعد ہی پتا چل سکے گا۔ جہاں تک اس وقت کا منظر ہے وہ تو یہی ہے کہ صنوبر اس وقت بھی اسی کے کمرے میں موجود ہے اور اس کی دل جوئی کرنے میں مصروف ہے۔'' جہانی نے تائید بھی کی اور فارس کے دل میں ایک نئی چنگاری کو بھی ہوا دے دی۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''مجھے کون بتائے گا۔ سلمان نے بتایا ہے وہ کہہ رہا تھا اس کی ممی اور صنوبر بہت دیر سے شرجیل کو دیکھنے ہسپتال گئی ہوئی ہیں'' جہانی نے کہا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی پوچھا۔ ''تمہیں کس نے بتایا شرجیل کے زندہ ہونے اور بچ جانے کے بارے میں؟''

''مجھے میرے والد سے پتا چلا۔ انھیں سرفراز ملک کی کمپنی سے فون آیا تھا۔ اب تک شاید وہ بھی اسے دیکھنے جا چکے ہوں''

''اچھا!'' جہانی نے مردہ سے لہجے میں کہا۔ اور دونوں کے درمیان رابطہ منقطع ہو چکا۔ فارس کے دل میں شرجیل کو دیکھنے اور یہ جاننے کا تجسس شور مچانے لگا تھا کہ آخر وہ کس حالت میں ہے اور اب اس کی سوچوں میں کیا چل رہا ہے۔ کیا وہ جان چکا ہے کہ اس پر حملہ میں نے کرایا تھا۔ یقیناً جان چکا ہوگا کیونکہ صابو سے اس نے خود کہا تھا کہ شرجیل کی دھلائی کرتے وقت یہ ضرور کہے کہ صنوبر کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ جان سے جائے گا۔ فارس نے اپنے بے چینی کو تسکین دینے کے لیے اپنے والد کو فون کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کے ساتھ شرجیل کو ہسپتال دیکھنے وہ بھی جانا چاہتا ہے۔ اس کے والد نے اس بات کو ایک دوست کی ہمدردی اور دوستی کا آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے ساتھ لے جانے میں خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن وہ اپنے آفس سے سیدھے ہسپتال جانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے فارس کو اپنی گاڑی سے ہسپتال پہنچنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔

فارس اور اس کے والد جب شرجیل کو دیکھنے ہسپتال پہنچے تو صنوبر وہاں سے جا چکی تھی۔ فارس کو خوشی ہوئی کہ

جیسا وہ راستے بھر سوچتا ہوا آیا تھا منظر اس سے مختلف تھا اور صنوبر... شرجیل کی دل جوئی کرنے کے لیے وہاں موجود نہیں تھی۔ لیکن شرجیل کے والدین وہاں اب بھی موجود تھے۔ فارس نے راستے سے پھولوں کا ایک بکے خرید لیا تھا تا کہ شرجیل کے زخموں کو پھولوں کے پردے میں کانٹوں سے مزید زخمی کر سکے۔ جس وقت وہ ہسپتال میں داخل ہوا تو شرجیل کے والد ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے باہر ہی مل گئے۔ فارس کے والدان کے پاس رک کو ساری سچویشن کا پتا کرنے لگے اور فارس ان سے یہ کہہ کر شرجیل کے کمرے میں چلا آیا کہ ''میں شرجیل سے مل لیتا ہوں''

وہ بکے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو ''شرجیل اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا آنکھیں بند کر کے کسی خیال میں منہمک تھا اور اس کی والدہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی شاید سو رہی تھیں۔ فارس نے جیسے ہی قدم کمرے میں رکھا تو شرجیل نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں اور آہٹ پا کر شرجیل کی والدہ بھی جاگ گئیں۔ شرجیل نے انھیں سلام کیا اپنا تعارف کرایا اور بکے شرجیل کو دیتے ہوئے جواب بیڈ پر اٹھ کے بیٹھ چکا تھا۔ اس کے عین نزدیک جا کر بولا۔

''امید ہے اب تم صنوبر کو بھول جاؤ گے، ورنہ....'' فارس نے فلمی مکالموں کی طرح اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور اس ادھوری بات میں جو دھمکی چھپی ہوئی تھی اسے شرجیل نے اچھی طرح پہچان لیا۔ اس نے ایک نظر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ہاں.. میں بہت ڈر گیا ہوں۔ مجھے ایسی لڑکی کی محبت نہیں چاہیے جس میں جان جانے کا خطرہ ہو'' فارس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں غرور اور خباثت کے رنگ ابھرے اور وہ ساتھ ہی رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

''تم کافی سمجھدار ہو شرجیل... پھر ایسا کیسے ہوا۔ کیا کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟'' یہ بات فارس نے با آواز بلند کہی۔

''نہیں... جھگڑا تو نہیں ہوا تھا۔ کسی کمینے نے پیچھے سے وار کیا' نہیں تو میں اسے ایسا مزا چکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔'' یہ سنتے ہی فارس نے اسے چونک کر دیکھا کہ ابھی کچھ لمحوں پہلے تو یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایسی محبت سے باز آیا اور اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔

''کچھ بھی ہو تم اس طرح کی دشمنی پالنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ آنٹی اور انکل کو تمہاری وجہ سے کتنی پریشانی ہوئی ہے یہ تم نہیں جانتے اس لیے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ ایسی ہر بات سے دور ہی رہو' فارس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے.... اس طرح کا حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہوتا تو اس کے والدین کو اسی طرح کی پریشانی ہوتی۔ رہی بات دشمنی کی تو میری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ یہ تو کسی حاسد' کسی چھپے ہوئے دشمن نے اوچھا اور بزدلانہ حملہ کیا ہے۔ اگر وہ مرد کا بچہ ہے تو سامنے سے آ کر وار کرے پھر بتاتا ہوں اسے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔'' فارس کو اچھی طرح احساس ہو گیا کہ بیڈ پر لیٹے ہوئے اس ٹوٹے پھوٹے لڑکے نے یہ ساری باتیں اسے سنانے کے لیے کہی ہیں۔

''کیوں اپنا فیوچر خراب کرتے ہو۔ لڑائی بھڑائی میں کیا رکھا ہے۔ ہماری کلاس کے لوگ دشمن نہیں بناتے۔ کیوں آنٹی؟'' اس نے شرجیل کی ماں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی جس میں وہ حسب روایت کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ وہ چپ ہوا تو شرجیل کی ماں نے اس کی بات کی تائید کی اور خود کچھ لینے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

''ہاں اب کہو کیا کہہ رہے تھے۔'' شرجیل کی آواز کی گرج سن کے فارس کو بالکل نہیں لگا کہ یہ وہی شرجیل ہے جسے صابو نے مارنے کی کوشش کی تھی۔

''تم نے یہ سب اس لیے کیا تا کہ میں صنوبر سے نہ ملوں اسے پانے، اسے حاصل کرنے کا خواب بھی نہ

دیکھوں۔ تو کان کھول کر سن لو فارس رحمٰن! میں تمہاری آنکھوں کے سامنے صنوبر سے ملوں گا بھی اور اسے اپنا بھی بناؤں گا۔ اگر تم میں دم ہے تو روک کے دکھانا۔ دیکھتا ہوں کتنا مرد کا بچہ ہے تُو" شرجیل کے لہجے کی گھن گرج ایسی تھی کہ فارس رحمٰن کا پتہ پانی ہونے لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یار میں کیوں تم پہ حملہ کرانے لگا۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" پہلے تو فارس نے چالاکی سے کام لیا۔ لیکن اس کی چالاکی شرجیل پر تو چل سکتی تھی لیکن اس وقت تو شرجیل کے وجود میں سلمان تھا اور سلمان کوئی انسان نہیں بلکہ ایک جن تھا اور جن انسانوں سے نہیں بلکہ انسان جنات سے ڈرتے ہیں۔

"زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے چوہے.... تُو کیا سمجھتا ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں سب جانتا ہوں یہ بھی کہ تُو نے صابو جیسے بدمعاش کو پیسے دے کر یہ کام کروایا تھا۔ تجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ خود میرا سامنا کرتا۔ گھٹیا انسان کرائے کے بدمعاشوں سے کسی کی سپاری دے کر کسی کی مار لگانے یا انھیں جان سے مارنے کا کام بزدل کیا کرتے ہیں اور تُو... تو بزدل ہے۔ میں ذرا ہسپتال سے فری ہو جاؤں پھر نہ تجھے بخشوں گا نہ تیرے اس بدمعاش کو!! سمجھا کتے۔" شرجیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی ہسپتال کی نزاکت کی پروا کیے بغیر فارس کا منہ توڑ ڈالے۔

اب فارس کو بھی غصہ آ گیا اسے کیا پتا تھا کہ اس کے غصے کے سامنے کون ہے۔

"میں چپ ہوں تو تم بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو۔ تم مجھے ابھی جانتے نہیں ہو۔ میں فارس ہوں... فارس! چاہوں تو تمہیں ابھی یہاں اسی بیڈ کو تمہاری میت کا بستر بنا سکتا ہوں۔ بہتر ہوگا زبان سنبھال کے بات کرو۔ اور مت بھولو کہ میرے باپ کا کتنا پیسا تمہارے باپ کے کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ اس وقت بھی اس کمرے سے باہر تمہارا باپ میرے باپ کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ مدد کی بھیک مانگ رہا ہے سمجھے چھوئی موئی.... میں تم جیسے لڑکوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لڑکیوں کے سامنے بڑی محبت بھگارتے ہو ویسے اندر سے بلی کے بچے جتنا زور بھی نہیں ہوتا تمہارے جیسوں میں۔" فارس اور پتا نہیں کیا کچھ کہتا کہ اس کے منہ پر ایک زور کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا اور فارس سامنے رکھے صوفے پر جا کے گرا۔ فارس کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایک ایسا انسان جسے موت کے منہ سے بچایا گیا ہو وہ ہسپتال کے بستر پر ہونے کے باوجود اتنا طاقتور ہو سکتا ہے۔

"جا چلا جا یہاں سے ورنہ ایسا نہ ہو اسی وقت اسی ہسپتال سے تیرا باپ تیری لاش اپنے ساتھ لے کر جائے۔" شرجیل نے غصے سے کہا۔ فارس کراہتا ہوا اٹھا اور خونخوار نظروں سے اس نے شرجیل کی طرف دیکھا اور وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت ایک نرس کمرے میں آئی اس نے شرجیل کا بلڈ پریشر چیک کیا اور مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ یہ وہ ہی نرس تھی جس نے ڈاکٹر عابد کو شرجیل کے زندہ ہونے کا بتایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ یہ عجوبہ دیکھ رہی تھی کہ ایک ایسا انسان جسے آپریشن کر کے موت کے منہ سے واپس لایا گیا ہے اس کی ہر چیز اتنی جلدی اتنی نارمل کیسے ہے۔ اسے اندر ہی اندر ڈاکٹر عابد کی طرح ایک قسم کی حیرت کا سامنا تھا جس کا اظہار وہ مسکرا کے کرنا چاہتی تھی۔ نرس اپنا کچھ سامان بھول گئی تھی اس لیے وہ پھر کمرے میں واپس آئی اور سامان اٹھا کے جاتے ہوئے اس نے فارس کی طرف دیکھا جس کی شکل سے اس کے اندر کی تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن وہ بولی کچھ نہیں...

"سسٹر آپ کو کیا لگتا ہے مجھے کب ڈسچارج کیا جا سکتا ہے۔ میں کب یہاں سے جا سکتا ہوں۔" شرجیل نے پوچھا۔

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں سر آپ تو بہت جلد صحت یاب ہو رہے ہیں۔ انشاء اللہ بس دو چار دن میں ہی آپ کو چھٹی مل جائے گی۔" نرس نے جواب دیا۔

"اصل میں مجھے کچھ حساب بے باک کرنے ہیں اس لیے میں جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہتا ہوں

شرجیل نے فارس کی طرف نظریں گاڑھتے ہوئے دیکھا۔
''جی جی میں جانتی ہوں۔ آپ کو بہت سے کام کرنے ہیں۔ آپ نے تو ہم سب کو حیران کر دیا ہے۔ اللہ کی آپ پر خاص مہربانی ہے ورنہ اتنی جلدی کوئی آپریشن کا پیشنٹ ری کور نہیں کرتا۔ فکر میں مت کریں میں ڈاکٹر عابد کو جا کر بتاتی ہوں۔'' نرس نے جواب دیا۔
''جی شکریہ سسٹر...'' نرس چلی گئی اور فارس بیٹھا رہا۔ شرجیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اب یہاں بیٹھے مت رہو اپنی شکل یہاں سے گم کرو۔ میری ماما آئیں گی تو پوچھیں گی کہ تم ایسی منحوس شکل بنا کے کیوں بیٹھے ہو۔ چلو اب نکلو یہاں سے'' شرجیل نے آواز نیچی مگر غصے کے سہارے سر استعمال کرتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے.... جاتا ہوں.... مگر تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ جتنی جلدی ہسپتال سے جانے کی تمہیں ہے اتنی ہی اب مجھے بھی ہے۔ تم ذرا باہر تو آؤ پھر دیکھو میں کیا حشر کرتا ہوں۔ تمہارا'' بڑی مشکل سے فارس نے یہ سب کہا۔ فارس اٹھ کر کمرے سے جانے لگا تو کمرے میں اسی وقت اس کے اور شرجیل کے والد داخل ہوئے۔ رحمٰن صاحب شرجیل کے قریب آئے شرجیل نے انھیں سلام کیا۔ وہ بولے
''اب کیسی طبیعت ہے بیٹے؟''
''جی اب میں ٹھیک ہوں۔ بس گھر جانے ہی والا ہوں'' شرجیل نے مسکرا کر کہا۔
''لیکن بیٹے یہ سب ہوا کیسے۔ کیا تم انھیں جانتے ہو جن لوگوں نے تم پر حملہ کیا تھا؟''
''جی انکل جانتا ہوں۔ مگر ابھی میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے چپ ہوں'' شرجیل اوپر کی طرف سرکا۔ تو رحمٰن صاحب اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھے۔
''اس کی ضرورت نہیں ہے انکل میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شرجیل نے انھیں روک دیا۔
''بھئی سرفراز اللہ نے تم پر اپنا بڑا اکرم کیا ہے ورنہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے وہ تو بہت تشویش ناک ہے۔ میں حیران ہوں کہ ایسا کون دشمن ہو سکتا ہے جو اتنا سفاک ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ چونکے اور پھر شرجیل کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''بیٹا کیا انھوں نے کوئی مطالبہ بھی کیا تھا جسے تم نے نہیں مانا تو انھوں نے ایسا سلوک کیا؟'' یہ سن کر شرجیل سے بھی زیادہ فارس کے کان کھڑے ہوئے کہ اس بات کا شرجیل کیا جواب دینے والا ہے۔ اور جو جواب شرجیل نے دیا اس نے فارس کا نہیں شرجیل کے اپنے باپ کا بھی فیوز اڑا دیا۔
''جی وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں صنوبر کو بھول جاؤں''
''کیا....'' شرجیل کے والد سرفراز ملک بری طرح چونکے۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو!''
''جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں انھوں نے ایسا ہی کہا تھا'' شرجیل نے ایک بار پھر اپنی بات کی تائید کی اور کمرے میں موجود کسی نے نہیں دیکھا کہ ایسے کہتے ہوئے اس نے فارس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔
''اوہ تو یہ لڑکی کا چکر ہے... اس کا مطلب ہے یہ حملہ لڑکی کے بھائی یا اس کے باپ نے کرایا ہے؟'' رحمٰن صاحب نے جیسے سراغ لگاتے ہوئے شرجیل کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی۔
''نہیں انکل ایسا کچھ نہیں ہے۔ لڑکی والے تو مجھے جانتے ہیں انھوں نے ہمارا رشتا منظور بھی کر لیا ہے۔ میری ماما گئی تھیں ان سے بات کرنے۔'' شرجیل نے جان بوجھ کر پوری بات نہیں کی۔
''ایسا ہے تو پھر کیا معاملہ ہے۔ بیٹے؟'' رحمٰن صاحب نے اس کی طرف تجسس سے دیکھا۔ سرفراز ملک یہ سن کر حیران ہو رہے تھے کہ ان کی بیگم لڑکی کے گھر رشتا مانگنے جا چکی ہیں اور انھیں خبر تک نہیں ہوئی۔ تب ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ کیوں در شہوار یہاں اسپتال میں موجود تھیں۔ وہ ان کی موجودگی کو پہلے از راہ ہمدردی سمجھ رہے تھے کیونکہ انھی کی بیٹی صنوبر نے شرجیل کو بازیاب کرایا تھا اور ہسپتال تک پہنچایا تھا۔
''میں ابھی کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن بہت جلد آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' شرجیل نے کچھ اس طرح

روکھائی سے کہا کہ رحمن صاحب نے بھانپ لیا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ انھیں اب اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر اپنے بیٹے فارس کی طرف دیکھا اور فارس کی آنکھوں میں موجود کچھ ہچکچاہٹ اور کچھ شرمندگی نے انھیں کہانی کا پہلا پنا سمجھا دیا تھا۔ انھوں نے فوری طور پر سرفراز ملک سے اجازت لی اور ہسپتال کے طویل کوریڈور سے گزرتے ہوئے اپنی گاڑی تک آنے اور اپنے پیچھے آتے ہوئے فارس کی طرف مڑ کر بولے سیدھے گھر پہنچو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ فارس نے اثبات میں جواب دیا اور دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوگئیں۔

صنوبر کو ایک طرف شرجیل کے زندہ بچ جانے کی خوشی تھی تو دوسری طرف اس خیال نے اسے بے چین کر دیا تھا کہ فارس رحمن اس حد تک جاسکتا ہے وہ شرجیل کی جان لینے کی پروا بھی نہیں کرے گا۔ ابھی اتنی جلدی ابھی تو کوئی بات آگے نہیں بڑھی ابھی تو ان کا رشتا بڑوں میں منظور بھی نہیں ہوا تھا۔ تو کیا فارس کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہم کورٹ میرج کرنے کا سوچ رہے تھے۔ یکا یک اس کے ذہن میں اس بات نے ایک نئی بے چینی کو ہوا دی۔

''نہیں نہیں... ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔ اسے یہ بات کون بتائے گا۔ اس کی دوست ندا...!'' ندا کے نام پر بھی اس کا دل نہیں مانا۔ یہ نہیں ہوسکتا ندا تو کبھی ایسا نہیں کرسکتی۔ تو پھر یہ کام کس نے کیا۔ اس کے بعد تو حماد ہی کا نام باقی بچتا تھا اور حماد نے تو خود شرجیل کی جان بچانے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا وہ اگر فارس سے ملا ہوا ہوتا تو اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ شرجیل کی جان بچانے کی کوشش کرتا۔ اتنا سوچ کر وہ تھم گئی اور اسے خیال آیا کہ حماد اس کے بعد سے غائب ہے۔ ماما اور میں سمجھ رہے تھے کہ وہ گھر چلا گیا ہوگا لیکن وہ تو گھر بھی نہیں آیا اور اب تو دو دن ہو چکے تھے اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ لیکن صنوبر یہ ماننے یا حماد پر ایسا شک کرنے کو آمادہ نہیں ہوئی کہ حماد فارس سے ملا ہوا ہوسکتا ہے۔ بلکہ اسے یقین ہو گیا کہ حماد فارس نے ہی غائب کیا ہے۔ جو شخص شرجیل پر جان لیوا حملہ کرا سکتا ہے اس کے لیے حماد کو غائب کرانا کون سا مشکل ہے۔ اس بات کا یقین کرنے کے بعد صنوبر کی پریشانی اور بڑھ گئی اب اسے اس خیال نے جکڑ لیا کہ اگر ایسا ہے تو اسے کسی بھی طرح حماد کی مدد کرنی چاہیے۔ مگر کس طرح.... یہ تو اس کے ذہن کی بلندیوں کے کسی آخری سرے پر کہیں موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اسے ایک خیال آیا اور وہ اپنے بھائی سلمان کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ سلمان یا تو گھر پہ ہوتا نہیں تھا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ سو رہا ہوتا یا پھر کھانے کھانے، چائے پینے اور نہانے دغیرہ جیسے لازمی کاموں میں مصروف ہوتا۔ اس وقت دن کے چار بجے تھے اور صنوبر کو پورا یقین تھا کہ وہ اس وقت سو رہا ہوگا۔ اسے جا کر جگانے سے اس کا موڈ خراب ہو جائے گا اور پھر وہ سیدھی بات کا بھی الٹا جواب دے گا۔ لیکن یہ حماد کے غائب ہونے اور فارس کے اسے اغوا کرنے یا جس بے جا میں رکھنے والی بات ایسی تھی کہ صنوبر نہ چاہتے ہوئے بھی سلمان کو نیند سے جگانے پر مجبور ہوگئی۔ وہ سلمان کے کمرے کے پاس پہنچی تو حسب توقع اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ پہلے تو صنوبر نے ہلکے سے دستک دی کہ شاید ابھی گہری نیند نہ سویا ہو لیکن پھر اسے بادل نخواستہ زور زور سے سلمان کے کمرے کا دروازہ پیٹنا ہی پڑا۔ سلمان نیند سے جاگا اور حسب عادت غصے سے اس نے دروازہ کھولا۔ پہلے وہ اندر سے ہی کون ہے، کون ہے کہتا رہا کہ شاید اٹھنا نہ پڑے اور بستر پر لیٹے لیٹے ہی اسے بھگا دینے میں کامیاب ہو جائے، صنوبر اس کی بہن تھی اور بچپن سے اس کی ساری عادتوں سے واقف تھی اس لیے اس کے کون ہے، کہنے پر وہ چپ سادھے کھڑی رہی حتیٰ کہ سلمان کو دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

''کون ہے کیا..... کیوں...''

اس نے دروازہ کھولتے ہی غصے سے کہنا شروع کیا لیکن سامنے صنوبر کو کھڑے دیکھ کر اسے ایک دم حیرانی ہوئی۔

''تم... اس وقت... اور یہ'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ تم تھیں جو اس طرح جاہلوں کی طرح دروازہ پیٹ رہی تھیں

مگر صنوبر نے اسے آگے کہنے نہیں دیا اور جلدی سے بولی۔
''مجھے تم سے ایک کام ہے چلو ہٹو اندر آنے دو''صنوبر کو دروازے پر دیکھ کر وہ پہلے ہی تحیر کے پانی میں غوطہ زن تھا اس کا یہ انداز اسے مزید الجھن میں ڈالا گیا۔ کتنے ہی دن ہوئے جب سے صنوبر نے اس کے کمرے میں آنا تو دور اس سے ٹھیک سے بات کرنا تک چھوڑ دیا تھا۔ اور ایسا اسی بات کو لے کر ہوا تھا جب سلمان نے صنوبر کو اپنے اوباش دوست فارس سے شادی کا مشورہ دیا تھا۔ وہ صنوبر کی آمد پر اتنا حیران ضرور ہوا کہ اس کی نیند اڑن چھو ہوگئی اور وہ پوری طرح ہوش میں آتے ہوئے بولا۔
''ضرور کوئی اہم بات ہے جو تم نے اس طرح دروازہ بجایا''
''جی...''صنوبر نے اطمینان سے اس کے کمرے میں لگے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''کیا تمہیں فکر نہیں ہے کہ حماد کہاں چلا گیا ہے؟''
''کیا مطلب تم اس نوکر کے لیے مجھ سے پوچھ رہی ہو!''سلمان فوراً ہی سمجھ گیا کہ صنوبر کی بات کا کیا مطلب ہے۔
''ہاں اسی کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ اس کی ناموجودگی سے سب ہی کو پریشانی ہے اور تمہیں بھی اس کا نہ ہونا بہت کھلتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''صنوبر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چراتے ہوئے اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔
''ہاں ہے تو پریشانی مگر وہ تو پہلے بھی اسی طرح بنا کچھ بتائے بھاگ گیا تھا۔''
''نہیں ایسا نہیں ہے وہ مجھے بتا کر اپنی ماں سے ملنے گیا تھا۔ ممی اسے چھٹی نہیں دیتیں اس لیے اس نے مجھ سے کہا اور حسب وعدہ واپس بھی لوٹ آیا تھا لیکن اس بار وہ مجھ سے بھی کچھ کہہ کر نہیں گیا۔''
''ہاں تو؟''وہ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔''تو تم مجھ سے کیا پوچھنے آئی ہو تمہارے خیال میں کیا وہ مجھے بتا کر گیا ہے؟''
''نہیں میں ایسا کچھ کہنے نہیں آئی۔ اور نہ ہی میں ایسا سمجھتی ہوں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے؟''
''کیا.......!!!''سلمان اپنی جگہ سے اچھل ہی تو پڑا۔''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے کون اغوا کر سکتا ہے۔ ابھی اس ملک میں نوکروں کو اغوا کرنے کا کوئی سلسلہ شروع نہیں ہوا ہے۔''اس نے ایک ہی بات میں دو تاثر دیے۔ ایک میں طنز تھا اور دوسرے میں حیرت۔
''مجھے شک ہے سلمان اسے تمہارے دوست فارس نے کہیں غائب کر دیا ہے''صنوبر اپنی بات گھما پھرا کر کہنے سے ہونے والی دیر کا احساس کرتے ہوئے جلدی سے اصل مرکز پر آگئی۔
لیکن اس بار سلمان کو نہ حیرت ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی طنزیہ جملہ کہا بلکہ وہ اس کا تمسخر اڑانے کے انداز میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور ہنسی کے بیچ میں سے بولا۔
''تم نے شادی سے انکار کر دیا تو اب تم سمجھتی ہو فارس اتنا پاگل ہو چکا ہے کہ وہ ہمارے گھر کے ایک نوکر کو اغوا کر کے ہمیں سزا دینا چاہتا ہے۔''ہنسی رک گئی اور وہ مزید بولا۔''تم ضرور بے وقوفوں کی طرح سوچنے لگی ہو۔''
''تم شاید پوری بات نہیں جانتے اس لیے ایسا کہہ رہے ہو''صنوبر نے اب بھی اسی سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی۔
''پوری بات.... کیا ہے پوری بات...''اس کے اس سوال پر صنوبر نے اسے شرجیل پر کیے جانے والے جان لیوا حملے اور اس کی مدد حماد نے کس طرح کی وہ پوری داستان شروع سے لے کر آخیر تک سنائی جسے سلمان حیرت اور استعجاب کے گہرے ماحول میں سنتا رہا۔ اور جب صنوبر کی بات ختم ہوگئی تو کمرے میں کچھ سکوت سا طاری ہوگیا۔
''تمہاری بات اگر ٹھیک ہے کہ یہ حملہ فارس نے ہی کرایا ہے۔ پھر بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ

اسے یہ بات کس نے بتائی کہ شرجیل کی جان بچانے میں ہمارے اس نوکر لڑکے کا ہاتھ ہے۔ اور اگر اسے یہ بات کسی طرح معلوم بھی ہوگئی کہ اس نے شرجیل کو مار ڈالنے والی جگہ پر کسی کو نگرانی کے لیے بٹھایا ہوا تھا کہ شرجیل کی کون مدد کو آتا ہے تب بھی جتنا میں فارس کو جانتا ہوں وہ ہمارے اس نوکر چھوکرے کو اغوا کر کے کیا حاصل کرنا چاہے گا اس سے تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کے پاس سے حماد کو برآمد کر لیا جاتا ہے تو وہ تو پھنس جائے گا۔ قانون کا پھندا اس کی گردن میں آ جائے گا۔''

سلمان سوچتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ جس انداز سے سلمان سوچ رہا تھا اسے سن کر صنوبر کو ایک بات کا احساس شدت سے ہوا کہ لڑکے شاید لڑکیوں سے مختلف سوچتے ہیں وہ اس طرح کی باتیں سوچ نہیں سکتی تھی لیکن ساتھ ہی اسے یہ اندیشہ بھی ستانے لگا کہ اغوا جیسے برے اور قبیح کام میں کہیں اس کا بھائی سلمان بھی تو کبھی ملوث نہیں رہا......

''تم جو بھی کہو اس معاملے میں انسان زیادہ سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا۔ بس اس کی آنکھوں پہ جہالت اور انتقام کی پٹی پڑ جاتی ہے اور وہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹا دینا چاہتا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ حماد نے شرجیل کی یا میری مدد کی ہے تو اس کا بھی راستے سے ہٹایا جانا ضروری ہے۔'' صنوبر کی بات سن کر سلمان کو ایسا لگا جیسے شاید یہ بات ہو۔ فارس جیسے لڑکے اپنی طاقت کا بے جا استعمال کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کی کتنی دہشت ہے۔ ہو سکتا ہے صنوبر کی بات صحیح ہو۔

''اچھا... ایسا ہے!'' اس نے ہلکے سے کہا جیسے وہ کہنا کچھ اور چاہتا تھا اور اس کی زبان سے نکل کچھ اور رہا تھا۔ ''تو میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں'' اس نے جیسے کمزوری دکھائی۔

''کیوں وہ تمہارا دوست ہے۔ تم کم سے کم اتنا تو پتا کر ہی سکتے ہو کہ اس نے حماد کو غائب کیا ہے یا نہیں۔''

صنوبر کی آواز میں حماد کا خیال کر کے ایک قسم کی تیزی اور غصیلا پن در آیا تھا جسے سلمان نے محسوس تو کر لیا مگر وہ اس بارے میں کچھ بولا نہیں۔ الٹا اس نے ایک نئی بات کی جس کے بارے میں صنوبر کو توقع بھی نہیں تھی۔

''تم شاید نہیں جانتیں کہ اب میری فارس سے اتنی اچھی دوستی نہیں ہے میرا اس سے جھگڑا ہو چکا ہے اور اب میں اس کے بلانے پر بھی اس سے ملنے نہیں جاتا۔'' صنوبر کو جھٹکا لگا۔

''کیوں ایسا کیا ہوا جو تم نے اس سے جھگڑا کیا۔ وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے اور تم یہ بات جانتے ہو''

''اچھا آدمی نہیں ہے یہی احساس جب مجھے ہوا تو مجھے یہ خیال بھی آیا کہ فارس جیسے برے انسان سے میری بہن کی شادی نہیں ہونی چاہیے۔''

سلمان کی بات سن کر صنوبر کو شدید حیرانی ہوئی اور وہ ایک دم سے وفور جذبات میں اپنے بھائی کے گلے لگ گئی۔

''تم سچ کہہ رہے ہو سلمان میرے بھائی۔ میں جانتی تھی تم میرے بھائی ہو اور جس دن بھی تمہیں یہ احساس ہوگا تو تم خود اس رشتے سے انکار کر دو گے۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں احساس ہوگیا ہے۔'' ایک لمحے میں صنوبر کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ سلمان کو بھی اس کا اسے اس طرح جذبات سے گلے لگنا بہت ہی اچھا لگا۔ اسے بھی اپنے دل میں پہلی بار وہ ہی جذبہ ہلکورے مارتا ہوا محسوس ہوا جو کبھی بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ جب وہ اپنی بہن سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا اسے کوئی کچھ کہتا تو وہ اس کی جان کے درپہ ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے تو گھر کے کشیدہ ماحول نے انھیں بھی ایک دوسرے سے ایسے ہی دور کر دیا جیسے ان کے ماں باپ ایک دوسرے سے بیزار تھے۔

''اب جب تمہیں احساس ہو چکا ہے تو مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے بھائی لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ پھر ہم حماد کے بارے میں کیسے پتا چلائیں گے۔'' صنوبر نے اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ جانے کے بعد یہ بات کہی۔

''تم اس بات کی فکر مت کرو میں اس سے ناراض ہوں لیکن وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے کیونکہ وہ تو اب بھی.....'' اس سے آگے وہ کہہ نہیں سکا لیکن صنوبر سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ فارس تو اب بھی صنوبر کا طلب گار تھا اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ سلمان سے کیسے ناراض ہو سکتا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ صنوبر کے گھر میں اس کا حمایتی یہی ایک ووٹ تھا جو اس کے حق میں تھا۔

صنوبر کو بے پناہ خوشی ہو رہی تھی کہ اب سلمان اس کے خلاف نہیں رہا تھا۔ وہ یہ بات اب بھی نہیں جانتی تھی کہ سلمان فارس سے اس کی شادی کے خلاف ضرور ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ شرجیل کے حق میں ہے اسے جتنا اختلاف فارس سے صنوبر کی شادی پر تھا اس سے زیادہ وہ شرجیل کو ناپسند کرتا تھا۔ کیونکہ وہ صنوبر کی شادی ایک اتنے کمزور خاندان میں کرنے پر تیار نہیں تھا اور ایک بات جس سے شرجیل نے بھی صنوبر کو آگاہ نہیں کیا تھا وہ اب تک صیغہ راز میں تھی کہ شرجیل نے سلمان کو ایک ایسا کام کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا جس کے بارے میں اگر وہ صنوبر کو یا اس کے خاندان کو بتا دیتا تو سلمان کی خیر نہیں ہوتی۔ لیکن اب تک شرجیل خاموش تھا اور سلمان اس کے اپنے خاندان میں داخل ہونے یا اس خاندان کا ممبر بننے سے ڈرتا تھا کہ اگر شرجیل اس کے گھر کا فرد بن گیا تو اس کا راز کبھی نہ کبھی ضرور کھل جائے گا۔ صنوبر سے سلمان نے یہ کہا اور صنوبر اس سے یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئی کہ اس معاملے میں وہ دیر نہ کرے جتنی دیر ہوگی حماد کی زندگی کو اتنا ہی خطرہ بڑھتا چلا جائے گا۔''

صنوبر کے جانے کے بعد سلمان کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی اور وہ اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہو چکا تھا کہ فارس کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس نے واقعی ایسا کیا تھا کہ شرجیل کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس پر جان لیوا حملہ کرایا تھا تو اس کا مطلب ہے وہ صنوبر کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے ہو سکتا ہے اسی نے حماد کو اغوا کیا ہوا اور اس کی کوئی اور بھی وجہ رہی ہو، وہ وجہ کیا ہو سکتی ہے سلمان اسے جاننے کے لیے تو بے چین ہو گیا۔ لہٰذا اس نے اسی وقت فارس کو فون لگایا اور شام کو ملنے کا پروگرام رکھنا چاہا۔ اس کی توقع کے قطعی خلاف فارس نے اسی دن کے بجائے ملاقات کو دو ایک روز بعد پر ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب سلمان نے بہت اصرار کیا تو وہ مان گیا۔ اصل میں فارس کے شرجیل کا جو گھونسا پڑا تھا اس کی وجہ سے اس کا جبڑا اب تک دکھ رہا تھا اور اسے بات کرنے میں قدرے دشواری کا سامنا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن شرجیل ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر اپنے یعنی شرجیل کے گھر چلا گیا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ اس روپ کو دھارن کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اب وہ صنوبر کے اتنا نزدیک نہیں تھا جتنا وہ حماد یا سلمان رہتے ہوئے تھا۔ شرجیل کے ماں باپ اس پر اپنی محبت نچھاور کرتے تو اسے اپنے ماں باپ شدت سے یاد آنے لگتے اور اس پر اپنی بستی' اپنے علاقے' اپنے لوگوں کی یادوں کی یلغار ہو جاتی اسے اپنی ماں سب سے زیادہ یاد آتی جو اس سے اتنی بے پناہ محبت کرتی تھی کہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے پر تیار ہو جاتی تھی یہ اس کی ماں کی ہی محبت تھی جو آج وہ یہاں انسانوں کے بیچ موجود تھا اس کی ماں نہ ہوتی تو اس کا باپ ابراہیم اسے کبھی بھی انسانوں کے بیچ پڑھنے اور رہنے کی اجازت نہ دیتا اور پتا نہیں وہ اپنی زندگی کو لے کر کس طرح اور کہاں کہاں بے مقصد پھرا کرتا۔

''کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟''

شرجیل کی ماں نے اسے مخاطب کیا تو اس نے اپنے خیالات کے بھنور سے نکل کر ان کی طرف دیکھا اور مختصر سا بولا۔ ''کچھ نہیں.....''

''اگر صنوبر کے بارے میں سوچ رہے ہو تو اسے بھول جاؤ میرے بچے اب یہ شادی کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے۔'' شرجیل کی ماں کی بات سن کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتیں میری جان صنوبر نے ہی بچائی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو آج میں

زندہ نہ ہوتا۔ اور آپ مجھے اسے بھول جانے کا کہہ رہی ہیں!''
سلمان کو یہ ین کر شرجیل سے بھی زیادہ غصہ آیا کیونکہ یہ بات صرف وہ جانتا تھا کہ اسے صنوبر سے شرجیل سے کہیں زیادہ محبت تھی یہ اور بات کہ صنوبر اس بات سے ناواقف تھی۔
''تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹے لیکن تم یہ بھی تو دیکھو تمہاری جان پر جو حملہ ہوا تھا وہ بھی تو اسی صنوبر کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں مانتی ہوں کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے مگر تمہاری اور ہمارے خاندان کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم صنوبر اور اس کے خاندان سے دور رہیں۔''
شرجیل کی ماں یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئی وہ اسے مزید اپنے اور صنوبر کے حق میں کچھ بھی کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ سلمان کو شرجیل کی ماں کی اس خود غرضی پر بہت غصہ آیا لیکن وہ یہ کہاں جانتی تھیں کہ انھوں نے یہ پھپھسی بات اپنے بیٹے شرجیل سے نہیں بلکہ اس سلمان سے کہی ہے جو شرجیل کی طرح کمزور نہیں انسان نہیں ہے اور نہ ہی اس کا عشق جیسا ہے یہ تو اس کا عشق تو زہر کی طرح اس کے سارے وجود میں پھیل چکا ہے اور اب وہ صنوبر کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ جو کچھ اس نے صنوبر کے عشق میں جھیلا تھا اور جتنی قربانیاں دی تھیں اس کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ صنوبر کو بھول جاتا۔ اب جبکہ اس کی ہستی اس کا وجود حتیٰ کہ اس کی پہچان بھی مٹ کی ہے تو وہ صنوبر اور اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو گرانے پر تیار ہو چکا تھا چاہے اس میں سرفراز ملک کا گھر تباہ ہو یا کاروبار اسے کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

رحمٰن یزدانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انھیں اب کیا کرنا چاہیے۔ ان کا لاڈلا بیٹا انھیں دھمکی دے چکا تھا اگر اس کی شادی صنوبر سے نہ ہوئی تو وہ خودکشی کرلے گا یا یہ گھر اس میں رہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ رحمٰن یزدانی نے جب یہ سنا کہ فارس نے ہی شرجیل کو جان سے مروانے کی کوشش کی تھی تو انھیں اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی نظر آئی ان کا بیٹا اس سنگ دل ہوسکتا ہے یہ وہ اب سے پہلے نہیں جانتے تھے انھیں تو بس یہ لگتا تھا کہ ضدی ہے، خودسر ہے اور جوانی میں دوستوں اور باپ کی بے پناہ دولت کی وجہ سے تھوڑا سا بگڑا ہوا ہے اور یہ کوئی ایسی پریشانی والی باتیں نہیں تھیں ایسے تو وہ بھی تھے اپنی جوانی میں لیکن جیسے ہی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑا انھوں نے سب کچھ چھوڑ کے اپنے خاندانی بزنس کو اپنا سب کچھ بنالیا تھا اب ان کا عشق بھی ان کا بزنس تھا اور یہی ان کی ریس بھی اس کھیل میں انھیں دنیا میں سب سے زیادہ مزا آتا تھا دوسروں کو پیچھے چھوڑنے اور کاروباری داؤ پیچ سے وہ کتنوں کو پچھاڑ چکے تھے اور کتنے ہی ایسے تھے جو ان کے دست نگر تھے جن میں سے ایک ایسے ہی سرفراز ملک تھے جو ان کی ایسی شاطرانہ چالوں سے مات کھا کے اپنا کاروبار ان کے پاس رہن رکھ چکے تھے اور وہ چاہتے تو ایک ہی پل میں سرفراز ملک کو روڈ پر لانے کی طاقت رکھتے تھے مگر بزنس کمیونٹی میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اپنی ساکھ اور نام بنائے رکھنے کے لیے بہت سے لبادے اوڑھنا پڑتے ہیں دوسروں کو شکست دے کر اس کی بڑکیاں مارنے سے پرہیز کرنا پڑتا ہے ورنہ اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ چیمبر میں دوسرے اور بہت سے کاروباری دشمن بن جائیں اور آپ طاقت ور ہونے باوجود بھی تنہا ہو جائیں...
تنہائی کسی بھی طرح کی کیوں نہ ہو انسان کو کبھی خوشی نہیں دیتی اور کاروباری تنہائی تو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی یہ بات کا احساس کیا ہوتا ہے یہ تو وہ ہی بتا سکتا ہے جو طاقت ور ہو اور اس کی طاقت سے کوئی نہ ڈرتا ہو۔ کسی کو کوئی خوف نہ ہو۔ بہت ساری چیونٹیاں مل کر اتنا بوجھ ڈھو سکتی ہیں جو کسی وہم وگمان میں بھی نہیں ہوسکتا۔ ایسا ہی اصول طاقت اور کمزوری کے بیچ میں بھی ہوتا ہے ایک طاقت ور انسان اس وقت اپنی طاقت کھو بیٹھتا ہے جب بہت سے کمزور انسان مل کر اس کے خلاف ہو جاتے ہیں اور وہ کہیں زیادہ بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں رحمٰن ملک جانتے تھے اس لیے وہ چاہ کر بھی سرفراز ملک کو سڑک پر نہیں لاسکے

تھے لیکن یہاں معاملہ ان کے اکلوتے بیٹے کا تھا اور اس کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔ ذہین اور معاملہ فہم انسان تھے اس لیے انھوں نے سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا ہی ٹھیک سمجھا۔ اور فارس کو یقین دلا دیا کہ صنوبر کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی لیکن ساتھ ہی انھوں نے فارس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ شادی کے بعد وہ اپنے ایسے سارے کام چھوڑ دے گا جیسے وہ اب تک کرتا رہا ہے اور ذمہ داری سے اپنی شادی، کاروبار اور گھر کو وقت دے گا۔ یہ وعدہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ سلمان صنوبر کے بھائی نے بھی اس سے لیا تھا اس کے بعد ہی سلمان نے صنوبر اور اپنی باپ سے فارس کے رشتے کی بات کی تھی۔

باپ سے اپنی اور صنوبر کی شادی کی خوشخبری سننے کے بعد فارس رحمٰن کے سارے وجود میں جیسے خوشیوں کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں وہ صنوبر کو دلہن بنتے اور اپنی بازوؤں میں کسمساتے دیکھنے لگا یہ خواب جیسے اس کا سارا زہر چوس کے لے گیا اور وہ صنوبر کو حاصل کرنے کے نشے میں دھت ہو کر جیسے گنگنا ہی تو اٹھا لیکن یہ سب اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتا تھا کبھی کبھی انسان اپنی فطرت سے الگ ہو کر بھی کچھ پل جی لیتا ہے مگر فطرت بڑی ہی سخت پکڑ کا نام ہے ذرا سی چوک سے پھر سے انسان اس کے بس میں چلتا چلا جاتا ہے۔ رحمٰن یزدانی نے اس سے کہا تھا تمہیں شرجیل پر حملہ نہیں کرانا چاہیے تھا یہ تم نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے اگر وہ مرجاتا اور یہ بات کھل جاتی ؟؟ یہ حماقت تم نے کی ہے تو صرف یہی نہیں کہ تم صنوبر کو کھو دیتے ہو سکتا ہے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے میں بھی تمہیں نہیں بچا سکتا تھا کیونکہ اس قسم کے کیسوں میں سارا سوشل میڈیا اور سماج میں انسانی حقوق کے لیے آواز اٹھانے والے طبقے اس مظلوم کے ساتھ ہو جاتے ہیں جس پر ظلم ہوا ہو یا جسے بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو۔ تم ایسی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے ہم کتنے بھی امیر اور پیسے کے بل پر کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہو جائیں مگر پورے سماج کو نہ تو خرید سکتے ہیں اور نہ ہی سب لوگوں کو اپنے حق میں کر سکتے ہیں لوگ اگر بک بھی جائیں تب بھی یہ ڈر ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ ان کا ضمیر جانے کب بیدار ہو جائے اور وہ آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں...''

باپ کی تقریر کا فارس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا وہ تو ایک بات جانتا تھا کہ اگر صنوبر اس کی نہیں ہوئی تو وہ اسے شرجیل کی بھی ہونے نہیں دے گا چاہے اس کے لیے اسے ایک بار اور ہی کیوں نہ جان سے مار دینا پڑے۔ لیکن جس بات سے دونوں باپ بیٹے بے خبر تھے وہ یہ کہ شرجیل تو کب کا مر چکا تھا ہو سکتا ہے اس کی روح اب بھی بھٹکتی پھرتی ہو اب ان کے سامنے شرجیل کے وجود میں سلمان تھا اور سلمان ایسا تر نوالہ نہیں تھا جسے اتنی آسانی سے نگلا جا سکتا ہو....! سمجھو ایک جنگ تھی جس کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔

☆☆☆

شرجیل کی ماں کے بعد اس کے باپ سرفراز ملک نے اس کے پاس آکر اسے ایسی ہی باتیں سمجھانے کی کوشش کی تو اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے خاندان اور اپنے ماں باپ کی خاطر صنوبر کا خیال دل سے نکال سکتا ہے اور اسے بھول سکتا ہے ہمیشہ کے لیے.... سلمان کے جواب دینے سے پہلے ہی اسے اپنے سر میں ایک جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی اس نے اس جھنجھناہٹ کی طرف توجہ کی تو اسے اپنے باپ ابراہیم کی آواز سنائی دی۔

''بیٹا سلمان تم کہاں ہو؟ ہم بہت مصیبت میں ہیں... تمہاری ماں.....!!!''

اس کے بعد آواز معدوم ہو گئی اور سلمان کی دل کی دھڑکنیں چھت سے لگ گئیں اس کے ماں باپ کو اس کی ضرورت تھی اور اس کا ان کے پاس پہنچنا از بس ضروری تھا... مگر کیسے....

اس نے سرفراز ملک کی طرف دیکھا تو وہ اسے مسلسل گھور رہے تھے.....

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ جون میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو تنہا ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزانِ من!

ماہ شعبان کی پُرنور ساعتیں مبارک ہوں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ماہ شعبان حضورﷺ کو بہت عزیز تھا۔ شعبان کے معنی شاخ کے ہیں یہ ماہ مبارک رجب اور رمضان المبارک کے درمیان آتا ہے۔ حضورﷺ اس مبارک ماہ میں روزے رکھا کرتے تھے۔ حضرت اسامہ ابن زیاد سے مروی ہے کہ انہوں نے حضورﷺ سے پوچھا کہ آپﷺ اس ماہ میں جتنے روزے رکھتے ہیں اور کسی مہینے میں نہیں رکھتے تو حضورﷺ نے فرمایا اس ماہ میں ہمارے اعمال اللہ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور میں چاہتا ہوں جب میرے اعمال پیش کیے جائیں تب میں روزے سے ہوں۔

ماہ شعبان کے روزے اور عبادت دراصل رمضان المبارک کی تیاری ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ رجب اور شعبان کا احترام تو دور کی بات آج کل تو رمضان کا بھی پورا مہینہ لوگ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتے ہیں اور اکثر ٹی وی شوز میں جا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بابرکت مہینے عبادت اور نیک اعمال کے لیے دیے ہیں۔ اور نیک عمل اللہ کی خوشنودی ہے اصل زندگی کی تیاری ہے۔ ہم لوگ فانی دنیا کی لذتوں میں اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ آخرت کی فکر ہی نہیں...... میں اپنے تمام بچوں کو نصیحت کروں گا کہ اس مبارک ماہ کو ضائع مت ہونے دیں۔ خوب عبادت کریں، روزے رکھیں اور اللہ کی مخلوق کی خدمت کریں۔ دکھاوے سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کریں۔ قرآن کو اس ماہ میں ختم کریں۔ اللہ ہم سب پر اپنا کرم فرمائے اور قبر کی تنگی اور جہنم کی آگ سے بچائے، آمین۔

□ گل ناز۔ کراچی

○: محترم جناب السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ایک غلطی کی وجہ سے میرا تعلیمی سلسلہ چھوٹ گیا ہے۔ میری عمر سترہ سال ہے۔ تعلیم جاری رکھنا میرا خواب نہیں میری زندگی کا حصہ ہے۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ برائے مہربانی اس کا کوئی حل بتائیں میں تاعمر آپ کو دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ بابا جی میں زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں مجھے میرا ماضی جینے نہیں دیتا۔ پلیز بابا جی میری مدد کریں۔ میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔

بیٹی ناز! ماضی کو بھول جانے ہی میں بہتری ہے۔ غلطی کی خدا سے معافی مانگو اور نقصان کی تلافی کے لیے دعا کرو۔ ماضی میں اُلجھنے والے حال اور مستقبل دونوں ضائع کر دیتے ہیں۔ اپنی توجہ اپنی پڑھائی کی طرف رکھو ابھی بہت کم عمر ہو دوبارہ زندگی اپنی مرضی کے خطوط پر گزار سکتی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ استغفار کی تسبیح ضرور کیا کرو۔

□ رابعہ۔ ٹیکسلا

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! میں یہ خط بہت روتے ہوئے لکھ رہی ہوں کیونکہ اتنی دوائیاں کھانے کے بعد بھی میرے ماہانہ نظام کی خرابی بڑھتی جا رہی ہے۔ جب سے میں بڑی ہوئی ہوں، اس وقت سے

اعلانِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

مجھے تکلیف ہے۔ میں اپنی والدہ سے کہتی رہتی مگر انھوں نے میری پروا نہیں کی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے رات بھر نیند بھی نہیں آتی۔ ایسے ماں باپ سے تو بہتر ہے کہ میں بن ماں باپ کی بیٹی ہوتی۔ میرے سات بھائی ہیں۔ اچھا خاصا کماتے ہیں مگر میرے لیے ان کے پاس پانچ روپے بھی نہیں ہوتے۔

☆: بیٹی رابعہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کرو، کیونکہ یہ چیز تمہارے لیے خطرناک ہوسکتی ہے۔ ایسی چیزیں مت کھاؤ جن کی تاثیر گرم ہو۔ دودھ دن میں کم از کم دو دفعہ ضرور پیو اور ٹھنڈا پیو تو بہت اچھا ہے۔ دودھ پینے سے قبل اس پر 21 بار یاشافی پڑھ کر ضرور دم کرو۔ ہر نماز کے بعد صحت کلی کے لیے دعا ضرور کیا کرو۔

☐ حامد۔ کراچی

○: محترم بزرگ! اسلام علیکم! میں نے اپنے دو مسائل کے لیے تعویذ کی درخواست کی تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے مجھے اچھی نوکری بھی مل گئی ہے اور میری منگنی بھی اسی جگہ ہوگئی ہے جہاں میں چاہتا تھا۔ میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ خدا آپ کو عمر دراز عطا کرے اور آپ اسی طرح لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ (آمین)

☆: بیٹے حامد! دل کی مرادیں پوری کرنے والا پاک پروردگار ہے بشرطیکہ اسے صدق دل سے پکارا جائے۔ اس پاک ذات نے تمہارے دونوں مسائل حل کر دیے ہیں تو اس کا شکر ادا کرتے رہو جس کا ایک طریقہ نماز پنجگانہ کی ادائیگی ہے۔

☐ حدیقہ۔ پشاور

○: بیٹی حدیقہ! تمہارا مسئلہ مصلحت کے تحت شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں خوش اور آباد رکھے۔ آمین۔ کوئی شخص بھی مکمل نہیں ہے لہٰذا کسی کی کمی یا خامی کو زندگی کا روگ نہیں بنانا چاہیے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سورۃ کوثر 77-77 بار پڑھ کر اپنی حاجت بیان کرو۔ جب شوہر غصے میں ہوں خاموش ہوجایا کرو اور اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھتی رہا کرو۔

مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

☐ حلیمہ۔ راولپنڈی

○: قابل احترام بابا! سلام کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی اور دونوں جہانوں میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ (آمین) باباجی! ہم جیسے گناہ گاروں کی بخشش اور ہدایت کے لیے دعا کیا کریں۔ باباجی! ہم سخت گناہ گار ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا تھا۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے وظیفہ مانگا تھا۔ باباجی! میرے لیے آپ خود بھی دعا کریں کہ میرا اس سال قرآن پاک ختم ہوجائے اور پکا یاد ہوجائے۔ زندگی بھر آپ کو دعائیں دوں گی۔ باباجی! ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ میرا بڑا بھائی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ پہلے بھی مشکل ہی تھا کہ وہ ہمیں رشتہ دیتے لیکن میرے بھائی سے ایک چھوٹی سی غلطی ہوگئی ہے جس سے وہ لوگ ہم سے کافی دور ہوگئے ہیں۔ پہلے ہم بالکل مایوس نہیں تھے۔ کچھ آس تھی لیکن اب کافی پریشانی ہے اس لیے آپ سے تعویذ لینا چاہتی ہوں۔ اگر اس طرح ہوگیا تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ ہونا تو وہی ہے جو ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے۔

☆: بیٹی حلیمہ! نماز کی پابندی رکھو اور بھائی سے کہو کہ نماز فجر کے بعد ۱۰۱ مرتبہ سورۃ توبہ پڑھ کر حاجت بیان کرے۔ تم نصر من اللہ و فتح قریب کا کثرت سے ورد کیا کرو۔ خطا وہ قابل معافی ہے جس سے کسی کی ہتک نہ ہوتی ہو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

☐ عرشی۔ لاہور

○: محترم باباجی! اسلام علیکم! کئی برسوں سے میں "مسئلہ یہ ہے" بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں نے اپنے دو مسائل کے حل کے لیے آپ سے رجوع کیا تھا۔ اب میں ایک اہم مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ بڑے بچے کی پیدائش کے بعد سے میرے جسم کا نچلا دھڑ پیروں تک شدید درد کرتا ہے اور مجھے ایک منٹ کے لیے بھی چین نہیں ملتا۔ میں نے بہت قابل لیڈی ڈاکٹروں سے کافی علاج کرایا۔

اس کے علاوہ بہت سے تعویذ بھی کروائے لیکن مجھے کہیں سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ درد کے ساتھ مجھے شدید بخار بھی ہو جاتا ہے۔ کبھی درد کم کرنے کے لیے کوئی موزوں ٹیبلٹ بھی کھاتی ہوں تو درد کم ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی بیماری نہیں۔ میں سوکھ کر بہت زیادہ کمزور ہو گئی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے بہترین سا تعویذ صحت کے لیے دیں کیونکہ میں کوئی وظیفہ نہیں کر سکتی۔ میرا بڑا بیٹا اس وقت ماشاء اللہ فرسٹ ایئر کا طالب علم ہے اور میں یہ خط اسی سے لکھوا رہی ہوں۔ مجھے کسی قسم کی کوئی دوا کھانے کے لیے نہ بتائیں کیونکہ یہ مجھے ری ایکشن کرتی ہے۔ بابا جی! مجھے مایوس نہ کریں کیونکہ میں اللہ کے سوا ہر طرف سے مایوس ہو چکی ہوں اور آخر میں مسئلہ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔

☆: بیٹی عرشی! اللہ تمھیں صحت کلی عطا فرمائے۔ آمین۔ رات کو سوتے وقت یا جب بھی بستر پر لیٹو، ٹانگوں کے نیچے اونچا تکیہ رکھا کرو تاکہ دوران خون درست رہے۔ ۲۱ روز نماز فجر کے بعد روغن بادام پر ۲۱ بار سورۃ یاسین پڑھ کر دم کرو پھر ٹانگوں پر ہلکے ہاتھوں سے مالش کرو۔ یہ عمل ۲۱ روز کرو۔ کوشش کرو کہ تیل کی مالش کے بعد تھوڑی دیر دھوپ میں اس طرح بیٹھو کہ وہ دھوپ ٹانگوں پر لگے۔ یہ عمل درد والی ہر جگہ پر کر سکتی ہو۔ دھوپ میں بیٹھتے وقت کپڑے ململ یا ہلکی کاٹن کے ہوں تو دھوپ کی تمازت زیادہ فائدہ دے گی۔ تعویذ کے لیے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ گل رخ۔ کوٹری

○: بیٹی گل! تمہارا خط پڑھ کر تمہاری مشکلات کا اندازہ ہوا۔ بیٹی تمہارا بزرگ ہونے کے ناتے میں تمھیں صبر کی تلقین ہی کروں گا۔ اللہ سے مدد مانگو۔ وہ ضرور تمہاری دعا قبول فرمائے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز مغرب کے بعد ۷ بار سورہ عصر پڑھ کر ایک پیالی پانی پر دم کرو اور گھر میں جو پانی پینے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں یہ پانی ملا دو۔ یہ عمل ایک ماہ کرو۔ اللہ کرم فرمائے گا۔

□ سبرینہ۔ چشتیاں

○: محترم بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دو بار ایف اے کا امتحان دیا اور دونوں بار ہی انگلش میں فیل ہو گئی ہوں۔ اب تیسری بار دیا ہے۔ میں بہت محنتی لڑکی ہوں۔ مگر جب امتحان میں بیٹھتی ہوں تو ایک دم سے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ آپ مجھے تعویذ بھجوائیں تاکہ میں پاس ہو جاؤں۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کسی آدمی نے کہا کہ ہم پر کسی نے کچھ کر رکھا ہے جو ہر کام میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ بابا جی! میرے مسئلے کا حل فوری طور پر دیں۔

☆: بیٹی سبرینہ! نماز کی پابندی کرو اور جتنا زیادہ ہو سکے رب زدنی علما پڑھتی رہو۔ تعویذ فوراً آفس فون کر کے منگوالو۔

□ راشد۔ ملتان

○: بیٹے راشد! خوش رہو۔ تمہارے خواب بہت اچھے ہیں۔ جو لوگ نیت کے صاف ہوتے ہیں، اللہ ان کو پسند فرماتا ہے۔ خواب میں حضورؐ یا بزرگ ہستیوں کو دیکھنا بہت مبارک ہے مگر پھر زندگی میں ہر قدم بہت محتاط رکھنا چاہیے۔ تم نماز کی پابندی ضرور کرو اور نماز عشاء کے بعد ۷ تسبیح درود ابراہیمی ضرور پڑھو۔ یہ عمل اپنی عادت میں شامل کرو، کرم ہوگا۔

□ حمیرا۔ سکھر

○: بابا سائیں! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ خدا نے آٹھ سال کے بعد میرے دل کی مراد پوری کی ہے اور مجھے اولاد سے نوازا ہے ورنہ میں تو مایوس ہو چکی تھی۔ یہ آپ کی دعاؤں اور تعویذ کا نتیجہ ہے جو آپ نے مجھے براہ راست بھیجا تھا۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں بابا جی اور زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی۔

☆: بیٹی حمیرا! خدا تمھیں خوش اور شاد و آباد رکھے۔ آمین۔ اس کا شکریہ ادا کرو اور صدقہ و خیرات کے ساتھ ساتھ نماز باقاعدگی سے پڑھتی رہو۔

□ نبی بخش۔ گوادر

○: پیارے بابا جی! اسلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں بہت پریشان ہوں۔ میں پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ چار نمازیں تو میں پڑھتا ہوں۔ کبھی باجماعت بھی لیکن فجر کی نماز چھوٹ جاتی

چھوٹ جاتی ہے اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میں پانچ وقت کی نماز پابندی سے باجماعت ادا کروں۔

☆: بیٹے نبی بخش! اگر دل میں عہد کرلو کہ نماز ادا کرنی ہے تو اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لیے اُٹھ جانا چاہیے۔ ذرا سی بھی سستی دکھانے سے نماز رہ جاتی ہے۔ پھر نماز کی عادت پڑ جائے تو دن میں جب تک پانچ وقت اللہ کے حضور سجدہ نہیں کرو گے چین نہیں آئے گا۔ نماز عشاء کے بعد ایک تسبیح یا سلام کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجت بیان کرو۔ اللہ تمہاری مدد فرمائے گا۔

□ کوثر۔ کراچی

O: محترم بابا جان! بعد از سلام عرض ہے کہ میری شادی کو دو سال ہو چکے ہیں۔ لیکن اولاد کی دولت سے ابھی تک محروم ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے شادی سے پہلے بھی مہینہ دو مہینے نہیں آتا تھا۔ شادی کے ایک دو مہینے میں ٹھیک رہی اس کے بعد پھر یہ مسئلہ ہو گیا۔ کافی علاج وغیرہ کرایا۔ حکیم، ڈاکٹر، لیڈی ہومیوپیتھک مگر سب سے بے کار البتہ ڈاکٹری علاج سے تو کبھی ٹھیک اور کبھی کم یا بالکل نہیں۔ اب میں نے علاج چھوڑ دیا ہے تو رمضان مبارک سے بالکل ختم۔ نماز قرآن شریف وغیرہ میں پابندی سے پڑھتی ہوں۔ بابا جان! ایک بات آپ کو بتاتی چلوں۔ وہ یہ کہ میرے شوہر کی دوسری اور میری پہلی شادی ہے۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔

☆: بیٹی کوثر! اللہ تمہیں اولاد نرینہ عطا فرمائے۔ (آمین) نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد ۹۹ بار سورۃ الکوثر پڑھو۔ پھر ہاتھ اٹھا کر نہایت عاجزی سے دعا کرو۔ وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ دو ماہ دس دن کرو پھر مجھے مطلع کرو۔ اللہ ضرور رحم فرمائے۔ ممکن ہو تو فوری طور پر مجھ سے تعویذ منگوا لو۔

□ شاد۔ رہڑی

O: محترم بابا جی! اسلام علیکم! آپ جو لوگوں کی خدمت کرتے ہیں اس کا صلہ تو اللہ تعالیٰ ہی آپ کو دے گا۔ ہم تو صرف دعائیں ہی دے سکتے ہیں۔ آج سے دو سال قبل ہمارے حالات بہت ہی اچھے تھے۔ ابو کی دو نوکریاں تھیں اور میں بھی دکان پر کام کرتا تھا۔ لیکن حالات نے پلٹا کھایا تو ابو کی دونوں نوکریاں چلی گئیں اور میری بھی۔ تقریباً ۳ یا ۴ ماہ کے اندر یہ ہوا۔ اب میں ڈیڑھ سال سے فارغ ہوں۔ جہاں بھی نوکری کے لیے جاتا ہوں، پہلے تو ہاں کر دیتے ہیں اور کاغذات وغیرہ سب کچھ لے لیتے ہیں لیکن پھر چکر لگواتے رہتے ہیں۔ سوچ سوچ کر میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے اور بات بے بات غصہ آتا ہے۔ گھر والے بھی روزانہ نوکری نہ ملنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ خاص طور پر ابو تو اکثر ایسا کرتے ہیں اور میری چھوٹی بہنیں اور میری امی بھی کہتی رہتی ہیں۔ روزانہ یہ باتیں سن سن کر جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو ختم کرلوں لیکن مذہب اجازت نہیں دیتا۔ آخری امید کے طور پر آپ کو خط لکھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرا باہر جانے کا کوئی بندوبست ہو جائے۔

☆: بیٹے شاد! زندگی میں بہت نشیب و فراز ہیں۔ کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو ان مشکلات سے نبرد آزما نہ ہوا ہو۔ وہ لوگ بہت خوش قسمت ہیں جو ہمت اور طاقت رکھتے ہیں حالات سے مقابلہ کرنے کی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ محنت اور کوشش کرنے والوں کو کبھی ناکام نہیں کرتا ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز عشاء کے بعد ۴۱ بار سورۃ النصر پڑھ کر حاجات بیان کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے۔ تعویذ کے لیے فوری طور پر آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔ انشاء اللہ حالات جلد بہتر ہوں گے۔

□ محمد ادریس۔ خان پور

O: محترم بابا جی! السلام علیکم! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں میرا مسئلہ بھی حل کر دیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نوکری کی ضرورت ہے کوئی اچھا سا ہنر بھی فی الحال میرے پاس نہیں۔ گھر والے یہی کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ بابا جی! میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ میرا ذہن بھی بہت کمزور ہے۔ نوکری کے لیے کوئی تعویذ چاہتا ہوں۔ نماز پابندی سے پڑھتا

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہوں۔قرآن شریف کی تلاوت بھی کرتا ہوں۔

☆: بیٹے اویس! سب کے مسئلے اللہ کی ذات پاک حل کرتی ہے۔ مسلسل کوشش اور لگن سے سب پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔تم نماز اور قرآن کے پابند ہو خوشی ہوئی۔ہر نماز کے بعد یا باسط کا ۱۰۱ مرتبہ ورد کرو۔اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ پھر صدق دل سے اس کے دربار میں اپنی حاجت پیش کرو۔تعویذ کے لیے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

☐ نائلہ۔لاہور

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! میں پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھ چکی ہوں اور میرے کئی مسئلے خدا کے فضل و کرم سے حل بھی ہوئے ہیں۔میرا ایک چھوٹا بھائی جس کی عمر اٹھارہ سال ہے بچپن سے غلط دوستوں کی صحبت نے اسے سرکش بنا دیا ہے۔وہ سگریٹ بھی پیتا ہے۔آج کل پھوپو کی بیٹی کی خاطر وہ بہت اپ سیٹ ہے۔اس نے نیند کی گولیاں کھانی شروع کر دی ہیں۔روزانہ دس کھا لیتا ہے۔بابا جی! خدا ہی کا واسطہ میری پریشانیاں دور کر دیں۔میرے والدین بچوں کو پیار سے سمجھانے کے بجائے ڈانٹ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔میں نے اپنی امی سے ایک خط آپ کو لکھوایا تھا۔آپ نے ان کو وظیفہ دیا تھا مگر انھوں نے نہیں کیا۔آپ مجھے کوئی تعویذ ہی دے دیں۔میرے گھر سے بے سکونی اور نفرت ختم ہو جائے ورنہ میں بہت جلد پاگل ہو جاؤں گی۔میرا بھائی بچپن سے گھر والوں کی مار کھا کھا کر اذیت پسند ہو گیا ہے۔مگر بربار صرف اپنے آپ کو کر رہا ہے۔اپنے آپ کو ایسی ایسی اذیت دیتا ہے کہ جو دیکھتا ہے اس کا دل پھٹنے لگتا ہے۔پچھلے دنوں اپنے بازو پر بلیڈ سے اتنے گہرے زخم لگائے کہ میرا دل گھبرا گیا تھا اس کے زخم دیکھ کے۔بابا جی! ہمارے گھر میں ہر کوئی ایک دوسرے سے نفرت کرتا ہے۔کسی کو ایک دوسرے کا احساس نہیں۔

☆: بیٹی نائلہ! تمہارے گھر کے حالات پڑھ کر افسوس ہوا۔اپنے اعصاب پر قابو رکھو۔زندگی اللہ کی امانت ہے۔اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔نماز کی پابندی کرو۔کثرت سے درود شریف کا ورد کرو۔نماز فجر اور عشاء میں سورہ رحمٰن اول و آخر ۷ دفعہ درود شریف کے ساتھ پڑھو، اور اللہ رب العزت سے دعا مانگو۔تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☐ سائرہ۔اٹک

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! آپ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔میں بڑی مشکل میں ہوں۔امید کرتی ہوں کہ آپ میری مدد کریں گے۔ہمارے خاندان میں ۱۴ سے ۱۶ سال کی عمر میں شادی کر دی جاتی ہے۔اس حساب سے میری عمر زیادہ ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے خاندان والے باتیں بناتے ہیں۔آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھ کر کوئی تعویذ دے دیں۔وہ ڈاکٹر ہو اور امیر ہو اور کسی دوسرے شہر کا رہنے والا ہو جو مجھے بغیر جہیز کے قبول کرے۔میں چاہتی ہوں کہ میرا اتنا اچھا رشتہ آئے کہ میرے خاندان والے حیران رہ جائیں۔اور جو رشتہ آئے۔وہ میرے ماں باپ قبول کریں اور آپ میرے لیے دعا کریں کہ میں امتحان میں پاس ہو جاؤں۔

☆: بیٹی سائرہ! ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔اللہ تمہاری دعا ضرور قبول کرے گا۔وہ سب کی سنتا ہے جو تمہارے حق میں بہتر ہو گا وہی ہو گا۔نماز کی پابندی کرو۔سورۃ مزمل بکثرت پڑھو۔اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ اور تعویذ کے لیے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

☐ شہزادی۔شہداد کوٹ

○: پیارے بابا جی آداب! میں آپ کی خدمت میں اپنے کزن کا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ میرے کزن کی مدد کریں گے۔بابا جی! آج سے تقریباً پانچ سال پہلے میرے کزن کھجور کے درخت سے گر گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی کمر میں شدید درد کے ساتھ ساتھ سوجن بھی رہتی ہے۔اٹھنے بیٹھنے اور چلنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔مجھ سے ان

کی تکلیف دیکھی نہیں گئی اور میں نے آپ کو خط لکھ دیا اس امید پر کہ آپ میرے کزن کا مسئلہ ضرور حل کریں گے۔ وہ ماشاءاللہ سے صحت مند بھی ہیں اور ان کے دو بچے بھی ہیں لیکن بابا جی! ایسا حل بتایئے گا جو صرف میں کرسکوں کیونکہ وہ بہت دور رہتے ہیں اور نماز بھی نہیں پڑھتے جبکہ میں نماز پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

☆: بیٹی شہزادی! تمہارا جذبہ قابل تعریف ہے۔ لیکن جب تک نماز کی پابندی نہ کی جائے، کوئی وظیفہ اثر نہیں رکھتا پھر جس کا مسئلہ ہے، حل کی کوشش بھی اسی کو کرنی چاہیے کیونکہ مسئلے کی نوعیت ایسی ہے کہ تمہارے کچھ کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ عمل یا تو وہ خود کرے یا ساتھ رہنے والا کوئی بھی فرد۔ بہتر یہ ہے کہ تم تعویذ منگوالو اللہ کرم کرے گا اس کے علاوہ روزانہ نماز فجر کے بعد زیتون کے تیل پر 7 مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرلو پھر رات کو سونے سے قبل تیل کو ہلکا گرم کر کے متاثرہ حصے پر لگاؤ اور ہلکے ہاتھوں سے مالش کرو۔ یہ عمل بلاناغہ 14 دن کرو۔ انشاءاللہ بہت جلد افاقہ ہوگا۔

□ وفا۔ KPK

O: بیٹی وفا! جب انسان کسی بھی شے کا حصول چاہتا ہو تو کامیابی صرف بے تحاشا محنت کرنے پر ہی نصیب ہوتی ہے۔ تمہاری تحریر سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تم نہایت محنتی اور مستقل مزاج لڑکی ہو اور بیٹی! مستقل مزاجی کامیابی کی ضمانت ہے۔ خوب محنت کرو۔ اللہ تمہیں ضرور کامیابی عطا کرے گا۔ رات کو سونے سے قبل ایک مرتبہ سورہ رحمٰن کی تلاوت ضرور کیا کرو۔ ہلکی پھلکی ورزش کو اپنی عادت بنالو، اس سے بہت سے مسائل حل ہوجاتے ہیں۔ کچھ مسئلے ایسے ہوتے ہیں۔ جنھیں حل کرنا انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔ وزن کم کرنا ہے تو خوراک متوازن رکھو۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے بہتر مستقبل کی دعا کیا کرو۔ اور فوری طور پر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے دوا منگوالو۔ نماز کی پابندی رکھو اور تمام توجہ صرف اپنی تعلیم پر دو۔

□ مہک۔ خیرپور میرس

O: پیارے بابا جی! آداب! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے، بازوؤں، ہاتھوں اور ٹانگوں پر بال ہیں جو بہت برے لگتے ہیں۔ میں ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں اس مسئلے کے نجات کے لیے ایسی کوئی کریم وغیرہ نہیں منگوا سکتی ہوں اور نہ خود جا کر خرید سکتی ہوں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ کیا کروں؟ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو پڑھنے سے چہرے کے بال ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں یا آپ کوئی بہت ہی آسان سا وظیفہ بتادیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ میں لوگوں سے کھل کر بات نہیں کرسکتی۔ اگر بہت سی لڑکیاں بیٹھی ہوں تو سب بہت باتیں کرتی ہیں اور مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ کوئی بات کروں۔ آپ کوئی اچھا سا عمل بتائیں کہ میں سب لوگوں سے کھل کر باتیں کرسکوں۔

☆: بیٹی مہک! فاضل بالوں کے لیے ضروری ہے کہ پہلے جو چہرے یا ہاتھوں پر موجود ہیں، وہ صاف ہوجائیں کیونکہ وظیفہ اس کے لیے تو دیا جاسکتا ہے کہ بال مزید نہ نکلیں لیکن جو ہیں، وہ خود بخود ختم نہیں ہوسکتے۔ بہرحال تم میدے میں تھوڑا سا شہد ملا کر آمیزہ تیار کرلو پھر اس آمیزے پر ایک مرتبہ سورۃ یوسف پڑھ کر دم کرو۔ روزانہ نماز ظہر کے بعد آمیزہ اچھی طرح چہرے پر لگاؤ اور خوب مالش کرو۔ یہی عمل ہاتھوں اور ٹانگوں پر بھی دہراؤ۔ رفتہ رفتہ فاضل بالوں سے نجات مل جائے گی لیکن یہ عمل نہایت مستقل مزاجی سے جاری رکھنا۔ آمیزہ ایک دفعہ میں کئی دنوں کے لیے بھی تیار کر کے رکھ سکتی ہو۔ شروع میں یہ عمل دن میں کم از کم دو دفعہ کرو۔

□ ہما۔ بھکر

O: بابا سائیں! السلام علیکم! آج میں کوئی مسئلہ لے کر حاضر نہیں ہورہی بلکہ آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے ہمارے ابا کا قرضہ ادا ہونے کے واسطے جو تعویذ دیا تھا۔ اللہ نے کرم کردیا۔ اب ان کے سر سے قرضے کا بوجھ اتر گیا ہے اور انھوں نے پھر سے کاروبار شروع کردیا ہے۔ بابا سائیں! اللہ آپ کو نیک اجر دے۔ آمین۔

☆: بیٹی ہما! میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہنا جس کا ایک طریقہ پنج وقتہ نماز ہے۔ اس سے کاروبار میں بھی برکت ہوگی۔

□ امام بخش۔ خیر پور

O: محترم باباجی! السلام علیکم! آپ جس طرح لوگوں کی خدمت کلام ربانی کے ذریعے کر رہے ہیں، اس کا اجر تو آپ کو صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ ہمارے پاس دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ کا بتایا ہوا پہلا وظیفہ میں نے آج سے 6 مہینے پہلے کیا تھا۔ اللہ پاک کے کرم سے میرا مسئلہ تقریباً حل ہوگیا ہے۔ دوسرا وظیفہ میں نے آپ سے خط کے ذریعے مانگا ہے۔ اس کا انتظار ہے۔ ملے گا تو عملدرآمد ہوگا انشاء اللہ۔ تیسرے نمبر پر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دونوں پیروں کے انگوٹھوں کے ناخن دونوں سائیڈ سے نیچے کی طرف گوشت میں جا رہے ہیں، جو مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں۔ نمبر 2 میرے جسم میں درد رہتا ہے۔ کبھی ایک جگہ پکڑتا ہے اور کبھی دوسری جگہ۔ ان دونوں مسئلوں کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں۔

☆: بیٹے امام بخش! ناخن اگر کاٹ کر ٹھیک سے تراش لیے جائیں تو وہ گوشت میں نہیں گھستے۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو اس کے لیے تم زیتون کے تیل پر 71 مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھو اور تیل پر دم کر کے رکھ لو اور متاثرہ حصوں پر ہلکا گرم کر کے لگاؤ۔ کوشش کرو کہ تیل ایسے وقت میں لگاؤ جب دھوپ جسم کو اچھی طرح لگے۔ یہ عمل بلا ناغہ 21 دن کرو پھر مجھے مطلع کرو۔

□ سدرہ احمد۔ ہالا، سندھ

O: محترم باباجی! خدا آپ کا سایہ سلامت رکھے اور آپ اسی طرح لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ آمین۔ آج سے پہلے بھی میں نے فرضی نام سے آپ کو خط لکھا تھا اور اپنا مسئلہ بیان کیا تھا کہ میں اور احمد ایک دوسرے کو چاہتے ہیں مگر ہمارے خاندانوں میں اختلاف ہے لہٰذا کوئی ایسا تعویذ بتائیں کہ ہماری تمنا پوری ہو جائے جو بظاہر ناممکن تھی۔ آپ نے مجھے تعویذ دیا تھا۔ کچھ دن تو بظاہر کوئی راستہ نظر نہ آیا میں مایوس ہوگئی مگر نماز اور دعا جاری رکھی۔ ڈیڑھ ماہ بعد ماموں جان سعودی عرب سے چھٹی پر آئے تو انھوں نے ابو اور تایا کے درمیان صلح کرادی اور یوں وہ سب کچھ جو ناممکن نظر آتا تھا ممکن ہوگیا۔ اب میں سنز بن چکی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی شکرگزار ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی بھی بے حد مشکور ہوں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اور اجازت کی طلب گار ہوں۔ امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔

☆: سدرہ بیٹی! جو کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے جو بڑا مہربان اور سمیع ہے۔ تم نے صدق دل سے اسے یاد کیا تو اس نے تمہاری التجا قبول فرمائی۔ وہ سب کی سنتا ہے بشرطیکہ اسے پکارا جائے۔ میرے پاس آنے اور شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ایک عاجز اور عاصی بندہ ہوں۔ من کی مراد پوری ہونے پر نماز اور صدقہ و خیرات سے ہرگز غفلت نہ برتنا۔ خدا تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ آمین۔

□ نبیل شاہ۔ جہلم

O: بزرگوار باباجی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ پچھلے سال جب میں ملازمت کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا اور بہت پریشان تھا تو ایک دوست نے "سچی کہانیاں" دے کر آپ سے تعویذ منگوانے کا مشورہ دیا تھا۔ جواب میں آپ نے تعویذ دیا تھا اس نے کام کر دکھایا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے ملازمت مل گئی جو میری توقع سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ بے شک اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔ یہ اسی کے پاک کلام کا نتیجہ ہے۔ میں باقاعدگی سے نماز بھی پڑھتا ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری رہبری کی اور میرے لیے دعا فرمائی۔

☆: بیٹے نبیل! بے شک اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے اور دکھی دلوں کی فریاد سنتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کے حضور سر جھکا کر التجا کی جائے۔ اب نماز باقاعدگی

سے پڑھتے رہنا۔ صدقہ اور خیرات میں بھی بخل سے کام نہ لینا۔ اس سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔

□ زین۔ گوادر

○ پیارے بابا جان! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ میرا نام زین ہے اور میرا شہر گوادر ہے۔ بابا جان! عرصہ دراز سے میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں لیکن بابا جان! وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ جب بھی بولتا ہوں تو گھر کے اندر بھاگ جاتی ہے۔ بابا جان! ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم پڑھا تو سوچا کہ اس سلسلے میں آپ سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ بابا جان! پلیز میری مدد فرمائیں اور استخارہ کر کے مجھے بتائیں کہ یہ کام میرے لیے نقصان دہ ہے یا فائدہ مند؟ اس کے بعد میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا اور بابا جان! اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ اسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔

☆ بیٹے زین! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹے! اگر تم واقعی میں اس بچی سے مخلص ہو تو اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج دو۔ یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

□ نادیہ۔ مظفر گڑھ

☆ بٹی نادیہ! بڑا دکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد الٹے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو اللہ کے ہاں بھی اس کی معافی نہیں۔ پریشانی' خوشی' بیماری' صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر رہنا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف' چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

☆☆☆

ہائیڈ پارک

نوری جان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

اقوالِ حضرت علیؓ

☆: تمہارا بہترین دوست وہ ہے کہ جب تم غریب ہو جاؤ تو تم سے محبت میں کمی نہ کرے اور جب تم امیر ہو جاؤ تو تم سے محبت میں اضافہ نہ کرے۔

☆: کسی دوست کو دھوکہ دے کر یہ مت سمجھنا کہ کتنا بے وقوف تھا؟ بلکہ یہ سوچنا کہ اس کا تم پر اعتبار کتنا تھا۔

مرسلہ: سیدہ علیشا تراب۔ کراچی

حضرت آدمؑ کو سجدہ

☆ حضرت آدمؑ کو سب سے پہلے حضرت جبرائیلؑ نے سجدہ کیا۔

☆: دوسرے نمبر پر سجدہ کرنے والے حضرت میکائیل ہیں۔

☆: تیسرے نمبر پر سجدہ کرنے والے حضرت اسرافیل ہیں۔

☆: چوتھے نمبر پر سجدہ کرنے والے حضرت عزرائیل ہیں۔

☆: پانچویں نمبر پر تمام فرشتوں نے مل کر سجدہ کیا۔

مرسلہ: رانا عبدالرحمٰن۔ لاہور

ادب

ایک دفعہ لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا۔ آپ نے ادب کس سے سیکھا ہے؟

فرمایا۔ بے ادبوں سے۔

پھر پوچھا گیا۔ کیونکر؟

حکیم صاحب نے کہا۔ انھوں نے جو بری حرکت کی، میں نے اُس سے اجتناب کیا۔

مرسلہ: سید تراب علی۔ کراچی

سچا واقعہ

کل میں امی کے ساتھ ان کی ایک پرانی محلے دار سے ملنے گئی جو ان کے گاؤں کی ہیں۔ ان کی ساس بہت بیمار تھیں۔ نقاہت کی وجہ سے وہ باتیں بھی بہت کم کر رہی تھیں۔ میں ان کے قریب گئی اور حال احوال پوچھا پھر آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے نانا کا قصہ سنایا کہ...... اُن کی سات بیٹیاں تھیں اور وہ بہت جلالی بزرگ تھے۔ بیٹیوں کا گھر سے باہر جانا یا چھت پر جانا انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''شریف کی بیٹی کونے چاہے گورے'' یعنی شریف آدمی کی بیٹی یا تو کونے میں رہے یا گور (قبر) میں...... وہ ہر وقت گھر میں ہی رہتے تھے۔ مسجد بھی گھر کے ساتھ ہی بنائی تھی۔ بہت جلال تھا ان کا!! وہ صرف جمعہ کی نماز پڑھنے محلے کی بڑی مسجد میں جاتے تھے۔ ان کا صرف یہی کہنا تھا کہ ''شریف کی بیٹی کونے چاہے گورنے'' کبھی کوئی بیٹی چھت پر چلی جاتی تو!! اُسی رات اس کی طبیعت خراب ہو جاتی اور اس کا انتقال

ہو جاتا۔ اس طرح اُن کی چھ بیٹیاں مر گئیں۔ صرف چھوٹی بٹی زندہ رہی جوان کی والدہ تھیں۔ اور میں سوچنے لگی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہوتا ہے؟؟

زورِ قلم: نزہت ناز بنت خواجہ۔ کراچی

غزل

دو قدم چلنے نہ دے گا آبلہ پائی کا خوف
اور بھی رُسوا کرے گا تجھ کو رسوائی کا خوف
دیکھ اپنے آپ کو تنہائی سے مانوس کر
ورنہ تجھ کو مار ہی ڈالے گا تنہائی کا خوف
زور بازو آزما، نکلے گا پھر گرداب سے
تو شناور ہے تو پھر کیونکر ہے گہرائی کا خوف
کس لیے ہر ایک سے ملنے سے کتراتا ہے تُو
دور کب ہوگا ترے دل سے یہ ہرجائی کا خوف
ہر شناسا نے دیے ہیں زخم کچھ اتنے مجھے
نقش ہو کر رہ گیا خالد شناسائی کا خوف

شاعر: خالد یوسفی۔ اندرون گول چوک، سرگودھا

پرکھ

لوگوں کے لیے آپ اُس وقت تک اچھے ہیں جب تک آپ اُن کی امیدوں پر پورا اترتے ہیں۔ اور سب ہی لوگ اچھے ہیں جب تک آپ ان سے کوئی امید نہ رکھیں۔

مرسلہ: عابدہ بیگم۔ ڈسکہ

خواہشات کا پیالہ

بادشاہ سلامت اپنا دربار سجائے بیٹھے تھے کہ ایک فقیر اپنا کشکول لیے دربار میں آیا۔ فقیر نے درخواست کی کہ اس کا پیالہ بھر دیا جائے۔ بادشاہ سلامت نے اپنا ہیروں کا ہار اس پیالے میں ڈال دیا۔ پیالہ خالی رہا۔ بادشاہ کو دیکھ کر وزیر اور تمام درباریں نے اپنی اپنی چیزیں اتار کر اس پیالہ میں ڈال دیں۔ پیالہ پھر بھی خالی رہا۔

فقیر مسکراتا ہوا جانے لگا تو وزیر نے اس نے پوچھا کہ یہ پیالہ کس چیز کا ہے؟ یہ کون سا پیالہ ہے جو بھرتا ہی نہیں!! فقیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ خواہشات کا پیالہ ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔

زورِ قلم۔ نزہت ناز۔ کراچی

بیوی کی عظمت

میڈیکل ریسرچ کے مطابق انسانی جسم میں ایک لاکھ 39 ہزار رگیں (Veins) ہوتی ہیں۔

صرف بیوی ہی جانتی ہے کون سی رگ کب دبانی ہے۔

مرسلہ: توقیر تراب۔ کراچی

ڈزنی ورلڈ کی آسیب زدہ حویلی

ہاؤنٹڈ مینشن نامی آسیب زدہ حویلی میں پورے 999 بھوت آپ کے استقبال کے منتظر ہوں گے۔ یہاں رولر کوسٹر کی رفتار بہت ہی سست ہو گی۔ اس لیے آپ کو اس قدیم حویلی میں چمگادڑ کے اڑنے اور بدروحوں کے چیخنے کی آواز بھی صاف سنائی دے گی۔ یہاں ایک میوزک روم بھی ہے یہاں کئی ہیولے آپ کو موسیقی سنائیں گے۔ جلتی بجھتی موم بتیاں دروازوں کی چرچراہٹ اور نامعلوم نسوانی چیخیں سن کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس آسیب زدہ حویلی میں چھوٹے بچوں کو نہ لے جانا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ وہاں آپ کا ہونے والا نقصان کوئی پورا نہیں کرے گا۔

حسنِ انتخاب: رانا حبیب الرحمٰن۔ لاہور

داستانِ وفا

تنہائیوں میں جب بھی سدا دیکھتے ہیں
بس اسی صورت کی ادا دیکھتے ہیں
اس کے رستے میں بکھرے پتوں کی طرح
نیچے قدموں کے آکر خطا دیکھتے ہیں
چہرے پہ اشکوں نے رقم کی تحریریں
شاید خواب دیکھنے کی سزا دیکھتے ہیں
قربت ہی میں بڑھتے ہیں فاصلے بہت

لفظوں میں ہم تو وفا دیکھتے ہیں
صرف اتنی سی ہے داستان وفا میری
جب بھی کسی نے دیکھا تنہا دیکھتے ہیں
کچھ لوگ تھے ہمیں کبھی جان سے عزیز
ہم بھرے شہر میں آشنا دیکھتے ہیں
ہجر و فراق، دردِ مسلسل، غموں پہ غم
ہم تو فقط رب کی جزا دیکھتے ہیں
عذاب ظلمت شب ہے کہ وصل اس کا
ہم ہاتھ اٹھانے کی رضا دیکھتے ہیں
غرض ہے اس کی نہ اس کے حسن کی
حسن مصور کی ہم تو نگاہ دیکھتے ہیں

شاعر: ایم حسن نظامی۔قبولہ شریف

انوکھا اسکول

محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر نے اسکول کا معائنہ کیا۔ ایک کلاس میں بچوں کو چیک کرنے کے لیے انگریزی لفظ Nature (نیچر) لکھا اور ایک بچے کو بلا کر پوچھا۔

بچہ کچھ دیر تک اس لفظ کو دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''نتورے''

ڈائریکٹر نے کہا۔''غور سے دوبارہ دیکھو، پڑھو اور پھر بتاؤ۔''

بچے نے پھر کہا۔''سر! نتورے لکھا ہے۔''

ڈائریکٹر صاحب غصے میں آگئے اور کلاس ٹیچر سے کہا۔

''آپ نے اس کو یہ کیا پڑھایا ہے؟ بچہ تو ساری عمر غلط ہی پڑھتا رہے گا۔''

کلاس ٹیچر نے جواب دیا۔''سر آپ ناراض نہ ہوں۔ بچہ جب متورے (Mature) ہو جائے گا تو صحیح پڑھے گا۔''

یہ سن کر ڈائریکٹر ٹیچر کو پرنسپل کے پاس شکایت کے لیے لے گئے۔ پرنسپل صاحب نے تمام بات مکمل تحمل سے سنی اور گرج کر ٹیچر سے کہنے لگے۔

''آخر آپ اس بچے کا فتورے (Future) کیوں خراب کرنے پر تلی ہیں۔''

مرسلہ: محمد دیان خان۔کراچی

تدبیر

ایک صاحب محفل میں بیٹھے اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے بتا رہے تھے کہ انھوں نے پرویز کی کالز اور میسجز سے جان چھڑوانے کا بہترین حل نکالا ہے۔ تو دوستوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

اچھا......؟ ذرا ہمیں بھی تو بتائیں کہ کیا تدبیر اختیار کی۔

تو وہ صاحب گویا ہوئے کہ انھوں نے اپنے موبائل سے پرویز کا نمبر ہی ڈیلیٹ کر دیا ہے۔

مرسلہ: صائمہ بشیر۔سرگودھا

تم بھی نا.....

جاؤ میری دنیا سے دور چلے جاؤ تم
بہت رلایا ہے اب اور نہ رلاؤ تم
تمھیں دیکھنے کی خواہش بھی دم توڑ چکی
اب تو چاہتے ہیں کہ نظر بھی نہ آؤ تم
ہر دفعہ ہم ہی کیوں تمھیں بلاتے رہیں
اب یہ تم پہ ہے کہ آؤ یا نہ آؤ تم

شاعرہ: شمسہ قمر۔کراچی

ظالم لوگ

نامور شاعر منیر نیازی ایک مرتبہ رکشے میں کہیں جا رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھے کہ اچانک رکشہ رک گیا۔ انھوں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''کیا معاملہ ہے؟''

ڈرائیور نے بتایا کہ جنازہ گزر رہا ہے۔

منیر نیازی جو جملہ سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے بولے۔''ظالمو! تم بھی کیسے لوگ ہو، زندہ انسان کو کچل کر گزر جاتے ہو اور جنازے کے احترام میں رکشے روک لیتے ہو۔''

مرسلہ: فرح عالم۔اسلام آباد

ماڈرن بیوی

☆: اپنا منہ خود دھو سکتی ہے۔
☆: شوہر کو شاپنگ کرا سکتی ہے۔

☆: بچوں کو اسکول میں داخلہ دلا سکتی ہے۔
☆: اپنے شوہر کو اچھا کک بنا ڈالتی ہے۔
☆: سنتی کسی کی نہیں مگر سناتی سب کو ہے۔
☆: محلے والیوں کو با آسانی لڑا سکتی ہے۔
☆: سال میں ایک دو بار خود بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر سکتی ہے۔
☆: بھاری رش میں یوٹیلیٹی بل جمع کرا سکتی ہے۔
☆: شوہر کے آئے ہوئے مہمانوں کو منٹوں میں بھگا سکتی ہے۔

مرسلہ: کاشف نبی خان۔ کراچی

لوٹ آنا

میری جب یاد آئے تو میری جان لوٹ آنا
زمانہ آزمائے تو میری جان لوٹ آنا
بتایا ہی نہیں تم نے بھلا کیوں جا رہے ہو
جدائی جب ستائے تو میری جان لوٹ آنا
اندھیرے دور کرنے کے لیے جو تیری خاطر
کوئی دیپ جلائے تو میری جان لوٹ آنا
مداوا کرنا چاہے بے وفائی کا اگر تو
خیال ایسا جو آئے تو میری جان لوٹ آنا
کبھی جو ناز کو تیری ضرورت پیش آئے
گزارش یہ ضروری ہے میری جان لوٹ آنا

شاعرہ: عمارہ ناز۔ کمالیہ

سنہری باتیں

☆ اپنا زخم اس کو مت دکھاؤ جس کے پاس مرہم نہ ہو۔
☆ موت ایک ایسا دروازہ ہے جس میں سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔
☆ زندگی میں وہ راہیں اپناؤ جہاں سے کچھ حاصل کر سکو۔
☆ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے اور انسان کی قیمت اس کی خوبیاں ہیں۔
☆ احسان دشمن کو بھی زیر کر دیتا ہے۔
☆ سوال کرو بے وقوفوں کی طرح، سمجھو عقل مند کی طرح۔

☆ دوسروں کی غلطیاں بھول جاؤ مگر اپنی ہرگز مت بھولو۔

مرسلہ۔ کاشف عبید۔ بٹ گرام

بہشت

ایک امریکی پادری نے ایک کسان کو طویل لیکچر پلانے کے بعد کہا۔ "اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہو، دوزخ میں جانا چاہتے ہو یا بہشت میں؟"
کسان نے سر جھکا کر کہا۔ "بہشت......"
"ہاں، ہاں، بے جھجک کہو، بہشت میں۔"
"جی نہیں، میں تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں بہشت اتنی اچھی جگہ نہیں کہ......"
"کیوں؟" پادری نے پوچھا۔
"اگر وہ ایسی ہی اچھی جگہ ہوتی تو امریکہ اس پر قابض ہو گیا ہوتا۔"

مرسلہ۔ محمد جواد انور۔ اسلام آباد

قدر مشترک

"میں جب تمہیں دیکھتا ہوں، شوکت یاد آ جاتا ہے۔"
"لیکن میری اور شوکت کی شکل و صورت میں تو بہت فرق ہے۔"
"بات یہ ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی میرے کچھ روپوں کا مقروض ہے۔"

مرسلہ: محمد اسماعیل بروہی۔ دوڑ، نواب شاہ

کیا کر بیٹھے!!!

جس کو زندگی بنا بیٹھے ہو
کس سے دل لگا بیٹھے ہو
وہ پھر سے کر رہا ہے انکار
کیوں دل میں ارمان سجا بیٹھے ہو
جسے نہیں ہے تمہاری چاہت کی قدر
اسی سے اُمیدیں لگا بیٹھے ہو
وہ جو کرتا ہے تم سے مسکرا کر بات
کیوں تم اسے محبت بنا بیٹھے ہو
وہ جو نہیں سمجھتا تمہارے درد

جس کی خاطر خود کو غم لگا بیٹھے ہو
شاید...... وہ کرتا ہے کسی اور سے محبت
جس کی خاطر تم اپنی زندگی تباہ کر بیٹھے ہو
شاعر: داؤد احمد۔ بورے والا

سروس اسٹیشن

ایک خاتون اپنی کار لے کر سروس اسٹیشن پہنچیں کار پر بے شمار ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ خاتون نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

''کیا یہاں کاریں دھوئی جاتی ہیں؟''

لڑکے نے بہ غور ان کی کار دیکھی اور برجستہ کہا۔ ''جی ہاں دھوئی جاتی ہیں لیکن استری نہیں کی جاتیں۔''

مرسلہ: احمر عبدالغنی۔ کراچی

ہری مرچیں

☆ ہوٹل کے کاؤنٹر پر لکھا تھا۔ ''مسئلہ کشمیر حل ہونے تک اُدھار بند ہے۔''

☆ ممبئی میں ایک ہوٹل کے باہر بورڈ پر یہ لکھا ہے۔ ''اس ہوٹل کا مالک اسی ہوٹل میں کھانا کھاتا ہے۔''

☆ آج کل کاروبار بہت مندا جا رہا ہے۔ لوگ وہ چیزیں بھی واپس کر رہے ہیں جو انہوں نے خریدی ہی نہیں تھیں۔

مرسلہ: زید علی۔ کراچی

احساس تو ہے

اس کو میرا ہلکا سا احساس تو ہے
بے درد سہی وہ میرا ہمراز تو ہے
وہ آئے نہ آئے میرے پاس لیکن
شدت سے مجھے اس کا انتظار تو ہے
ابھی نہیں تو کیا ہوا مل ہی جائے گا کبھی
میرے دل میں اس سے ملنے کی آس تو ہے
محبت کی گواہی میری آنکھوں سے نہ مانگ
برستی نہیں آنکھیں مگر دل اداس تو ہے
شاعر: خضر حیات۔ روڑہ تھل

گائیڈ

ایک فرانسیسی گائیڈ سیاحوں کو فرانس کے سرحدی علاقے کی سیر کرا رہا تھا۔ ''یہ وہ مقام ہے جہاں انگریز توپ خانے کی جنگ ہارا۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔ ''اور نہر کے دوسری طرف انگریز کے پیدل فوج پسپا ہوئی اور وہ جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے وہاں سے انگریز شہسوار فرار ہوئے۔''

''انگریز کوئی لڑائی جیتا بھی تو ہوگا؟''

''نہیں۔'' گائیڈ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''اور جب تک میں یہاں کا گائیڈ ہوں، انگریز کوئی لڑائی نہیں جیت سکتا۔''

مرسلہ: محب انتظار خان۔ ابوظہبی

جاناں

تجھے دیکھے بنا میں نے چاہا ہے
تجھے جانے بنا اپنے دل میں بسایا ہے
تجھے سوچے بنا اپنی روح میں سمایا ہے
تجھے سمجھے بنا چاہت کا مرکز بنایا ہے
تجھے پوچھے بنا فقط اپنا بنایا ہے
تجھے پرکھے بنا من میں محبت کا چراغ جلایا ہے
تجھے پانے کے لیے دعاؤں میں سجایا ہے
رب کے حضور اپنا دامن پھیلایا ہے
شاعر: ممتاز احمد۔ سرگودھا

آزمائش

ایک دولت مند امریکی تاجر بستر مرگ پر لیٹا تھا۔ اس کے سرہانے پادری بیٹھا ہوا تھا۔ امریکی تاجر نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ پادری نے آگے جھک کر کان لگا دیئے کہ اب شاید یہ اپنی وصیت دہرائے گا لیکن امریکی تاجر نے تو یہ سوال کیا تھا۔ ''اگر میں آپ کے چرچ کو دس ہزار ڈالرز عطیہ دے دوں تو کیا آپ کی دعا سے میری جان بچ جائے گی؟''

پادری نے کچھ سوچا اور پھر اپنے گنجے سر سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تو ہر آدمی کی موت کا وقت مقرر ہے لیکن آزما لینے میں کیا حرج ہے؟''

مرسلہ: ذیشان بخاری۔ گرین ٹاؤن لاہور



اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

ریاض حسین تبسم چوہان .... فیصل آباد

میں تری یاد کے حصار میں ہوں
اب کہاں اپنے اختیار میں ہوں
زرد پتا ہوں نخل ہستی کا
اور گرنے کے انتظار میں ہوں

رانا حبیب الرحمٰن .... ڈسٹرکٹ جیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ

مشغلہ بنایا ہے خود کو آزمانے کا
لائٹر کے شعلوں سے تیرے خط جلانے کا
جب بھی مسکراتے ہو، ہاتھ تھام لیتے ہو
کیا عجب طریقہ ہے جان! مسکرانے کا

نبیل جاوید .... لک موڑ، سرگودھا

چاند نے شاخ ہٹا کر جو کنارا دیکھا
میں نے اک نقش کہیں پاس تمہارا دیکھا

رضا سعید .... کراچی

ازل سے عشق میں رسوائیاں مقدر ہیں
چلو نشیب کے اندر اتر کے چلتے ہیں

ایم افضل آزاد .... ساہیوال

تم نے جب بھی مجھے تقسیم کیا
ہر طرف صرف میرا نام ملا

ابوہریرہ بلوچ .... بورے والا

تم جو چاہو تو شمع کی صورت
میری ہستی پگھل بھی سکتی ہے
لفظ پتھر مزاج ہوتے ہیں
بات سانسیں نگل بھی سکتی ہے

ندیم عباس ڈھکو .... ساہیوال

ہونے لگی ہے سارے پرندوں کی واپسی
لگتا ہے دن تو بیت گیا شام ہو گئی

شفق .... چیچہ وطنی

شام سے کچھ بجھا بجھا سا ہوں
بات ایسی بتا گیا کوئی

یاسمین عمران .... کوپرا، وزیر آباد

کسی کی محبت کا خوں کرنے والو!!
برائی سے کس کو بھلائی ملی ہے

ماجد بلوچ .... کراچی

جو چشمِ تر کے لیے باعثِ امان بھی تھا
وہ خود ہی اپنے لیے بے امان بن بیٹھا

نزہت ناز .... کراچی

دل جو ٹوٹا تو صدا آئی
جانِ جاں جا کہ تجھے معاف کیا

شمائلہ اختر .... لاہور

ضروری تو نہیں ہے کہ زباں ہی بولے
آنکھ بھی بات کو لفظوں کی ردا دیتی ہے

اسامہ بلال اعوان .... لاہور

مکین اچھے مکان اچھا ہے
آپ اچھے جہان اچھا ہے

مختار بانو .... کراچی

قدر جب سے گھٹی دعاؤں کی
بڑھ گئیں قیمتیں دواؤں کی
زندگی کو نہ غور سے دیکھو
موت بھی شکل ہے وفاؤں کی

ارشد نبی خان.........کراچی

اُٹھ کھڑی ہوگی کسی دن جنتا
اس قدر بھی نہ ستایا جائے

نگہت منیر.........اوکاڑہ

اور کچھ بھی نہ کبھی اس کے سوا مانگتے ہیں
ہم زمانے سے فقط مہر و وفا مانگتے ہیں

شازیہ سعید مغل.........کراچی

میں اپنے ہاتھ سے دل کا گلا دبادوں گی
مرے خلاف یہی سازشوں میں رہتا ہے

ارم.........منگلا ڈیم

ابھی تو عشق میں آنکھیں بجھی ہیں دل سلامت ہے
زمینیں بانجھ ہوتی ہیں؟ کبھی فصلیں جلانے سے

ارمان.........کوٹلی

وہ حرف کی توقیر سے واقف نہ وفا سے
یہ کارِ سخن جس کو دکھانے کے لیے ہے

JNO.........کراچی

زندگی میں تری ضرورت کو
ہم نے کم کردیا تو کیا ہوگا؟

شاعر عتیق.........کراچی

یہ کیسی قوتِ پرواز ڈر نے پیدا کی
پرندے اُڑتے ہوئے اپنے پَر بھی بھول گئے

اشفاق شاہین.........کراچی

وہ جس نے دیے مجھ کو محبت کے خزانے
بادل کی طرح آنکھ سے برسا بھی وہی ہے

احمر عبدالغنی.........کراچی

کس نے کھیل کھیلا ہے، کس نے ہجر جھیلا ہے
اب گزر گیا جاناں! اس سوال کا موسم

معاذ رشید.........سکھر

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

فضا.........رحیم یار خان

چڑھ گئی اس پیڑ بیل نفرت کی
پیڑ ہی جل گیا محبت کا

افضال حسین بابر.........کراچی

تم سا کوئی کہاں سے لائیں؟
کس دنیا میں ڈھونڈنے جائیں؟
اتنے زنجیروں کے عادی ہیں ہم
کہیں آزادی میں مر ہی نہ جائیں

فیصل طالب.........اسلام آباد

تلاشِ یار میں نکلے اندھیری راتوں میں
بس اک چراغ تھا روشن ہمارے ہاتھوں میں
جو تم نے ہم سے کہا، ہم نہیں سمجھ پائے
نجانے بھید تھے کتنے تمہاری باتوں میں؟

فریدہ خانم.........لاہور

مرے چارہ گر کو خبر کرو کہ لہو لہو یہ جگر گیا
یہ نہ ہو کہ اس کو ملے خبر جو مریضِ عشق تھا مرگیا

اسد انیس.........کراچی

دشمن نئی چال چل رہا ہے
دریاؤں کا رخ بدل رہا ہے
دیتا تھا جو دوسروں کا صدقہ
خیرات سے اب وہ پل رہا ہے

نقاش نعیم.........کراچی

اب تو وفا کے نام سے نفرت سی ہوگئی
الجھے ہیں دوست جب سے تری دوستی میں ہم

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام

پتا

کوپن برائے

تیرِ نیم کش

جون 2016ء